محمد فتح اللہ گولن

اسلام اور دورِ حاضر

جدید ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات

ASRIN GETİRDİĞİ TEREDDÜTLER
(1,2,3,4'DEN SEÇMELER)

مؤلف

محمد فتح اللہ گولن

مترجم

محمد اسلام

نام کتاب : اسلام اور دور حاضر

مصنف : محمد فتح اللہ گولن

ترجمہ : محمد اسلام

نظر ثانی : شازیہ یعقوب

ناشر : ہارمنی پبلی کیشنز
ہاؤس نمبر 9، مین ڈبل روڈ۔ایف ٹین ٹو اسلام آباد
فون: 92-051-2212250
فیکس: 92-051-2212186

تعداد : 7,000

اشاعت : 2011ء

قیمت : 500

9, Main Double Road, F-10/2,
Islamabad-Pakistan
Tel: +92-51-2212250, Fax: +92-51-2112186
www.harmonypublications.net
harmony.publications@gmail.com

فہرست مضامین

کچھ مصنف کے بارے میں

شیخ محمد فتح اللہ گولن کی عظیم خدمات کی بدولت ایک نئے دور کا آغاز ہو رہا ہے اور ہر صاحب نظر آپ کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہے، لیکن اس کے باوجود آپ اپنی تعریف اور اپنی طرف قیادت کے انتساب کو پسند نہیں کرتے۔ آپ کی جائے پیدائش اناطولیہ میں واقع ایک چھوٹی سی بستی ہے، جس میں سال کے نو ماہ موسم سرما رہتا ہے۔ اس بستی کا نام کوروجک ہے، جو صوبہ ارضروم کے شہر 'حسن قلعہ' کا ایک نواحی علاقہ ہے۔ اس بستی کی آبادی ساٹھ ستر گھرانوں سے زائد نہیں۔ آپ کے آباء واجداد "اخلاط" نامی تاریخی گاؤں سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ "اخلاط" صوبہ بتلیس میں پہاڑوں کے دامن میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی آل میں سے بعض حضرات امویوں اور عباسیوں کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے وادی بتلیس کے علاقے کی طرف آئے اور اس علاقے کے لوگوں کے روحانی پیشوا بن گئے، جس کے نتیجے میں اس علاقے کے ترک قبائل کے دلوں میں اسلامی روح جاگزیں ہوگئی۔

محمد فتح اللہ گولن نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی، جس کے اطراف میں اسلامی روح کی کرنیں پھیلی ہوئی تھیں۔ آپ کے والد اور والدہ دونوں دین کی گہری بصیرت کے حامل تھے۔ آپ کے دادا "شامل آغا" عزت و وقار اور دینی مضبوطی کا نمونہ تھے، جن کا اپنے پوتے کے ساتھ مضبوط روحانی اور قلبی تعلق تھا۔ آپ کے والد "رامز آفندی" اس مشکل اور بے ثمر دور میں بھی علم وادب، دین داری اور ذہانت کے لحاظ سے معروف شخصیت تھے۔ وہ اپنا وقت صرف فائدہ مند کاموں میں صرف کرتے اور جود وسخا میں معروف تھے۔ آپ کی دادی "مونسہ خانم" دینی تشخص اور تعلق مع اللہ کی وجہ سے مشہور تھیں۔ ان کی پرہیز گاری کی جھلک ان کے مشاغل اور کاموں میں واضح طور پر نظر آتی تھی۔

آپ کی نانی "خدیجہ خانم" پاشا خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور وقار، رحم دلی اور ادب و احترام کا پیکر تھیں۔ آپ کی والدہ "رفیعہ خانم" بستی کی عورتوں کو قرآن کریم پڑھایا کرتیں اور رحم دلی، شفقت اور نیکی سے لگاؤ کی وجہ سے مشہور تھیں۔

شیخ محمد فتح اللہ گولن نے ایسے عظیم گھرانے میں پرورش پائی، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے چار برس سے بھی کم عمر میں اپنی والدہ سے قرآن کریم سیکھنا شروع کر دیا تھا اور صرف ایک ماہ میں قرآن کریم ختم کر لیا۔ آپ کی والدہ آدھی رات کو اٹھتیں اور آپ کو بیدار کر کے قرآن کریم سکھاتیں۔ جس گھرانے میں آپ نے پرورش پائی وہ اس علاقے کے معروف علمائے کرام اور صوفیائے عظام کی زیارت وضیافت گاہ تھا۔ آپ کے والد "رامز آفندی" علماء اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کو بہت پسند فرماتے اور ان کی خواہش ہوتی کہ روزانہ کم از کم کسی نہ کسی عالم کی ضرور ضیافت کریں، اس طرح محمد فتح اللہ گولن کو بچپن ہی سے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا اور انہوں نے اپنے آپ کو ابتدائے عمر ہی سے علم وتصوف کی آماجگاہ میں پایا۔ جن علمائے کرام سے آپ متاثر ہوئے ان میں سب سے نمایاں شخصیت شیخ محمد لطفی آلوارلی کی تھی۔ آپ ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے منہ سے نکلنے والی ہر بات کو کسی دوسرے جہان سے وارد ہونے والے الہامات سمجھتے۔ آپ شیخ محمد لطفی آلوارلی کی شخصیت سے کس قدر متاثر ہوئے، اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اتنے سال گزر جانے کے باوجود آپ ہمیشہ ان کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور کہا کرتے ہیں: "میں اپنے جذبات، احساسات اور بصیرت میں بڑی حد تک ان سے سنی ہوئی باتوں کا احسان مند ہوں۔"

شیخ محمد فتح اللہ گولن نے عربی اور فارسی زبان سیکھنے کا آغاز اپنے والد ماجد سے کیا، جو کتب بینی میں مستغرق رہتے، ہر وقت چلتے پھرتے قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہتے اور عربی و فارسی کے اشعار گنگناتے رہتے تھے۔ آپ کے والد نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے عشق کی حد تک محبت کرتے تھے۔ وہ صحابہ کرام کے حالات زندگی سے متعلق کتابوں کا اس کثرت سے مطالعہ کرتے کہ وہ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے بالکل بوسیدہ ہو جاتیں۔ آپ کے والد کا ایک اہم کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت کا بیج اپنے بیٹے کے دل میں بو دیا۔ محمد فتح اللہ کے والد "رامز آفندی" نے آپ کو اپنی میراث میں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام کے ساتھ جو محبت اور تعلق عطا کیا تھا، اسے سمجھے بغیر آپ کی شخصیت کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اب یہ انتہائی دشوار ہے کہ آپ کی کوئی نظیر دیکھی جائے یا کسی ایسے شخص کا ذکر کیا جائے جسے نبی کریم ﷺ اور ان کے صحابہ کرام کے ساتھ ایسا لگاؤ ہو کہ جب بھی اس کی زبان پر ان کا تذکرہ آئے تو اس کی آنکھیں اشک بار اور دل بے چین ہو جائے۔

ابتدائی تعلیم اور نفسیاتی پس منظر

تقدیر نے محمد فتح اللہ گولن کی تمام باطنی صلاحیتوں کو اچھی طرح اجاگر کرنے کے لئے انہیں معتدل اور متوازن ماحول میں پروان چڑھایا۔ اگرچہ آپ کی فطری صلاحیتیں باطنی قوت، چاق وچوبند طبیعت، جرأت و شجاعت، عمدہ انتظامی لیاقت، تاریخ پر گہری نظر اور ولولے سے لبریز دل کی صورت میں خوب اجاگر ہو چکی تھیں اور ان کی نشو و نما ایک محبت و شفقت کے پیکر اور اپنے خاندان اور رشتہ داروں سے گہری وابستگی کے حامل شخص کی صورت میں ہوئی، تاہم آپ کو اپنی انتہائی حساس طبیعت اور اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ گہری وابستگی کی وجہ سے قلبی طور پر بہت سی تکالیف بھی اٹھانی پڑیں، کیونکہ آپ کے والد ماجد اپنے بعض دوستوں کی بے وفائی اور ظلم کا نشانہ بنے اور انہیں اپنے خاندان کی نقل مکانی کا دکھ جھیلنا پڑا پھر مختصر سے عرصے میں اپنے بھائی، دادا اور دادی کی وفات کی وجہ سے آپ کے دلِ ناتواں پر بے شمار غم آپڑے۔ ان سب مصائب اور صدموں نے آپ کے دل پر گہرا زخم لگایا، جس کی وجہ سے عین ممکن تھا کہ حالات کی ستم ظریفی آپ کو ایک صوفی درویش بنا ڈالتی، تاہم قدرت نے جہاں آپ کی دینی مدرسے (جہاں سے آپ نے دینی علوم حاصل کیے) کی طرف راہنمائی کی، وہیں آپ کو خانقاہ (جہاں آپ نے روحانی تربیت پائی) کا راستہ بھی دکھایا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے رسمی علوم اور فلسفے پر بھی توجہ دی، چنانچہ تعلیم کا جو سلسلہ آپ نے اپنے والد کے گھر میں شروع کیا تھا، وہ ارضروم شہر آکر بھی جاری رہا، نیز آپ نے جو روحانی تربیت سب سے پہلے اپنے گھر میں حاصل کی تھی، وہ محمد لطفی آفندی کی خانقاہ میں بھی جاری رہی، یہی وجہ ہے کہ آپ کا روحانی تربیت کے ساتھ تعلق کبھی منقطع نہیں ہوا، بلکہ اسلامی علوم کی تحصیل کے پہلو بہ پہلو عمر بھر جاری رہا۔ آپ نے اپنے علاقے کے مشہور علماء سے دینی علوم حاصل کیے، جن میں سب سے نمایاں شخصیت عثمان بکتاش کی ہے، جو اپنے وقت کے چوٹی کے فقہاء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے ان سے نحو، بلاغت، فقہ، اصولِ فقہ اور عقائد کی کتابیں پڑھیں۔

زمانہ طالب علمی ہی میں آپ کی رسائل نور اور طلبۂ نور کی تحریک سے شناسائی ہوگئی۔ یہ ایک ہمہ گیر احیائی اور تجدیدی تحریک تھی، جس کی بنیاد حضرت بدیع الزمان سعید نورسی نے بیسویں صدی کے دوسرے ربع میں رکھی تھی۔

عمر میں پختگی، دینی مدارس اور خانقاہوں سے اپنے حصے کے علوم وفیوض حاصل کرنے اور رسائل نور جو بذات خود ایک ہمہ گیر معاصر دینی مکتب فکر کی حیثیت رکھتے ہیں، سے آشنائی کی وجہ سے آپ کی تمام خداداد صلاحیتیں اور قابلیتیں نکھر کر سامنے آگئیں۔

مزید برآں آپ نے ان رسمی علوم کو پڑھنے اور سیکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا جو آپ نے سرکاری درسگاہوں سے حاصل کیے تھے، جس کے نتیجے میں آپ کو ان علوم کے اصول ومبادی کے بارے میں ٹھوس معلومات حاصل ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے نہ صرف البرٹ کامو (Albert Camus) سارتر (Sartre) اور مارکوس (Marcos) وغیرہ وجودی فلاسفہ کی تصنیفات کا بغور مطالعہ کیا، بلکہ مشرق ومغرب کے دیگر فلسفیانہ افکار کے اصل سرچشموں سے بھی واقفیت حاصل کی۔ خلاصہ یہ کہ ان سب عوامل اور حالات نے مل کر شیخ فتح اللہ کی شخصیت کی تعمیر میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

شیخ فتح اللہ

ابھی محمد فتح اللہ کی عمر بیس سال بھی نہ ہوئی تھی کہ انہوں نے ترکی کے انتہائی مشرق میں واقع ارضروم شہر کو خیر آباد کہہ کر ادرنہ کا رخ کیا، جو ترکی کا مغربی دروازہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں انہیں جامع مسجد ''اُچ شرفلی'' کا امام مقرر کر دیا گیا۔ انہوں نے اڑھائی سال اسی مسجد میں انتہائی زہد اور مجاہدے سے گزارے۔ انہوں نے مسجد میں ہی مستقل قیام کو ترجیح دی اور وہ بغیر ضرورت کے باہر نہ نکلتے۔ مسجد میں رات گزارنے کا کوئی مناسب بندوبست نہ تھا، اس لئے انہیں مجبوراً مسجد کے صحن کے فرش پر ہی ایک کونے میں اپنا مختصر سا بستر بچھا کر رات گزارنی پڑتی تھی۔ پھر جب عسکری خدمات سرانجام دینے کا وقت آیا تو آپ نے ماماک اور اسکندرون کے مقام پر یہ خدمات سرانجام دیں اور پھر ادرنہ اور ادرنہ سے ''کرکلارائلی'' کی طرف لوٹ آئے۔ جب آپ ادرنہ میں مقیم تھے تو وہاں کے لوگ آپ کو ارضرومی شیخ کے نام سے پکارتے تھے، لیکن جب آپ ارضروم آئے تو لوگوں نے آپ کو ادرنلی شیخ کہنا شروع کر دیا، تاہم جب آپ نے ازمیر میں سکونت اختیار کی تو شیخ فتح اللہ کے نام سے مشہور ہو گئے۔

آپ نے اپنے کام کا آغاز ازمیر کی جامع مسجد ''کستانہ بازاری'' سے ملحق ''مدرسہ تحفیظ القرآن'' سے کیا اور پھر ایک چلتے پھرتے واعظ کے طور پر کام کرنے لگے، چنانچہ آپ نے مغربی اناطولیہ کے سارے گردونواح کا دورہ کیا اور پھر ۱۹۷۰ء کے آغاز میں تربیتی کیمپ لگانا شروع کیے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ نے لوگوں کی اطاعت وعبادت کے مطابق تربیت کر کے اپنے آپ کو اپنے پروردگار، دین، وطن اور انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا، چنانچہ لوگوں کی ذہن، دل اور پوشیدہ باطنی احساسات یہاں آکر معرفت کے گہرے معانی سے آشنا ہوتے، گویا لوگ موت کی مدہوشی سے بیدار ہو رہے ہوں اور طویل ماضی کے بعد انہیں نئے سرے سے اٹھایا جا رہا ہو... آپ وہ شہسوار تھے جس کے کارناموں کی آپ کئی بار منظر کشی اور اس کے اعلیٰ اوصاف کا اپنے اشعار اور مقالات میں تذکرہ کر چکے تھے...وہ شہسوار کہ جس کے غم میں آپ نے مرثیے پڑھے اور آنسو بہائے...ایسا شہسوار جو تیز دکھ بھری نظر اور فکر مند وغمزدہ دل کا مالک تھا، جس کی منظر کشی آپ نے کچھ اس طرح کی تھی کہ وہ شدید تھکن کے باوجود اپنے سیاہی مائل گھوڑے پر سوار ہو کر دامن کوہ پر چڑھ رہا ہوتا ہے کہ اچانک شدتِ تکان سے اُس کے گھوڑے کے دل کی حرکت بند ہو جاتی ہے اور وہ اپنے گھوڑے سے زمین پر آگرتا ہے۔لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس پر کنکریوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں تاکہ وہ وہاں سے کبھی نہ اٹھ سکے... آپ ایک ایسے شہسوار تھے جس کے سینے میں آتش فشاں ابل رہے تھے اور اس کی روح، دل اور نفس غموں، دکھوں اور گہرے جذبات کی وجہ سے مدہوش ہو چکا تھا... گویا وہی شہسوار لوٹ آیا ہے... لیکن اس مرتبہ اس نے فولادی تلوار اٹھا رکھی ہے اور نہ ہی کوئی پستول اس کے ہاتھ میں ہے... بلکہ اب تو وہ اس طرح آیا ہے کہ ایمانی حقائق کی الماسی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے، علم کی یاقوتی تلوار سے مسلح ہے، عشق ومحبت کے زمرد، غور وفکر کے مرجان اور موتیوں سے آراستہ ہے اور اللہ تعالیٰ کی لامتناہی بندگی اور عجز وفقر کے جذبات اس کے پیش نظر ہیں۔

۲۱ مارچ ۱۹۷۱ء کو اس وقت کی حکومت پر فوجی دباؤ کے نتیجے میں آپ کو اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا کہ آپ ایک خفیہ تنظیم کے ذریعے لوگوں کے دینی جذبات کو غلط استعمال کر کے ملکی نظام کی اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی بنیادوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چھ ماہ

تک آپ جیل میں رہے اور اس دوران آپ پر مقدمہ چلتا رہا، تاہم چھ ماہ کے بعد عام معافی کے قانون کے تحت آپ رہا ہو گئے اور پھر سے اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے لگے۔

اربابِ اختیار نے پہلے آپ کو ادرمیت بھیجا پھر مانیسا اور اس کے بعد ازمیر میں بورنوا کی طرف منتقل کر دیا، جہاں آپ دسمبر ۱۹۸۰ء تک اپنے کام میں مشغول رہے۔ اس تمام عرصے میں آپ مختلف شہروں میں گھومتے پھرتے اور اپنے علمی، دینی، معاشرتی، فلسفیانہ اور فکر انگیز بیانات سے لوگوں کو مستفید کرتے، نیز آپ مختلف علمی حلقوں اور سیمینارز کا انعقاد کرتے، جن میں نوجوان طبقے خصوصاً یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل حضرات کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے پریشان کن سوالات کے جوابات دیتے۔ ان مجالس میں بیان کردہ جوابات ہر طبقے کے لوگوں کے ذہنوں کو منور کرتے خواہ ان کا تعلق طلبہ سے ہوتا یا اساتذہ سے، تاجروں سے ہوتا یا صنعت کاروں سے، مزدوروں سے ہوتا یا ملازمین سے۔ اس کے نتیجے میں ان کے گرد ہر حلقے اور طبقے سے تعلق رکھنے والے حضرات کا ایک گروہ جمع ہو گیا، جس نے آپ کی ہدایات اور نصیحتوں کی روشنی میں دینی، انسانی اور قومی خدمات سرانجام دیں۔

یہ چھوٹی سی جماعت ہر قسم کی دنیوی یا مادی منفعت کو پس پشت ڈال کر ترکی میں رائج قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے اسکولوں، اکیڈمیوں اور ایسے مراکز کے قیام میں منہمک ہو گئی، جو مختلف یونیورسٹیوں میں داخلے کے لئے طلبہ کو تیار کرتے تھے۔ سویت یونین کی تحلیل کے بعد اس جماعت کا دائرہ کار پورے عالم اسلام میں بالعموم اور وسطی ایشیائی ریاستوں میں بالخصوص پھیل گیا۔ جب دوسرے لوگ مثبت خدمات کی بجائے غیر اہم فروعی مسائل مثلاً ترکی دارالاسلام ہے یا دارالحرب؟ کی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے اس وقت شیخ فتح اللہ نے یہ کہہ کر کہ ترکی دارالخدمت ہے اس بحث کو ہی ختم کر دیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ خدمت کا یہ جذبہ تقریباً ساری دنیا میں پھیلتا چلا گیا اور ایک ایسی نسل تیار ہو گئی جو بالکل خاموشی کے ساتھ لوگوں کی خدمت کرنے لگی۔ انہیں کسی معاوضے کی خواہش تھی اور نہ کسی دنیوی منفعت کی لالچ، بلکہ اخلاص میں کمی کے خوف سے وہ کسی روحانی مرتبے کی خواہش بھی نہ کرتے۔ محبت اور صبر ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ انہیں اختلافات میں پڑنے کی فرصت نہ تھی۔ انہیں بس باہمی تعاون اور تعمیری کام کی دھن لگی

رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہ دیتے تھے۔ جلد ہی ان کی خدمات کا دائرہ وسیع ہو کر زندگی کے دوسرے شعبوں تک پھیل گیا، چنانچہ انہوں نے پہلے اخبارات اور رسائل نکالنا شروع کیے اس کے بعد ریڈیو اسٹیشن اور پھر ٹیلی ویژن اسٹیشن بھی قائم کر لیے، جس کے نتیجے میں وہ فضل خداوندی سے لوگوں کی امیدوں کا مرکز بن گئے۔

محبت، افہام و تفہیم، نرم مزاجی اور گفت و شنید کی بادِ صبا

۱۹۹۱ء سے شیخ فتح اللہ نے باہمی گفت و شنید، افہام و تفہیم اور تعصب سے پاک ایک قائدانہ تحریک کا آغاز کیا۔ آہستہ آہستہ اس تحریک کی بازگشت نہ صرف ترکی بلکہ ترکی سے باہر بھی سنی جانے لگی۔ اس تحریک کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شیخ محمد فتح اللہ نے پوپ کی دعوت پر ویٹی کن سٹی میں اس سے ملاقات کی، جس میں شیخ نے اس بات پر زور دیا کہ چونکہ ذرائع مواصلات کی حیرت انگیز ترقی کی بدولت پوری دنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے، اس لئے تعصب، اختلافات اور نفرت پر مبنی کوئی بھی تحریک مثبت نتائج تک نہیں پہنچ سکتی، نیز چونکہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رونما ہونے والے حادثے یا تبدیلی کا اثر پوری دنیا پر پڑ سکتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کسی بھی عقیدے، فکر اور فلسفے سے تعلق رکھنے والے افراد سے فراخ دلی کا برتاؤ کیا جائے۔ سویت یونین کی شکست وریخت اور وارشو پیکٹ کی ناکامی کے بعد عالمی طاقتوں نے اسلام اور مسلمانوں کو آسان ہدف سمجھ کر ان کے خلاف جنگ کو ناگزیر قرار دے دیا، جس کے نتیجے میں بعض اوقات انتہاء پسندی اور دہشت گردی کا بھی ظہور ہوا۔ یہ طاقتیں جہاد کو بغاوت، جنگ کو سلامتی، ظلم کو انصاف اور بغض کو محبت کا نام دیتی ہیں۔

مذکورہ بالا صورتِ حال کے پیش نظر شیخ فتح اللہ نے ترک معاشرے میں گفت و شنید اور رواداری کی دعوت کا آغاز کیا، کیونکہ بہت سی قوتیں نسلی، قومی، مذہبی، گروہی اور فکری اختلافات کو ہوا دے کر اس معاشرے کا شیرازہ بکھیرنے کی سر توڑ کوششیں کر رہی تھیں، تاہم آپ نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ گفت و شنید اور رواداری کی اس دعوت کو ترکی سے باہر بھی جہاں کہیں ممکن ہو سکا پھیلانے کی کوشش کی۔

مؤلفات

بہت سے بلند پایہ لوگ نئے افکار و نظریات کے حامل ہوتے ہیں، لیکن جب وہ اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں تو ناکام ہو جاتے ہیں۔ بہت سے حضرات فعال اور سرگرم داعی ہوتے ہیں، لیکن بقدرِ ضرورت علم اور گہری بصیرت سے محروم ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ صرف حکومت واقتدار کے مالک ہوتے ہیں یا پھر محض حکمت عملی اور سیاسی داؤپیچ کے ماہر۔ اسی طرح بعض حضرات زندگی کے کسی خاص شعبے میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں، لیکن عمل کے دوسرے میدانوں میں ان کی کوئی خاص خدمات نہیں ہوتیں، چنانچہ بعض لوگ بڑے اچھے لکھاری یا شاعر یا فنونِ لطیفہ کے ماہر یا بہت بڑے عالم یا خطیب یا فلسفی تو ہوتے ہیں، لیکن معاشرے میں مثبت تبدیلی کا باعث بننے والی کوئی تحریک نہیں چلا پاتے۔

اسی طرح بعض لوگ اقتصادیات یا سیاسیات میں صفِ اول کے ماہر یا مایہ ناز عسکری قائد ہوتے ہیں، لیکن دین اور اخلاقیات کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی زبانیں گنگ ہو جاتیں ہیں، جبکہ دوسری طرف بہت سے حضرات دینی مسائل اور روحانی واخلاقی امور میں اپنی تمام توانائی خرچ کر ڈالتے ہیں، لیکن انہیں اقتصادی اور معاشرتی مسائل پر دسترس حاصل نہیں ہوتی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس دنیا نے اپنی طویل عمر میں بے شمار بلند پایہ شخصیات کو دیکھا، لیکن ان میں سے ہر ایک کے اثرات کسی نہ کسی خاص میدان میں منحصر ہو کر رہ گئے اور اپنی نافعیت کامل طور پر دوسروں کی طرف منتقل نہ کر سکے، لیکن اس کے مقابلے میں جب شیخ فتح اللہ گولن کا ذکر آتا ہے تو نہ صرف ان کی کتابوں، مواعظ، بیانات اور آڈیو اور ویڈیو خطبات کی طرف ذہن جاتا ہے، بلکہ ایک اور چیز کی طرف بھی خیال جاتا ہے، جسے وہ "جیش النور" یا "جنود الحق" کا نام دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ سے استفادہ کیا اور آپ کے آثارِ جمیلہ میں شمار ہوئے، نیز آپ کے منتسبین کی خدمات کو ان اداروں اور تنظیموں سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، جن کا جال انہوں نے دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دیا ہے۔

آپ کی تحریر کردہ کتابوں کی تعداد 60 سے زائد ہے۔ جن کا 35 زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ہم ذیل کی سطور میں ان کے چند علمی آثار کا اختصار کے ساتھ ذکر کیے دیتے ہیں

۱۔ ان کے خطبات، مواعظ، بیانات اور مجالس پر مشتمل ہزاروں کی تعداد میں آڈیو اور ویڈیو کیسٹیں موجود ہیں۔

۲۔ الأسئلة الحائرة التی أفرزها العصر (۴ حصے) یہ کتاب مختلف اوقات میں ان سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

۳۔ الموازین أوأضواء علی الطریق (۴ حصے) یہ کتاب معرکہ زندگی میں عقل وروح اور تصوف وحکمت کے پیمانوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ العصر والجیل، الانسان فی تیار الازمات، نحو الجنة المفقودة، الصفحة الذهبية للزمن، أنفاس الربيع اور عندما نقيم معبد روحنا.

یہ پانچوں کتابیں آپ کے ان مضامین کا مجموعہ ہیں جو سالہا سال تک بعض ماہانہ اور سہ ماہی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

۵۔ النور الخالد: محمد ﷺ مفخرة الانسانية (۲ جلدیں) یہ کتاب خاتم الانبیاء رحمت للعالمین محمد ﷺ کی سیرتِ مطہرہ پر آپ کے بیانات کا مجموعہ ہے۔

۶۔ فی ظلال الایمان (۲ جلدیں) یہ کتاب ایمانی حقائق کے بارے میں ناقابل تردید دلائل کا مجموعہ ہے۔

۷۔ تلال القلب الزمردية: اس کتاب میں سرچشمۂ اسلام سے پھوٹنے والی روحانی زندگی اور تصوف کی درست اصطلاحات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

۸۔ براعم الحقيقة فی جیل الألوان (۲ جلدیں) یہ آپ کے اشعار اور مقالات کا مجموعہ ہے۔

۹۔ تأملات فی سورة الفاتحة: یہ ان لیکچرز کا مجموعہ ہے جو آپ نے علوم شرعیہ کے طلبہ کو دیئے تھے۔

۱۰۔ المنشور (۲ جلدیں) یہ مختلف مواقع پر آپ سے پوچھے گئے سوالات کے جوابات اور مختلف مجالس کے دوران بیان کردہ احادیث کا مجموعہ ہے۔

۱۱۔ الجهاد أو اعلاء كلمة الله: اس کتاب میں دورِ حاضر میں جہاد کے موضوع کے علمی و نظری پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۲۔ الحياة بعد الممات: اس کتاب میں اخروی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے۔

۱۳۔ القدر في ضوء الكتاب والسنة: اس کتاب میں مسئلہ تقدیر کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے۔

۱۴۔ محور الارشاد: اس کتاب میں دورِ حاضر میں فعال اور سرگرم طریقے سے دعوت و تبلیغ کے کام کو سرانجام دینے کے طریق کار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۵۔ البعد الميتافيزيقي للوجود (۲ جلدیں) اس کتاب میں علمی، عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ وجود کی حقیقت اور روح، جنات اور فرشتوں کی ماہیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۶۔ ريشة العازف المكسورة: یہ آپ کے اشعار کا مجموعہ ہے۔

آپ کی مذکورہ بالا تمام کتابیں ترکی میں ستر ستر ہزار کی تعداد میں شائع ہو چکی ہیں، نیز آپ کی بعض کتابوں کا دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جا چکا ہے۔

آپ کی درج ذیل کتب کو انگریزی زبان کے قالب میں ڈھالا جا چکا ہے:

النور الخالد، فی ظلال الایمان، الحیاة بعد الممات، الأسئلة الحائرة التی أفرزها العصر کی پہلی جلد، براعم الحقیقة کی پہلی جلد، الموازین کی پہلی جلد، تلال القلب الزمردیة اور نحو الجنة المفقودة۔

درج ذیل کتب کا جرمن زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے:

النور الخالد، فی ظلال الایمان، الحیاة بعد الممات، الموازین، الأسئلة الحائرة اور نحو الجنة المفقودة۔ ان میں سے ہر ایک کی صرف پہلی جلد کا ترجمہ ہوا ہے۔

آپ کی کتاب فی ظلال الایمان کا ترجمہ بلغاروی زبان میں، آپ کے دیوان ریشة العازف المکسورة اور الأسئلة التی أفرزھا العصر کے منتخب حصوں کا جاپانی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے، نیز آپ کی کتاب الأسئلة الحائرة کے پہلے حصے کا ترجمہ روسی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔

درج ذیل کتب کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے:

۱۔ القدرفی ضوء الکتاب والسنة
۲۔ الموازین أوأضواء علی الطریق
۳۔ مختارات من کتاب الأسئلة الحائرة التی أفرزھا العصر
۴۔ الجھاد أو اعلاء کلمة اللہ.

جیسے جیسے ممکن ہو گا ان شاء اللہ آپ کی بقیہ کتب کو بھی عربی زبان کے قالب میں ڈھالا جاتا رہے گا۔

اردو زبان میں درج ذیل کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں:

۱۔ تقدیر کتاب و سنت کی روشنی میں
۲۔ المیزان یا چراغِ راہ
۳۔ روح جہاد اور اس کی حقیقت
۴۔ اسالیب دعوت اور مبلّغ کے اوصاف
۵۔ اضواءِ قرآن در فلکِ وجدان
۶۔ تخلیق کی حقیقت اور نظریہ ءارتقاء
۷۔ نور سرمدی، فخر انسانیت حضرت محمد ﷺ (دو جلدیں)
۸۔ تعمیر شخصیت
۹۔ ملاحظات فاتحہ

۱۰۔ جنت گمشدہ کی طرف

۱۱۔ اسلام کے بنیادی ارکان

۱۲۔ اسلام اور دورِ حاضر (جدید ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات)

۱۳۔ روح کے نغمے اور دل کے غم

آپ کی بقیہ کتب کا اردو ترجمہ بھی ان شاء اللہ جلد شائع ہو جائے گا۔

چونکہ یہ کتاب مساجد میں دیئے گئے مواعظ اور طلبہ و مریدین کے لیے منعقد کی گئی خصوصی مجالس میں سوالات کے جوابات کا مجموعہ ہے جسے مصنف کے شاگردوں نے تحریر کیا اور مصنف کی رضامندی اور تصحیح کے بعد شائع کیا جارہا ہے، اس لیے بعض مقامات پر اس کے اسلوب اور مضامین پر خطیبانہ انداز کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔

استاد فتح اللہ گولن کے بارے میں دیگر معلومات تقریبا 25 ویب سائٹس پر موجود ہیں۔ مندرجہ ذیل ویب سائٹ کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے:

English:http://:en.fgulen.com

Urdu:http://pk.fgulen.com

Arabic:http://ar.fgulen.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(اقرأ) کے حکم سے نزولِ قرآن کے آغاز کی حکمت کیا ہے؟

(اقرأ) کا حکم خداوندی تمام کمالات کی جامع اعلیٰ ترین ہستی کے لیے اور ان کے ذریعے سے ساری مخلوق کے لیے ایک حکم، دعوت اور خدائی ذمہ داری ہے۔ یہ کائنات جسے ہمارے غور و فکر کے لیے ہماری نگاہوں کے سامنے پھیلایا گیا ہے اور جو خالق کائنات کے پیدا کردہ نظام، اس کی قدرت، عظمت اور جمال کی گواہ ہے، لوح محفوظ کا محض پرتو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کے سوا اس کائنات کی ہر زندہ و بے جان چیز کو اس کائنات میں ودیعت کردہ تجلیات اور حکمتوں کو بے نقاب کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔

ہر زندہ اور بے جان چیز کتاب کی مانند ہے، یہی وجہ ہے کہ "انظر" (دیکھیے) اور "شاہد" (مشاہدہ کیجئے) کی بجائے (اقرأ) (پڑھیے) کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ صرف کتاب کو ہی پڑھا جاسکتا ہے۔ چونکہ اس کائنات کی ہر زندہ چیز کتاب کی مانند ہے، اس لیے یہ کائنات ایک بہت بڑے خدائی کتب خانے کی حیثیت رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ جہاں انسان کے سوا دوسری ساری مخلوق کو لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، وہیں حضرت انسان کو لکھنے کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

علم نظام کائنات کی تجلیات کی معرفت حاصل کرنے، کائنات کی مختلف اشیاء کے درمیان موجود تعلق کو جاننے اور ان میں سے ہر ایک کو اس کے مقام پر رکھنے سے عبارت ہے۔ چونکہ اس تمام نظم و نسق اور نظام کائنات میں پائی جانے والی باریک بینی و ہم آہنگی کا باعث اتفاق محض کو قرار نہیں جا سکتا، اس لیے اس نظام کے لیے کسی واضع کا ہونا ضروری ہے، ایک ایسا واضع جس کے وجود میں کسی قسم کا ابہام نہ ہو۔

کسی بھی نظام کو وجود میں لانے سے پہلے اس کا ایسے ہی تصور کیا جاتا ہے، جیسے ایک ماہر تعمیرات نقشے کو کاغذ پر بنانے سے پہلے اس کا تصور کرتا ہے۔ اگر ہم انسان اور اس کے فکر کی مادی ساخت اور اُس کے اِس کے تصورِ وجود پر اثرانداز ہونے کے طریق کار سے صرف نظر کرلیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح لوح محفوظ کائنات میں موجود وسیع نظام سے عبارت ہے، اسی طرح قرآن کریم لوح محفوظ کا پرتو اور اس نظام کی تحریری صورت ہے، اس لیے انسان کا فرض ہے کہ وہ پڑھے اور جب بھی پڑھے سمجھنے کی کوشش کرے۔ بعض اوقات اس سے سمجھنے میں غلطی بھی ہوسکتی ہے اور علم کے جوہر کے ذریعے اعتماد و یقین کے مقام تک پہنچنے کی سعی و کاوش کے دوران وہ صحیح و غلط تجربات سے گزر سکتا ہے۔

دیکھنا، مشاہدہ کرنا اور سمجھنا ایک دوسرے سے مختلف امور ہیں، جبکہ سمجھی یا قبول کی جانے والی بات کا قلب و شعور پر نقش ہونا بالکل مختلف چیز ہے اور اس کے بعد اسے عملی صورت پہنانا اور دوسروں کو اس کی دعوت دینا بالکل مختلف بات ہے۔ یہ تمام مختلف لیکن فہم و ادراک سے پیوستہ امور ہمہ وقت موجود رہتے ہیں، کیونکہ کائنات میں بہت سے قوانین کارفرما ہیں، جنہیں وضع کرنے والی ہستی باریک بینی اور ہم آہنگی کے ساتھ چلاتی ہے۔ ان میں سے بعض قوانین حسبِ ذیل ہیں :

۱۔ وحدت سے کثرت کی طرف سفر۔

۲۔ اس کثرت کے درمیان مشابہت، اختلاف اور تضاد کا پایا جانا۔

۳۔ اضداد کے درمیان فعال توازن کا پایا جانا۔

۴۔ باری باری ذمہ داری اٹھانا

۵۔ سیکھنا، بھولنا اور پھر نئے سرے سے سیکھنا۔

۶۔ جدوجہد کرنا۔

۷۔ تجزیہ و ترکیب۔

۸۔ کشف و الہام۔

چونکہ یہ تمام قوانین انسان پر بھی لاگو ہوتے ہیں، اس لیے فکر و نظر، عقیدہ و کردار اور طرز عمل کے لحاظ سے لوگوں میں تنوع، فرق اور اختلاف فطری بات ہے، لیکن یہ فطری امتیازات اور تضادات بے حس و حرکت نہیں ہوتے، بلکہ متوازن انداز میں فعال کردار ادا کرتے ہیں، لہذا یہ فطری بات ہے کہ بعض اوقات ایمان کی طرف کی جانے والی سعی علم سے محروم ہوتی ہے اور بسا اوقات علم کی خاطر کی جانے والے سعی نہ صرف ایمان سے خالی ہوتی ہے، بلکہ اسے نظر انداز کر دیتی ہے، اسی لیے علم و عبادت، اقرار و انکار، فضائل و رذائل، انصاف و ظلم، محبت و نفرت اور جنگ و امن ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کی زندگی میں سستی، پژمردگی اور دوسروں پر انحصار کی عادت پائی جاتی ہے، جبکہ بعض دوسرے انسان سمجھتے ہیں کہ وہ سب کچھ اکیلے ہی سرانجام دے سکتے ہیں، جس کے نتیجے میں ان کی زندگی میں جلد بازی، انتہاپسندی، جنون اور خواہش پرستی دیکھنے میں آتی ہے، جو کبھی تو تعمیری کردار ادا کرتی ہے اور کبھی تخریبی۔

رحمۃ للعالمین کی حیثیت سے مبعوث ہونے والی یکتائے روزگار شخصیت کی تعلیمات کے بارے میں بھی نسیان پیش آ سکتا تھا، لیکن اسے از سر نو یاد کرنے اور سیکھنے کی ضرورت تھی اور اس قسم کے تجزیہ و تحلیل کے نتیجے میں نئی بحث، نئے فکر اور نئی وحی کا ظہور ہونے والا تھا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا، ایسا ہونا ناگزیر تھا اور آج تک ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ معاشرتی زندگی کی عمارت استوار کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر "دس احکام" کا نزول ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انسانی تعلقات کے بارے میں بردباری، شفقت و رحمت، محبت اور صبر و تحمل کا الہام ہوا اور نبی اکرم ﷺ کو اوپر ذکر کردہ امور کے علاوہ علم، ارادہ، حکمت، اعتدال پسندی، افکار کا تجزیہ و تحلیل کرنے کی صلاحیت، فصاحت اور جوامع الکلم عطا کیے گئے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان کی ذمہ داریاں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بھی ہیں اور مشکل بھی، لیکن ان میں لطافت اور عظمت بھی اسی تناسب سے زیادہ ہے، کیونکہ ان میں "دس احکام" اور محبت، عفو و درگزر، شفقت و بردباری اور

صبر و تحمل جیسے معاشرتی اصولوں کے علاوہ علم و حکمت، ارادہ وانکسار اور تالیف قلوب بھی شامل ہیں، جس کالازمی نتیجہ ان کی عظمت کے اثبات کی صورت میں نکلتا ہے، لہٰذا طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات کے میدان میں ہونے والے نئے نئے انکشافات اور سائنسدانوں کے ہاتھوں حاصل ہونے والی ترقی احترام کی نظر سے دیکھے جانے کی مستحق ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے کائنات کی اشیاء کے درمیان موجود تعلق کے بارے میں بہت سے قرآنی حقائق سے پردہ اٹھا ہے، تاہم اس کے ساتھ ساتھ انسانیت کو خالقِ کائنات کے وجوداور الہام و وحی کے انکاراور انسانی ارادے کو حاکمیت اعلیٰ کا مقام دے کر الوہیت کا درجہ دینے کی فکری گمراہی سے بچانا بھی ضروری ہے۔

سائنسی تجربات اور نئے دریافت ہونے والے قوانین کی روشنی میں اگر طبیعیات، کیمیا اور حیاتیات کے علوم کو نئی راہیں نہ دی گئیں تو اس معاشرے کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا، جس میں نئی ایجادات سے دھوکے میں مبتلا انسان سرکشی پر اتر آیا ہے، وہ تمام انسانی پابندیوں سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرنے لگا ہے اور زیادہ بے باک ہو کر احساسِ ذمہ داری سے محروم ہونے لگا ہے۔ آج انسان انسانی اقدار سے دور ہو کر ان جانوروں کی مانند ہو گیا ہے، جن پر تجربہ گاہوں میں تجربات کیے جاتے ہیں، لہٰذا انسان پر لازم ہے کہ وہ اس شعور کو بیدار کرے کہ وہ انسان ہے اور یہ کہ معاشرہ اس پر تجربات کرنے کے لیے تجربہ گاہ نہیں ہے۔

غرض عصری علوم کو جمود و خمود اور بے فائدہ امور سے پاک کرنا ضروری ہے۔ اس سے ایک تو موضوع کے مسئلے کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملتی ہے، جس سے علوم خصوصی طور پر بحث کرتے ہیں، دوسرے اس کے ذریعے انسان اپنے ارادے اور ذہنی صلاحیتوں کے مطابق اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے کے قابل بنتا ہے اور باطنی طور پر اپنے احساسات اور دل کی کیفیات کا مشاہدہ کر سکتا ہے، جس کے نتیجے میں تعلیم یافتہ انسان فصیح زبان اور ایسے دل کی مانند ہو جاتا ہے، جو اپنے سامنے کھلی کتاب کی طرح موجود کائنات کو ایک ایک سطر کر کے پڑھ سکتا ہے۔ اس بات کو

نظر انداز کرنا ممکن نہیں کہ کائنات خصوصاً اس کے تکوینی امور کتاب سے مختلف نہیں، چونکہ قلم کو سب سے پہلے پیدا کیا گیا ہے، اس لئے قرآن کریم میں سب سے پہلے نازل ہونے والا حکم (اقرأ) (پڑھیے) ہے۔

لیکن یہ مسئلہ اتنا سہل نہیں جتنا کہ پہلی نظر میں دکھائی دیتا ہے۔ اس نظریے کے باوجود کہ ظاہری و باطنی قوتِ احساس کی بقدر احساس و شعور قوی ہوتا ہے، کسی بھی حاسہ کو پیش آنے والے عارض کے دوسرے حواس پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اعجاز کے حامل قرآن کریم میں بہرے پن، اندھے پن اور گونگے پن کو ایک ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، کیونکہ اگرچہ آنکھ کے ذریعے بھی تکوینی امور کو پڑھنا ممکن ہے، لیکن تنزیلی امور کے پرتو کو محفوظ کرنے والے اسرار سے سب سے پہلے قوتِ سماع ہی محظوظ ہوتی ہے۔ زبان کا کام تو اس مشاہدے اور سماع کی ترجمانی کرنا ہے، لہٰذا جو انسان انفس و آفاق میں پائی جانے والی نشانیوں کو نہیں دیکھ سکتا وہ اپنے کانوں تک پہنچنے والے اسرار کو بھی نہیں سن سکتا اور اگر سن بھی لے تو سمجھ نہیں سکتا، اسی طرح جس دل کا خدائی احکام سے رشتہ ٹوٹ جائے وہ اپنے کانوں میں پڑنے والی آواز کو نہیں سمجھ سکتا، بلکہ فطری شریعت پر غور و فکر کرنے کو بے فائدہ کام سمجھتا ہے۔

لہٰذا (اقرأ) کا حکم وحدت، تعامل اور تکمیل کی علامت ہے، نیز یہ مشاہدے، قدر پیمائی اور ذکاوت کے پہلو کی طرف اشارہ اور اس روحانی معرفت کی لفظی تعبیر ہے۔ چونکہ یہ ہمیں ملنے والا پہلا حکم ہے، اس لیے اس میں ہمارے لیے غور و فکر کے بہت سے پہلو ہیں۔

اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے اس کی کچھ زیادہ وضاحت کی ہے۔ ممکن ہے بعض اوقات ہم اپنے موضوع سے ہٹ بھی گئے ہوں، لیکن ہمیں امید ہے کہ اگر اس موضوع کا بار بار مطالعہ و تجزیہ اور اس پر غور و فکر کیا جائے گا تو ہمیں اس طوالت کے سلسلے میں معذور سمجھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی حقیقت وماہیت کیا ہے؟

مخلوقات میں سے کوئی بھی مخلوق خواہ اس کا وجود حقیقی ہو یا اضافی اللہ تعالیٰ سے مشابہت نہیں رکھتی۔ اس محدود دنیا میں رہنے والے انسان کی فکر و نظر اور حواس محدود ہیں۔

دنیا کی چیزوں میں سے انسان ایک ملین کا تقریباً صرف پانچ فیصد حصہ دیکھ یا سن سکتا ہے، مثلاً جس آواز کا ارتعاش چالیس ہزار بار فی سیکنڈ سے زائد ہو، اسے انسان نہیں سن سکتا اور اگر یہ ارتعاش کئی ہزار گنا بڑھ جائے تو ایسی آواز کو سننا بطریقِ اولیٰ ناممکن ہو گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی قوتِ سماع محدود ہے اور اس حاسے کی مدد سے ایک ملین کی بہت تھوڑی مقدار کا ادراک کیا جا سکتا۔ جب انسان کی سماعت وبصارت کی صلاحیتیں محدود ہیں تو پھر محدود علم، سماعت اور بصارت کا مالک انسان کیونکر یہ پوچھنے کی جرأت کرتا ہے کہ اللہ دکھائی کیوں نہیں دیتا؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ انسان کا اس قسم کے سوالات پوچھنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف کیف وکم کی نسبت کرنے اور اس کی ذات کے بارے میں سوچنے کی کوشش کرنا بے باکی اور اپنی حدود سے تجاوز ہے۔

اے انسان! تیری اور تیرے علم کی حیثیت ہی کیا ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کا ادراک کرنے کی کوشش و جرأت کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کیف وکم سے پاک ہیں۔ تیرے ناقص معیار اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اگر تو روشنی کی رفتار سے دوسرے جہانوں کی طرف ایک ٹریلین سال تک سفر کرتا رہے اور پھر انہیں آپس میں ملا لے پھر بھی تیرے زیر مشاہدہ آنے والی اشیاء اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ایک ذرے کی حیثیت نہیں رکھتیں۔

جب ہم براعظم انٹارکٹکا(۱) کے بارے میں پورا علم رکھنے سے عاجز ہیں تو ہمیں کون ومکان کے خالق اور ان کا نظام چلانے والے اللہ تعالیٰ کی حقیقت وماہیت کا کیسے علم ہو سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے کیف وکم سے پاک اور ہمارے ہر تصور وخیال سے ماورا ہیں۔

علمائے کلام کا کہنا ہے: "جس چیز کا بھی تم اپنے دل میں تصور کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے سوا ہے۔" صوفیائے کرام کہتے ہیں: "جس چیز کا بھی تم اپنے دل میں خیال کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے وراء الوراء ہے۔ تم پردوں میں ایسے گھرے ہوئے ہو، جیسے فانوس میں چراغ۔" دیکارٹ لکھتا ہے: "انسان ہر پہلو سے محدود ہے اور محدود لا محدود کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔" چونکہ اللہ تعالیٰ کا وجود غیر محدود اور لامتناہی ہے، اس لیے عاجز اور محدود انسان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ جرمن ادیب گوئٹے لکھتا ہے: "اے نامعلوم مگر موجود ہستی! لوگ ایک ہزار ناموں سے تجھے یاد کرتے ہیں، لیکن اگر میں ہزاروں ناموں سے تیرا تذکرہ کروں تب بھی تیری تعریف کا حق ادا نہیں کر سکتا، کیونکہ تیری ذات ہر وصف سے ماوراء ہے۔"

اہل فکر جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، لیکن اس کا ادراک ممکن نہیں۔ ذہن اللہ تعالیٰ کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے اور نہ ہی کان اسے سن سکتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے بارے میں انبیائے کرام کی تعلیمات کی پیروی کرتے ہوئے اس پر ایمان لانے کے سوا چارہ نہیں۔

وجود اور علم کے لئے مبدأ اول اور علت اولیٰ کی حیثیت رکھنے والے اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ادراک کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ ہمارا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود کے نور کا پرتو ہے اور ہمارا علم ہر چیز پر محیط خدائی علم کی ایک ادنیٰ تجلّی ہے۔ اگرچہ ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے اور مقام عرفان کو پانے کا راستہ موجود ہے، لیکن یہ راستہ اشیاء کا علم حاصل کرنے کے عام طریقے سے بالکل مختلف ہے۔ نفس کے دھوکے میں مبتلا، باطنی الہام سے ناآشنا اور اس کی چاشنی سے محروم لوگ غلط راستے پر چل کر اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ اکثر کہا کرتے ہیں: "ہم نے اللہ کو تلاش کیا، لیکن اسے نہیں پایا۔" یہ انتہائی گمراہ کن بات ہے اور سائنس وفلسفہ کے لبادے میں ایک بے سروپا دعویٰ ہے۔

اللہ تعالیٰ ایسے معبود، ہیں جن کا ظہور قلب وروح کی معراج کے دوران ہمارے انفس وآفاق میں ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ان کے وجود کے ناگزیر ہونے کا عقیدہ ہمارے قلب وروح

میں راسخ ہو جاتا ہے۔ ہمارے تمام علوم کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھنے والا یہ وجدانی احساس ہمارے تمام نار ساعلوم وافکار سے قوی تر ہے، لیکن اس کے باوجود بسااوقات ہم کسی باطنی رکاوٹ کی وجہ سے اپنے اندر موجود اس صلاحیت سے غافل ہو کر غلطی و گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کائنات وجودِ خداوندی کی دلیل اور اس کا ذرہ ذرہ اس پر گواہ ہے۔ قرآن کریم بلیغ ترین الفاظ میں اس حقیقت کی یاددہانی کراتا ہے۔ ہمارے رسول ﷺ بلیغ ترین اور کامل ترین رسول ہیں۔ صوفی شاعر ابراہیم حقی(2) کہتے ہیں:

قال الحق :أنا کنز لم یسعنی۔۔۔

لا الأرض۔۔۔ ولا السماء۔۔۔

ولکن وسعنی القلب۔۔۔

”حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں ایسا خزانہ ہوں، جس کی وسعت کا احاطہ زمین کر سکی اور نہ آسمان، لیکن (مؤمن کے) دل نے مجھے اپنے اندر سما لیا ہے۔“

خدا دکھائی کیوں نہیں دیتا؟

دراصل کسی چیز کو دیکھنے کا تعلق اس کا احاطہ کرنے سے ہوتا ہے، مثلاً انسان کے جسم میں بے شمار جراثیم ہیں۔ انسان کے صرف ایک دانت کے نیچے لاکھوں بیکٹیریا پائے جاتے ہیں، جو انسان کے دانت میں سوراخ کرکے اسے خراب کرسکتے ہیں، لیکن انسان ان کی آواز اور شور سن سکتا ہے اور نہ ہی ان کا وجود محسوس کر سکتا ہے، اسی طرح یہ بیکٹیریا بھی انسان کو دیکھنے اور اس کا احاطہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے، کیونکہ بیکٹیریا کے لئے انسان کا احاطہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسان سے باہر کسی مستقل جگہ میں ہوں اور ان کی آنکھیں دور تک دیکھ سکتی ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیکٹیریا کا انسان کا احاطہ نہ کر سکنا ان کے لیے انسان کو دیکھنے سے مانع ہے۔ وہ اپنے سامنے موجود چیز کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتے۔

عالم اصغر سے ایک مثال کے بعد اب ہم عالم اکبر سے مثال پیش کرتے ہیں۔ تصور کریں ہم چالیس کھرب نوری سال کی مسافت پر موجود چیزیں دکھا سکنے والی دوربین کے سامنے بیٹھے ہیں، لیکن اس کے باوجود کون ومکان کے بارے میں ہمارا علم سمندر میں ایک قطرے کے برابر ہے۔ بعض اوقات ہم اس دوربین کی حدود میں آنے والی چیزوں سے متعلق بعض غیر واضح نظریات قائم کرنے اور کچھ معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور ان مفروضات اور معلومات کو دوسرے مفروضات اور معلومات تک رسائی حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں، لیکن ہم کائنات کی ماہیت، نظام، عمومی شکل اور محتویات کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے، کیونکہ جیسے ہم عالم اصغر کے مکمل احاطے پر قادر نہیں، ایسے ہی ہم عالم اکبر کے احاطۂ کاملہ کی استطاعت نہیں رکھتے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ جیسے ہم خوردبین اور ایکس ریز رکھنے کے باوجود عالم اصغر کا مکمل احاطہ نہیں کر سکتے، ایسے ہی ہم عالم اکبر کا کامل احاطہ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اب ہم اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوچتے ہیں۔ آپ ﷺ کا فرمان مبارک ہے: ”ساتوں آسمان اللہ کی

کرسی کے مقابلے میں ایسے ہیں، جیسے ڈھال میں پڑے سات درہم۔" حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عرش کے مقابلے میں کرسی کی حیثیت بیاباں میں پڑی لوہے کی انگوٹھی کی سی ہے۔"(3)

اب آپ اس عظیم شان و شوکت کا تصور کریں اور آپ جو اس کائنات کے مقابلے میں خوردبینی اجزاء کی مانند ہیں، کیسے کون و مکان کے احاطے کا دعوی کرسکتے ہیں؟ جبکہ تمام مقامات اور تمام جہان اللہ تعالیٰ کے اس عرش کے مقابلے میں خوردبینی اشیاء ہیں، جو محض خدائی ارادے اور احکامات کی تنفیذ کا محل ہے... کیا یہ فضول کام میں مشغول ہونے کے مترادف نہیں؟ لہذا اللہ تعالیٰ کا احاطہ کرنے کی سعی و کاوش کی فضولیت کا آپ اندازہ لگالیجئے۔ قرآن کریم میں مذکور ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ﴾ (سورۃ الأنعام:۱۰۳) "وہ ایسا ہے کہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں، جبکہ وہ نگاہوں کا ادراک کرلیتا ہے۔" دیکھنے کے لیے احاطہ کا پایا جانا ضروری ہے... اللہ تعالیٰ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے اور اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے... لیکن بصارت اور آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں۔ اس معاملے کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے اس امر کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیں تو نور اللہ تعالیٰ کا حجاب اور پردہ ہے اور ہم تو نور کا ہی احاطہ نہیں کرسکتے۔ نبی اکرم ﷺ کے معراج سے لوٹنے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا: "کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟" حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آپ ﷺ نے جواب دیا: "اللہ تو نور ہے۔ میں کیسے اسے دیکھ سکتا ہوں۔"(4) اور ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میں نے نور دیکھا تھا۔" جبکہ نور مخلوق ہے۔ اللہ نے اسے روشنی اور سہارا دیا اور اسے شکل و صورت بخشی۔ نور اللہ نہیں، بلکہ اس کی مخلوق ہے۔ اسی امر کی وضاحت اللہ تعالیٰ سے متعلق ایک حدیث مبارک میں یوں آئی ہے: "اس (اللہ کا) پردہ نور ہے۔"(5) یعنی اللہ اور تمہارے درمیان ایک نور ہے اور تمہیں نور کے ذریعے گھیرا گیا ہے... یہاں ایک باریک نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا احاطہ اس کی صفات کے ذریعے کیا گیا ہے، جو اس کا عین ہیں اور نہ غیر۔

جب ہم الوہیت سے متعلقہ مسائل پر گفتگو کرتے ہیں تو اس کی پیچیدگی اور مشکل ناقابل برداشت حد تک بڑھ جاتی ہے اور بطور نتیجہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آنکھیں اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں کر سکتیں اور اس کا پردہ نور ہے۔ اب ہم اس موضوع پر ایک تیسرے پہلو سے روشنی ڈالتے ہیں۔ شاعر صوفی ابراہیم حقی لکھتے ہیں: "... میرے رب کا کوئی ہم رتبہ ہے اور نہ ہی مقابل... وہ ہر مثیل اور شبیہ سے پاک ہے... وہ صورت سے بھی پاک ہے... وہ بہت مقدس اور بہت بلند ہے"...

پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مقابل نہیں ہے۔ یہ انتہائی اہم بات ہے، کیونکہ کسی بھی چیز کے قابل مشاہدہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا کوئی مقابل ہو۔ ہم روشنی کا مشاہدہ اس لیے کرتے ہیں کہ اس کا مقابل اندھیرے کی صورت میں پایا جاتا ہے، ایسے ہی آپ کسی لمبی چیز کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک میٹر ہے اور یہ تین میٹر، کیونکہ ان کی اضداد موجود ہیں، جن کی وجہ سے انہیں ترتیب دینا ممکن ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس نور کی مانند نہیں ہے، جسے ہم اس کے مقابل اندھیرے کی وجہ سے دیکھ سکتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کوئی مقابل ہے اور نہ ہی کوئی ہم رتبہ۔

اس موضوع کو طبیعیات کے پہلو سے دیکھیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان اس وسیع و عریض کائنات کی کتنی فیصد اشیاء کو دیکھ سکتا ہے؟ کیا آپ اپنے مشاہدے میں آنے والی اشیاء کا تناسب بتا سکتے ہیں تاکہ ہم اللہ کی عظمت کا مشاہدہ کر کے اس کے احترام اور عزت کو پہچان سکیں؟ فرض کریں کائنات میں موجود چیزوں کی تعداد کھربوں میں ہے، مگر ہماری آنکھ تو دس لاکھ میں سے صرف پانچ چیزوں کا مشاہدہ کر سکتی ہے۔ باقی چیزوں کو ہم دیکھتے ہیں اور نہ جانتے ہیں۔ ہم تو روشنی کی صرف خاص قسم کے طول اور ارتعاش والی شعاعوں کو دیکھ پاتے ہیں۔ آپ ذرا اُن لوگوں کے اِس سوال کے لغو پن کی انتہا دیکھیں، جو پوچھتے ہیں کہ ہم اللہ کو کیوں نہیں دیکھ پاتے؟ حالانکہ وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کائنات کی دس لاکھ چیزوں میں سے صرف پانچ کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، مزید ستم یہ کہ وہ بالکل سطحی سوچ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو بھی عام اشیاء پر قیاس کرتے ہیں۔

روزِ قیامت اللہ تعالیٰ کو وہی شخص دیکھ سکے گا، جس نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کیا ہو گا، لہٰذا موسیٰ علیہ السلام اور سر تاجِ انبیاء حضرت محمد ﷺ اُس دن اللہ کا دیدار فرمائیں گے۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے مرتبے کے لحاظ سے اللہ کو دیکھیں گے۔ یہ غور و فکر کی پرزور دعوت و ترغیب ہے۔ جو لوگ آخرت میں بلند مراتب پر فائز ہونا چاہتے ہیں، انہیں اپنے دل اور فکر کی تجدید کرنی چاہیے۔ زیادہ درست لفظوں میں وہ دنیا میں اس قدر بلند حوصلہ، روح اور فکر والے بن جائیں کہ قیامت کے دن انہیں اللہ کا دیدار نصیب ہو سکے، یعنی دنیا سے کچھ نہ کچھ توشۂ آخرت لے کر جائیں۔ ہر کوئی اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ زادِ راہ لے کر جائے۔ صوفی شاعر ابراہیم حقی ایک ضعیف حدیث جسے موضوع حدیث بھی کہا گیا ہے، کو درج ذیل اشعار کی صورت میں پیش کرتے ہیں:

قال الحق :أنا كنز لم يسعني---

لاالأرض --- ولا السماء ---

و لكن وسعني القلب ---

”حق تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں ایسا خزانہ ہوں، جس کی وسعت کا احاطہ زمین کر سکی اور نہ آسمان، لیکن (مؤمن) کے دل نے مجھے اپنے اندر سما لیا ہے۔“

تاہم جس بابرکت ذات کی عظمت کے مقابلے میں ساری کائنات ایک ذرے کے برابر بھی نہیں، اس کا کتنا بڑا انعام و احسان ہے کہ وہ مؤمن کے دل میں ایک خزانے کی مانند جلوہ گر ہو کر اسے اطمینان اور سکون بخشتی ہے۔ واللہ اعلم

(نعوذ باللہ) خدا کو کس نے پیدا کیا؟

یہ سوال اکثر پوچھا جاتا ہے۔ میں اسے سیدنا محمد ﷺ کی نبوت کی دلیل سمجھتا ہوں۔ آپ ﷺ کی بتائی ہوئی غیب کی خبروں کو درست ثابت ہوتا دیکھ کر میری گردن احتراماً جھک جاتی ہے اور زبان سے بے اختیار نکلتا ہے: "أشهد أن محمداً رسول الله"

بلاشبہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے معزز رسول ہیں۔ آپ ﷺ نے قیامت تک پیش آنے والے واقعات کے بارے میں ایسے بتایا، جیسے آپ ﷺ ٹیلی وژن کی اسکرین کے سامنے بیٹھ کر ہر واقعہ دیکھ کر بتا رہے ہوں۔ آپ ﷺ کی بتائی ہوئی ہر خبر صداقت پر مبنی ہے۔ جن احکام و حوادث کے پیش آنے کی آپ ﷺ نے پیش گوئی فرمائی تھی وہ آپ ﷺ کی پیش گوئی کے عین مطابق وقوع پذیر ہوئے۔ اسی ضمن میں آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا: "لوگ مسلسل یہ سوال کرتے رہیں گے کہ ٹھیک ہے اللہ تعالیٰ ہر چیز کے خالق ہیں، لیکن اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟" (6)

جب مجھ سے یہ سوال کیا گیا تو میں نے دل میں کہا: "أشهد أن محمداً رسول الله (یا رسول اللہ) آپ نے سچ فرمایا اور میں سچ دیکھ رہا ہوں۔" جن لوگوں نے انا پرستی و فرعونیت کی بنا پر سرکشی اختیار کی اور اسباب کی طرف الوہیت کی نسبت کر کے ہر چیز کی وضاحت کرنے کی کوشش کی، ان کی سوچ کے گھٹیا پن اور فکری انحطاط کو اس سے بہتر انداز میں نہیں بیان کیا جا سکتا۔

اب ہم اصل سوال کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہ سوال عموماً منکرین خدا کرتے ہیں اور عام طور پر سادہ لوح لوگ اس قسم کے سوالات سے تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ لامتناہی کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی اسباب کے تسلسل کے ہمیشہ جاری رہنے کے بارے میں درست رائے قائم کر سکتے ہیں۔ اس کے سوا اس خود فریبی کی اور کیا توجیہہ کی جا سکتی ہے؟

یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ شک اور تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کو بھی عام اسباب کی طرح کا ایک سبب سمجھتے ہیں کہ جس کے لیے کسی دوسرے سبب کی ضرورت ہوتی ہے، گویا اللہ تعالیٰ بھی کسی دوسرے سبب کا سبب اور نتیجہ ہیں، حالانکہ یہ سراسر وہم ہے، جس کی وجہ خالق کی معرفت سے محرومی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو مسبب الاسباب ہیں اور ان کے وجود کی کوئی ابتدا نہیں۔

علمائے کرام نے مخصوص قواعد کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اسباب کا لامحدود تسلسل جاری نہیں رہ سکتا، نیز انہوں نے مسبب الاسباب جو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، کے اثبات پر بھی دلائل پیش کیے ہیں۔ آئندہ سطور میں دو ایک مثالوں کی روشنی میں ان کے افکار کا خلاصہ پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ علمائے کرام لکھتے ہیں کہ اسباب کے سلسلے کے بلا توقف جاری رہنے کا قائل ہونا اسباب کی حقیقت سے ناواقفیت اور خالقِ کائنات سے غفلت کا نتیجہ ہے، نیز یہ احتمال بھی درست نہیں کہ اسباب ازل سے مسلسل ظہور پذیر ہو رہے ہوں گے۔ ایسے احتمال کی جستجو سراسر فریب ہے، مثلاً اگر ہم کہیں کہ زمین کی نباتات کی شادابی کا تعلق ہوا، پانی اور سورج سے ہے، ہوا، پانی اور سورج کا وجود بعض مادی اجزاء مثلاً آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن اور نائیٹروجن وغیرہ پر موقوف ہے، ان مادی اجزاء کا وجود ان سے چھوٹے اجزاء پر مبنی ہے اور ان چھوٹے اجزاء کا وجود ان سے بھی چھوٹے اجزاء پر موقوف ہے۔

اس تسلسل کے لامتناہی زمانے تک جاری رہنے اور اس کی روشنی میں اشیاء کے ظہور کے ممکن ہونے کا قائل ہونا سراسر دھوکا اور فریب ہے، خصوصاً جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ مادے کی اضداد بھی موجود ہیں، میٹافزکس، فزکس پر غالب ہے اور پہلے سبب سے لے کر آخری سبب تک سارے کے سارے اسباب چند قوانین کے ضمن میں ایسی ہم آہنگی اور یکسانیت کے ساتھ کام کرتے ہیں، جیسے وہ اپنے فرائض سرانجام دینے پر مامور ہوں۔

بلاشبہ یہ کہنا کہ یہ چیز اُس سے اور وہ چیز اِس سے وجود میں آئی، مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کرتا، بلکہ اسے اور بھی پیچیدہ اور گھمبیر بنادیتا ہے، کیونکہ اسے مسئلے کا ممکنہ حل سمجھنا ایسے ہی ہے جیسے "انڈا مرغی سے یا مرغی انڈے سے پیدا ہوئی۔" کے معنے کو ازل سے جاری سمجھا جائے۔ یہ خیال اور دعوی اس وقت تک بے معنی اور ناقابل حل رہے گا، جب تک ہم انڈے یا مرغی کے وجود کو غیر متناہی قدرت کی حامل ازلی ہستی کی طرف منسوب نہ کریں گے، لیکن جونہی ہم انہیں قائم بذاتہ ازلی خالق کی طرف منسوب کریں گے مسئلہ حل ہو جائے گا، کیونکہ اس صورت میں خواہ ایک خلیے پر مشتمل انڈے کی تخلیق پہلے ہوئی ہو یا بقائے نسل کے لیے انڈے دینے کی صلاحیت کی حامل مرغی کی پیدائش پہلے ہوئی ہو، بات ایک ہی ہے، اس سے نتیجے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لہٰذا مسئلے کے اس پہلو کو نظر انداز کر کے "یہ چیز اُس سے اور وہ چیز اِس سے پیدا ہوئی" کی تکرار کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے اور نہ ہی اس سے ابہام دور ہوتا ہے، کیونکہ اس قسم کے جواب سے اور بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں، مثلاً بارش کا تعلق بادلوں سے ہے، بادلوں کا تعلق مثبت اور منفی ایٹموں سے ہے۔ ان ایٹموں کا تعلق بخارات سے ہے، بخارات کا تعلق پانی سے ہے اور بالآخر پانی کا تعلق پانی کو بنانے والے عناصر سے ہے۔ آپ نے دیکھا کہ چند ہی مراحل کے بعد تسلسل ختم ہو جاتا ہے، لیکن تسلسل کے رک جانے کے باوجود انسان اپنے ذہن کی تسلی کے لیے مختلف قسم کے مفروضے قائم کرنے لگتا ہے کہ ممکن ہے یہ ایسے ہو... ایسے ہو... یا پھر ایسے ہو... ۔ واضح حکمت عملی کے تحت ظہور پذیر ہونے والی انتہائی منظم اور ہم آہنگ دنیا کی اس قسم کی توجیہہ پیش کرنے کی کوشش بچگانہ باتوں کے سوا کچھ نہیں، بلکہ یہ علمی آفاق واہداف کو غلط راستے پر ڈال کر انہیں ہمیشہ تاریکی میں رکھنے کے مترادف ہے، کیونکہ ہر نتیجے کے لیے کسی نہ کسی سبب کا ہونا ناگزیر ہے، لیکن محض غیر منطقی اور غیر معقول اسباب کے اضافے یا تسلسل سے ان میں معقولیت پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی منطق کے ساتھ ہم آہنگی، لہٰذا ایسی خام خیالی ناممکن کو ممکن سمجھنے کے مترادف ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے: فرض کریں میں ایک ایسی کرسی پر بیٹھا ہوں، جس کی پچھلی دو ٹانگیں نہیں ہیں، لیکن اس کرسی کو گرنے سے بچانے کے لیے اسے ایسی ہی ایک اور کرسی کا سہارا دیا گیا ہے، اس دوسری کرسی کو اسی جیسی تیسری کرسی کا سہارا دیا گیا ہے اور یہ سلسلہ ایسی لامتناہی تعداد تک جاری رہا، جسے عقل حیطۂ خیال میں لا سکتی ہے اور نہ ہی زمان و مکان اپنی حدود میں محصور کر سکتے ہیں، لیکن اس کے باوجود جب تک ان تمام کرسیوں کو کسی چار پاؤں والی مکمل کرسی کا سہارا نہیں ملے گا، اس وقت تک اس لامتناہی تسلسل کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

ایک اور مثال لیجئے: فرض کریں ہمارے سامنے ایک صفر ہے۔ اگر اس صفر کی بائیں طرف کسی عدد کا اضافہ نہ کیا جائے تو یہ صفر صفر ہی رہے گا، اگرچہ اس کی تعداد کھربوں میں ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن جیسے ہی اس کی بائیں جانب کسی عدد کا اضافہ کیا جائے گا، صفر کو اس عدد کے مطابق قیمت حاصل ہو جائے گی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اگر کسی چیز کا مستقل اور قائم بذاتہ وجود نہ ہو تو اسی جیسی دیگر عاجز اشیاء اسے وجود بخشنے میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتیں، کیونکہ کسی خاص پہلو سے عجز کے وصف سے موصوف اشیاء کی کثرت عجز و احتیاج میں محض زیادتی کا ہی باعث بنتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر بفرض المحال ہم اسباب کی تاثیر کو تسلیم کر لیں تب بھی علم طبیعیات کا قانون "تناسب علت" سبب اور اس کے نتیجے کے درمیان معقول تناسب کے پائے جانے کو ضروری قرار دیتا ہے، لہٰذا کرۂ ارض کے زندگی کے ظہور کے لیے ساز گار ماحول میں تبدیل ہونے سے لے کر عقل و شعور سے بہرہ مند انسان کے وجود میں آنے تک تمام مظاہر کے پیچھے معقول اور بقدر ضرورت طاقت و قدرت کے حامل اسباب کی تلاش ناگزیر ہے۔

لیکن کرۂ ارض کی موجودہ صورتِ حال یعنی اس کی رفتار، سورج سے فاصلہ، کرۂ فضائی، طبعی گردش، محور کے جھکاؤ کی مقدار، ہوا میں شامل گیسوں کی مقدار اور اقسام، ارضی اور نباتاتی طبقات، سمندر اور ان میں جاری و ساری مخفی قوانین، ہوائیں اور ان کی مختلف ذمہ داریاں

...غرض ہم آہنگی ویکسانیت کے ساتھ وقوع پذیر ہونے والے ہزاروں نہیں لاکھوں واقعات کا سبب اندھے بہرے اسباب یاالل ٹپ اتفاقات کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ایسی کوئی بھی کاوش عقل کے ذریعے عقل کے مقام کو گرانے کے مترادف ہو گی۔

جب علمائے کرام نے "دورو تسلسل" کی دلیل کے ذریعے اسباب کی نفی کر کے انہیں مسبب الاسباب یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹایااور ثابت کیا کہ تمام "ممکن الوجود" اشیاء اوراسباب وعلل "واجب الوجود" کی محتاج ہیں تو در حقیقت انہوں نے توحید کے اثبات کی راہ ہموار کی، تاہم اس نتیجے تک اس سے محفوظ تر طریقے سے پہنچنا بھی ممکن ہے۔خالق کائنات کے ہر ہر کام میں ہم اس کی جھلک اور نشانی دیکھ سکتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایک نہیں، بلکہ ہزاروں دلائل موجود ہیں۔جب سے سائنسی علوم نے کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھانا شروع کیا ہے ہر علم اپنی مخصوص زبان میں واضح طور پر وجودِ خداوندی کا اعلان کر رہا ہے۔اس موضوع پر بہت سی اہم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ قارئین کو ان کی طرف مراجعت کرنی چاہیے۔

غرض اللہ تعالیٰ ہر چیز کے موجد و خالق ہیں اور ہر چیز عدم سے وجود میں آئی ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ "اللہ" ہیں، اس لیے انہیں کسی نے پیدا نہیں کیا۔ساری مخلوق عاجز و محتاج ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا وجود کسی دوسرے کی احتیاج کے بغیر قائم بذاتہ ہے۔اس کی ذات علی الاطلاق مستغنی ہے۔ہر چیز اس کے سہارے سے قائم ہے۔ ہر ناقابل حل دکھائی دینے والا عقدہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے سے حل ہو جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ خالق و موجد ہیں۔ان کے وجود کو دوام حاصل ہے۔وہ پیدا کرنے والے ہیں۔وہ سب کچھ ہیں۔ وہی ابتدا ہیں وہی انتہا ہیں، لہٰذا ان کے لیے کسی مسبب کو کیسے تلاش کیا جاسکتا ہے؟

ہم دوایک مثالوں سے اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر میرے جسم کو میری ٹانگوں نے اٹھایا ہوا ہے اور میری ٹانگوں کا بوجھ زمین نے اٹھایا ہوا ہے۔زمین

کی صورت میں میری ٹانگوں کا بوجھ اٹھانے والی ایک معقول چیز کا علم ہونے کے بعد دیگر خارجی اسباب تلاش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ایک اور مثال لیجئے، ریل گاڑی کی آخری بوگی کو اس سے آگے والی بوگی کھینچتی ہے اور آگے والی بوگی کو اس سے آگے والی بوگی کھینچتی ہے، یہاں تک کہ یہ سلسلہ ریل گاڑی کے محرک انجن تک جا پہنچتا ہے۔ جب ہم اس محرک تک پہنچتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ یہ محرک اپنے آپ کو بذاتِ خود حرکت دے رہا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اشیاء کی مثالیں ہیں۔ فریب زدہ لوگ کتنے ہی اسباب کیوں نہ تبدیل کرلیں اور ایک سبب سے دوسرے سبب کی طرف منتقل کیوں نہ ہو جائیں، آخر کار وہ ایسے سبب پر پہنچیں گے، جس کے بعد کسی دوسرے سبب کی طرف منتقل ہونا ان کے ممکن نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں ہم ان سے پوچھیں گے کہ اسباب کی انتہا کیا ہے؟ اس سبب کے بعد کون سا سبب ہے؟

ایک اور وجہ سے بھی بعض لوگوں کے افکار میں پراگندگی آتی ہے۔ وہ یہ کہ بنی نوعِ انسان کا محدود فکر ازل کے مفہوم کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ مادے کو ازلیت کے وصف کے ساتھ موصوف کرتے ہیں اور ماضی بعید میں بعض ناقابل فہم اشیاء کے وقوع پذیر ہونے کو ممکن سمجھتے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ازل زمانہ ماضی کی انتہا سے عبارت نہیں، بلکہ اس کی حقیقت "لازمان" ہے۔ اگر زمانے کی مقدار کھربوں سال ہو تب بھی اس کی حیثیت ازل کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، نیز یہ سب جانتے ہیں کہ اسباب کے تسلسل کی بنیاد کی حیثیت رکھنے والے مادے کی مخصوص ابتدا ہے۔ الیکٹرانز کی گردش، نیوکلیس کے طبیعیاتی اسرار، سورج میں وقوع پذیر ہونے، شعاعوں کے اخراجات کا باعث بننے والے پیچیدہ تعاملات اور ساری کائنات میں جاری وساری تھرموڈائنامک کا دوسرا قانون سب کے سب واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ہر چیز کی ایک انتہا ہے اور یہ بات بدیہی طور پر ثابت ہے کہ جس چیز کی انتہا ہوتی ہے، اس کی ابتدا بھی ہوتی ہے۔

لہٰذا وجود کی نعمت سے بہرہ مند ہر چیز خالق کا پتا بتاتی ہے، نیز اس کے وجود کی فنا خالق کے اول و آخر ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ اگر یہ قاعدہ درست ہے کہ جس کی ابتدا ہوتی ہے، اس کی انتہا بھی ہوتی ہے تو یہ قاعدہ بھی لازماً درست ہونا چاہیے کہ جس کی ابتدا نہیں اس کی انتہا بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ مادہ اور اس سے تیار ہونے والی اشیاء آج اگر موجود ہیں تو کل نہ ہوں گی، لیکن کائنات کا فنا کی طرف سست روی سے سفر اور مادے کی بتدریج فنا بعض اوقات بہت سے لوگوں کو دھوکے میں مبتلا کر دیتی ہے، تاہم طویل عرصے کے دوران وسعت پانے والے ان تمام جہانوں کا انجام بالآخر فنا ہی ہے، مزید برآں بعض تحقیقات کے مطابق موجودہ مادہ بلاشبہ تغیر پذیر ہے۔ اسے دوبارہ ریل گاڑی کی مثال سے سمجھئے:

فرض کریں ایک ریل گاڑی ''ازمیر'' شہر سے ''تورکوتلو'' شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ دونوں شہروں کے درمیان مسافت ۵۵ کلومیٹر ہے اور فرض کریں سفر کے آغاز میں ریل گاڑی کی رفتار ۵۵ کلومیٹر فی گھنٹہ تھی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے یہ سفر ایک گھنٹے میں طے کرنا تھا، لیکن آدھے گھنٹے کے بعد جب ساڑھے ستائیس کلومیٹر مسافت باقی رہ گئی، اس کی رفتار نصف ہو گئی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اس مسافت کا نصف آدھے گھنٹے میں طے کرے گی۔ فرض کریں اس ریل گاڑی کی رفتار ہر نصف گھنٹے کے بعد آدھی ہو جاتی ہے۔ بظاہر یوں دکھائی دیتا ہے کہ یہ ریل گاڑی کبھی بھی ''تورکوتلو'' نہیں پہنچ پائے گی۔ اگرچہ وہ کبھی نہ کبھی اس شہر تک ضرور پہنچے گی، لیکن اس کی اس قدر سست رفتاری کی وجہ سے اس کی سواریوں کو یوں لگے گا جیسے وہ کبھی بھی شہر تک نہیں پہنچیں گی۔

اسی طرح مادہ بھی ٹوٹ پھوٹ کی طرف رواں دواں ہے اور ایسا یقیناً ہو گا، خواہ اس میں لاکھوں سال ہی کیوں نہ لگ جائیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ جس کا وجود کسی دوسرے کا محتاج نہیں، کے سوا ہر چیز فانی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہیں اور ہر چیز کے خالق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو مخلوق سمجھنا سادہ پن ہے، جس کا سبب خالق کو مخلوق کی صفات کے ساتھ موصوف کرنااور خالق اور مخلوق کے درمیان تمیز نہ کرنا ہے۔ جن بے دینوں اور منکرین خدا نے یہ شرمناک خیال پیش کیا ہے، ان کا مقصد اپنے آپ کو عقل مند ثابت کرنا ہے، لیکن انہیں معلوم نہیں کہ یہ دعوی کر کے انہوں نے کھلے بندوں عقل و دانش مندی کی تضحیک کی ہے۔ آج کون مادے کی ازلیت کا دعوی اور الوہیت کا انکار کر سکتا ہے؟ ایسا دعوی نہ صرف تعجب خیز، بلکہ جہالت و تعصب کی علامت بن چکا ہے۔

لیکن اشیاء وواقعات کے حقائق تک رسائی نہ پاسکنے والے بعض مادہ پرست لوگ مادے پر آنے والی فنا اور ٹوٹ پھوٹ کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی اس فنا کا ادراک رکھتے ہیں، جو ایٹم کا مقدر ہے۔ وہ ان حقائق کو جان لینے کے باوجود بھی بعض سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے اس قسم کے دعوے کرتے رہیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے اور وہ حقیقت حال سے بخوبی واقف ہے۔

الحاد کو اس قدر فروغ کیوں مل رہا ہے؟

چونکہ الحاد سے مراد انکارِ خدا ہے، اس لیے اس کے فروغ کا روحانی زندگی کی موت و انحطاط کے ساتھ گہرا تعلق ہے، تاہم اس کے پھیلنے کے اس کے سوا اور بھی اسباب ہیں۔ فکری سطح پر الحاد خدا کے وجود کے انکار اور اسے قبول نہ کرنے سے عبارت ہے۔ نظری طور پر یہ مادر پدر آزادی کا نام ہے اور عملی طور پر یہ اباحیت کا علمبردار ہے۔ فکری سطح پر الحاد کے پھیلنے کا سبب نوجوان نسل کی تربیت میں غفلت اور علمی اداروں میں غلط پالیسیوں کی عملداری ہے، علاوہ ازیں اسے بعض دیگر اقدامات سے بھی تیزی اور تقویت ملی ہے، جن کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔

الحاد کو سب سے زیادہ فروغ ایسے معاشرے میں ملتا ہے، جہاں جہالت کی حکمرانی ہوتی ہے اور روحانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ روحانی اور قلبی تربیت سے محروم عوام جلد یا بدیر الحاد کا شکار ہو جاتے ہیں اور عنایت خداوندی کے بغیر اپنے آپ کو الحاد کے چنگل سے نہیں نکال سکتے۔ جب امت مسلمہ بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے افراد کی ایمانی ضروریات پوری کرنے کا خصوصی اہتمام نہیں کرتی اور انہیں جہالت کی تاریکی میں بے یار و مددگار چھوڑ دیتی ہے تو ایسے افراد کسی بھی قسم کے افکار کو قبول کرنے کے لیے بالقوہ تیار ہوتے ہیں۔

شروع شروع میں الحاد کا اظہار ایمان کے بنیادی اصولوں کے بارے میں لاپروائی برتنے اور عدم اہتمام کا اظہار کرنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ آزادیٔ فکر کا لبادہ اوڑھے ہوئے یہ طرزِ عمل جیسے ہی انکارِ خدا اور الحاد کے حق میں کوئی چھوٹی سی نشانی پاتا ہے، الحاد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگرچہ الحاد کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہوتی، لیکن بعض اوقات غفلت، لاپروائی اور غلط اندازہ الحاد کے پیدا ہونے کا باعث بن جاتا ہے۔

دورِ حاضر میں بہت سے لوگ اس قسم کے اسباب کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں، تاہم ہم اس موقع پر ان میں سے صرف اہم اور زیادہ نقصان دہ اسباب کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔ یہ

بات شروع سے ہی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم یہاں الحاد کا قلع قمع کرنے والے دلائل ذکر نہیں کریں گے، نیز یہ واضح بات ہے کہ قاری کو اس مختصر کتاب میں ہم سے ایسے موضوع پر گفتگو کرنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے، جس کی وضاحت کے لیے کئی جلدوں پر مشتمل کتاب درکار ہے۔ کتابوں اور اخبارات کے سوالات وجوابات کے کارنرز اس قسم کے پیچیدہ اور گہرائی کے حامل موضوع کا احاطہ اور حق ادا کرنے کے لیے ناکافی ہیں، نیز اس موضوع پر متعدد گرانقدر اور منفرد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ آئندہ سطور میں ہماری گفتگو ایسی ہی کتابوں کا نچوڑ ہوگی۔

دست قدرت الٰہیہ سے ظہور میں آنے والے واقعات میں سے ہر ایک خدائی پیغام ہے۔ ان واقعات کو قوانین فطرت بھی کہا جاسکتا ہے۔ ایسے قوانین نوجوان نسلوں کو گمراہ کرنے اور ان کے دلوں میں الحاد کا بیج بونے کا اہم ذریعہ بن چکے ہیں۔ اگرچہ مشرق ومغرب میں تحریر کی جانے والی ہزاروں کتابوں میں یہ بات لکھی جاچکی ہے کہ ان قوانین فطرت کی حیثیت محض یکسانیت اور عرق ریزی سے کام کرنے اور بہت بڑے پیمانے پر پیداوار دینے والے کارخانے کی سی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ان میں یہ پیداواری صلاحیت اور نظم ونسق کہاں سے آیا؟ کیا شاعری اور موسیقی کے نغمات کی طرح دلوں کو اپنے سحر میں گرفتار کرلینے والی یہ حسین فطرت بے ہنگم اتفاقات کا نتیجہ ہوسکتی ہے؟

اگر جیسا کہ اُن کا دعوی ہے فطرت پیدا کرنے اور تخلیق کی صلاحیت کی مالک ہے تو کیا اس بات کی وضاحت پیش کی جاسکتی ہے کہ فطرت نے یہ صلاحیت کیسے حاصل کی؟ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ فطرت نے اپنے آپ کو پیدا کیا ہے؟ ایسے مغالطے کی تصدیق ممکن نہیں۔ اس خلاف حقیقت دعوے کا حقیقی چہرہ یہ ہے "درخت نے درخت کو، پہاڑ نے پہاڑ کو اور آسمان نے آسمان کو پیدا کیا۔" میں نہیں سمجھتا کہ کوئی ایک شخص بھی اس قدر نامعقول مغالطے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہوگا۔

اگر ان لوگوں کا مقصد "فطرت" سے "قوانین فطرت" کی طرف اشارہ کرنا ہے تو یہ ایک دوسرا فریب ہے، کیونکہ قدماء کی اصطلاح میں قانون ایک عرض ہے، جو اپنے وجود کے لیے کسی جوہر کا محتاج ہوتا ہے، یعنی جب تک کسی مرکب یا مشین کو تشکیل دینے والے تمام اعضاء اور

ٹکڑوں کا تصور نہ کیا جائے اس وقت تک اس مشین سے متعلق قانون کے مفہوم کا تصور ممکن نہیں۔ دوسرے لفظوں میں قوانین کا وجود موجودات پر منحصر ہوتا ہے۔ قانونِ نمو کا ظہور بیج میں اور قانونِ جاذبیت کا ظہور بلاک اور مکان میں ہوتا ہے، لہٰذا موجودات کے تصور سے پہلے قوانین کا تصور کرنا اور ان قوانین کو وجود کا سبب سمجھنا سوائے فریب کے کچھ نہیں۔

اسباب کو وجود کی اساس سمجھنا بھی کچھ کم گمراہ کن دھوکا نہیں ہے۔ ہزاروں حکمتوں اور پیچیدہ نظاموں پر مشتمل اس جہاں کی توجیہہ اسباب سے کرنے کی کاوش کسی بھی قسم کی علمی قدر و قیمت سے عاری مضحکہ خیز کاوش ہے، بلکہ علمی حقائق کے منافی ہونے کی وجہ سے تضادات کا شاہکار اور بے سروپا بات ہے۔

ملر کے تجربات کے اسباب و اتفاقات کے عجز و کوتاہی کو طشت ازبام کرنے کے بعد مختلف علوم نے اس موضوع پر بحث کی ہے، چنانچہ سویت یونین میں "ادارۂ کیمیا" نے "اوپرین" کی سربراہی میں بائیس سال کی تحقیق کے بعد اعلان کیا ہے کہ کیمیا کے قوانین اور کیمیائی تعاملات وجود کی حقیقت پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں۔ یہ سائنس اور سائنسدانوں کی گواہی ہے۔

جو نظریہ ارتقا سالہا سال تک ہمارے اسکولوں میں ایک ثابت شدہ علمی حقیقت کے طور پر پڑھایا جاتا رہا ہے، جدید سائنسی اکتشافات اور علم جینیات کی ترقی کے بعد محض ایک علمی خیال اور قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ آج اس کی کوئی علمی قدر و قیمت باقی نہیں رہی، لیکن یہ بات انتہائی تکلیف دہ ہے کہ اس قسم کی بے سروپا باتیں آج بھی فکری لحاظ سے ہوا میں معلق اور مضبوط ثقافتی پس منظر سے محروم ہماری نوجوان نسل کو الحاد کی طرف لے جانے کا باعث بنی ہوئی ہیں۔

لیکن دوسری طرف خوش قسمتی سے مارکیٹ میں بعض ایسی کتابیں آچکی ہیں، جو ہمارے فکر و احساس کو مجروح کرنے والے اس قسم کے سوالات کا جواب دے کر ہماری روحانی بیماریوں کا علاج کرتی ہیں۔ آج مشرق و مغرب میں مختلف زبانوں میں فطرت اور اسباب کے حقیقی چہرے سے پردہ اٹھانے والی سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

جہاں ہمیں اپنے ہاں بعض مغرب زدہ لوگوں کی لکھی ہوئی گمراہ کن کتابوں پر تعجب ہوتا ہے، وہیں یہ بات باعث اطمینان بھی ہے کہ مغرب میں "ہم خدا پر ایمان کیوں رکھتے ہیں؟" جس کی تصنیف میں متعدد مغربی سائنسدانوں نے حصہ لیا ہے، ایسی متعدد کتابیں لکھی جاچکی ہیں جو اِن مغرب زدہ لوگوں کے اعتراضات کا جواب فراہم کرتی ہیں۔

علمی حلقوں میں اس موضوع پر اس قدر وضاحت کے پائے جانے کے بعد اب الحاد کو محض نفسیاتی بگاڑ، ہٹ دھرمی، بغیر دلائل کے تسلیم کیا جانے والا فکر اور بچگانہ خیال سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارے بعض نوجوان زمانے بھر سے مسترد شدہ بعض افکار کے منفی اثرات سے پوری طرح محفوظ نہیں ہیں، بلکہ انہیں علمی حقائق سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے صحیح علمی اور روحانی تربیت نہیں پائی۔

یہی وجہ ہے کہ صحیح علوم کی اشاعت کے لیے علمی اور تربیتی تیاری وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس مقدس فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی معاشرے کے لیے ناقابل تلافی نقصان کا باعث بنے گی۔ شاید سالہاسال سے معاشرہ جن مصائب کا شکار ہے، ان کی بنیادی وجہ یہی غفلت و کوتاہی ہے، کیونکہ ہم تعلیم کے عشق سے سرشار، علم وروح اور دل و دماغ کے جامع اور دونوں اعتبار سے ممتاز مرشدوں سے محروم ہیں۔ ہم حقیقی مرشدوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس اہم ترین بنیادی انسانی فریضے کی ادائیگی کی ذمہ داری اٹھائیں گے اور ہمیں ان مصائب سے نجات دلائیں گے، جن میں ہم ایک زمانے سے مبتلا ہیں، تب جدید نسل کے افکار وخیالات اور احساسات میں ٹھہراؤ پیدا ہوگا، وہ غلط افکار کے سیلاب میں بہنے اور تذبذب کا شکار ہونے سے محفوظ رہے گی اور الحاد کے خلاف اس کے ہاتھ میں ہتھیار آئے گا۔

حاصل یہ کہ فکری الحاد جہالت، تجزیہ و تحلیل کی صلاحیت سے محرومی اور روحانی و قلبی تربیت کے فقدان کا نتیجہ ہے، کیونکہ انسان جس چیز سے آشنا ہوتا ہے اس سے محبت کرتا ہے اور جس چیز سے ناواقف ہوتا ہے اس سے عداوت رکھتا ہے۔

اب ہمیں کتب خانوں کی الماریوں میں رکھی کتابوں پر ایک نظر ڈالنی چاہیے اوران افکار و شخصیات کا جائزہ لیناچاہیے، جنہیں یہ کتابیں پیش کرتی ہیں، تب ہمیں پتا چلے گا کہ گلیوں میں پھرتے بچے اپنے لباس میں ''ریڈانڈینز''اور''زورو(Zorro)'' سے اور نوجوان ''ڈان جان'' (Don Juon) سے کیوں مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ جس حقیقت کی ہم وضاحت کرناچاہتے ہیں یہ اس کی صرف دوایک مثالیں ہیں۔اگر ہم اپنے معاشرے کومعاشرتی اوراقتصادی لحاظ سے تباہ کرنے والے دیگر عناصر کا جائزہ لیں توصورتحال کی ہولناکی سے ساراجسم کانپ اٹھتاہے۔ ہمارے ہم وطن ایک عرصے سے ان لوگوں کے پیچھے چل رہے ہیں، جن سے انہیں محبت ہے اور جنہیں ان کے سامنے آئیڈیل کی حیثیت سے پیش کیاگیاہے، لیکن جنہیں وہ نہیں جانتے ان سے نہ صرف وہ نامانوس ہیں، بلکہ وہ ان کے بارے میں معاندانہ جذبات رکھتے ہیں۔ آج ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم ان امورکے بارے میں سوچیں ،جنہیں ہمیں ان کے سامنے پیش کرناچاہیے۔ہماری یہ بھی ذمہ داری ہے کہ ہم انہیں فارغ اور بے مہار نہ چھوڑیں، بلکہ ان کی روشنی کے راستے کی طرف راہنمائی کریں۔

نوجوان نسل کے الحاد کی طرف مائل ہونے اورانکارِ خداکے فروغ پانے کادوسرا سبب نوجوانوں کی فطرت ہے۔(7) ان نوجوانوں کی لامتناہی خواہشات مادر پدرآزادی چاہتی ہیں۔ اس قسم کے غیر معتدل رجحانات الحادسے بہت قریب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ کہتے ہیں:''ہم معمولی سی فوری لذت کی خاطر مستقبل میں آنے والی بہت سی تکالیف کوبرداشت کرنے کے لیے تیارہیں۔''اس طرح وہ اپنے لیے دردناک انجام کاسامان فراہم کرتے ہیں اور شیطان کی پیش کردہ موہومہ لذات سے دھوکا کھاکرالحاد کے جال میں ایسے پھنستے ہیں ،جیسے آگ کے گرد گردش کرتے پتنگے اس میں جاگرتے ہیں۔

جس قدر جہالت اورروحانی و قلبی انحطاط بڑھتاہے، اسی قدر جسمانی لذتیں آسانی سے روحانی جذبات پر قابو پالیتی ہیں اور جس طرح ڈاکٹر ''فوسٹس (Dr Faustus) '' نے اپنی روح شیطان کے سپرد کر دی تھی، اسی طرح نوجوان اپنے دل شیطان کو دے بیٹھتے ہیں۔ جب روح مردہ، دل تہی دامن اور عقل پراگندہ ہو جاتی ہے توالحاد کی راہ ہموار ہو جاتی ہے، جبکہ دوسری

طرف عقیدہ، احساسِ ذمہ داری اور تہذیب و تربیت سے آراستہ دل و جان نوجوانوں کی بیداری کی ضمانت فراہم کرتے ہیں، بصورتِ دیگر جس معاشرے میں شیطان کو دلوں پر کنٹرول حاصل ہو جائے، وہ معاشرہ ایک بے بنیاد بات سے دوسری بے بنیاد بات کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے، اپنے ہی منبر و محراب کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے، ہر نئے فلسفے کو نجات دہندہ سمجھ کر اس کے پیچھے چل پڑتا ہے اور اس سے فکری غذا حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو اس کی آغوش میں ڈال دیتا ہے۔ جب وہ صبح بیدار ہوتا ہے تو بدامنی اور افراتفری پھیلا دیتا ہے، دوپہر کے وقت سوشلزم کے سامنے مؤدبانہ کھڑا ہو جاتا ہے، شام ڈھلے ''فلسفہ وجودیت'' کا احیا کرتا ہے اور رات کو ہٹلر کے گن گاتا ہے، لیکن اسے اپنی روح کے سوتوں، اپنی قوم کے برگ و بار، تہذیب و ثقافت اور روح کی طرف دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔

جس نسل کا فکری بگاڑ اس حد تک پہنچ چکا ہو، اس کے لیے خواہشات و لذات کے چنگل سے آزاد ہونا مشکل ہوتا ہے اور اس کے ذہن اور فکر کو صحیح رخ پر ڈالنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے، لہٰذا نئی نسل میں درست انداز سے سوچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے آج تک ہماری بقا اور معاشرے کے لیے بنیادی حیثیت رکھنے والے افکار کی اصطلاحات کو منظم انداز میں اس تک پہنچانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، بصورت دیگر ہم جسمانی لذتوں میں ڈوبے رہیں گے اور ہماری حالت وہی ہوگی، جو شاعر محمد عاکف نے بیان کی ہے:

''اگر وہ یہ کہیں کہ معاشرہ مردہ جذبات کے ساتھ اپنے وجود کو برقرار رکھ سکتا ہے تو ان کی تصدیق نہ کرنا۔ مجھے کوئی ایک ایسا معاشرہ تو دکھاؤ جو مردہ جذبات کے ساتھ قائم رہ سکا ہو۔''

الحاد کے فروغ کا ایک اور سبب اباحی فکر ہے، جس میں ہر چیز کو مباح اور قابل استفادہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ فکر موقع و لذت پرستی پر مبنی ہے۔ آج اس فکر کو ایک منظم فکری اور فلسفیانہ قالب میں ڈھالنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ہمارے ہاں یہ فکر سب سے پہلے فرائیڈ کے ''نظریہ لبیڈو (Libido) '' کا لبادہ اوڑھ کر آئی اور مسلمانوں کی شرم و حیا کے مفہوم کو بگاڑ دیا۔ اس کے بعد جان پال سارترا اور البیح کامو (Albert Camus) کامٹ کے وجودی فلسفے نے ہمارے ہاں زور پکڑا اور شرم و حیا کی عمارت کو مسمار کر کے رہے سہے اثرات کو بھی مٹا دیا۔

انسانیت کے لیے باعث ننگ و عار اس فلسفے میں انسانیت کی حیثیت ردی کی سی ہے، لیکن اس کے باوجود اسے انسان کا حقیقی رُخ ظاہر کرنے والے فلسفے کی حیثیت سے نئی نسل کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ یورپ اور اس کی تقلید کرنے والے ممالک کے نوجوان اس فلسفے کی طرف ایسے دوڑے جیسے انہیں ہپناٹائیزڈ (Hypnotized) کر دیا گیا ہو۔ انسانیت یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ اشتراکی فلسفے کے نتیجے میں فرد کی جو قدر و منزلت کم ہوئی ہے، وجودی فلسفہ اسے اس کی کھوئی ہوئی قدر و منزلت واپس دلائے گا، جس کے نتیجے میں انسانیت کا درخت از سر نو پھلنے پھولنے لگے گا، لیکن ہائے افسوس! انسانیت نہ جان سکی کہ وہ ایک بار پھر دھوکے کا شکار ہو گئی ہے۔

چونکہ ایمان باللہ اور حلال و حرام کے مفاہیم اس قدر بگڑی ہوئی نسل کے لذت پرستانہ فلسفے کے ساتھ میل نہیں کھاتے، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حشاشین کے سربراہ حسن الصباح کی پرفریب جنت میں رہنے کی خواہش مند یہ نسل اپنے آپ کو الحاد کی آغوش میں دے دیتی ہے۔ ہم نے یہ بعض ملاحظات مستقبل کے صاحب بصیرت منتظمین، مرشدین اور اساتذہ کے غور و فکر کے لیے ذکر کیے ہیں، تاکہ وہ الحاد کے سیلاب پر بند باندھ سکیں، تاہم ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ بے راہ روی اور گمراہی کے صرف یہی اسباب ہیں، نیز الحاد کی روک تھام کے لیے اختیار کی جانے والی تدابیر بھی ان میں محصور نہیں۔ ہماری آرزو ہے کہ امت مسلمہ دور حاضر میں خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر رشد و ہدایت کی طرف لوٹ آئے۔

جب تمام انبیائے کرام کا تعلق جزیرہ عرب سے تھا تو دوسرے علاقوں کے بسنے والے عقیدہ و عمل کے بارے میں کیسے جوابدہ ہو سکتے ہیں؟

اس سوال کے دو حصے ہیں:

اول : انبیائے کرام کا صرف جزیرۃ العرب سے تعلق ہونا اور دیگر علاقوں اور براعظموں میں ان کا ظہور نہ ہونا۔

دوم : جن قوموں کی طرف انبیائے کرام کی بعثت نہیں ہوئی، انہیں عذاب دینا قرین انصاف نہ ہونا۔

ہم ان دونوں حصوں پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کریں گے، لیکن اصل بحث کا آغاز کرنے سے پہلے معاشرے میں انبیائے کرام کے مقام و مرتبے پر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نبوت بہت بلند مقام ہے۔ یہ حق تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کے ساتھ رابطے کا ایک ذریعہ اور اس دنیا میں اِس جہاں سے ماورا رہنے والوں کی زبان و دل ہے۔ اس میں عظمت، انتخاب اور پیغام بھیجنے اور مکلف بنانے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ نبی صرف عبقری صلاحیتوں کا ہی مالک نہیں ہوتا، جن کے ذریعے وہ واقعات کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے، بلکہ ایسی ہستی ہوتی ہے، جس کی تمام صلاحیتیں اور قابلیتیں انتہائی متحرک، پرنشاط اور فعال ہوتی ہیں اور وہ اس دوران عظمت کے نئے آفاق رقم کرتے ہوئے رحمت خداوندی کی بادِ صبا کو قبول کرنے کے لیے ہر لحظہ تیار رہتی ہے۔

نبی کا جسم روح کے تابع اور اس کی عقل دل کے زیر نگیں ہوتی ہے۔ اس کی نگاہیں ہمیشہ اسماء و صفات الٰہیہ کے عالم کی طرف اٹھی رہتی ہیں۔ جہاں اس کی نگاہیں پہنچتی ہیں، وہاں اس کے قدم پہنچ جاتے ہیں، دوسرے لفظوں میں وہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ نبی کے تمام کے تمام احساسات مکمل طور پر بیدار رہتے ہیں۔ نبی کے دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی صلاحیتیں نہ صرف عام انسانوں سے زیادہ، بلکہ فطرت کی حدود سے متجاوز ہوتی ہیں۔ تجزیہ و تحلیل کرنے کی اپنی محدود

صلاحیتوں میں رہتے ہوئے ہمارے لیے ان کے ماوراء الفطرت علوم کے آفاق تک پہنچنا، بلکہ ان کے قریب تک رسائی حاصل کرنا بھی ممکن نہیں۔

انسانیت انبیائے کرام کی مدد سے اشیاء کی حقیقتوں کا انکشاف کر سکتی ہے۔ ان کی ہدایات و تعلیمات کے بغیر اشیاء وواقعات کی حقیقت تک رسائی ممکن ہے اور نہ ہی درست انداز سے فطرت میں دخل اندازی ہو سکتی ہے۔

ان کی اولین ذمہ داری اور پہلا سبق ہی انسانیت کو خدائی قوانین اور فطرت کے اسرار ورموز کی تعلیم دینا تھی۔ یہ سبق ابتدائی انسانوں کے لیے خاص تھا۔ اس کے بعد انبیائے کرام نے اس عظیم خالق کے اسماء وصفات کی وضاحت کی، جس پر ساری کائنات اور ہستی گواہ ہے، نیز انہوں نے ہر قسم کے ادراک سے ماوراخالق کی معرفت کے لیے درست معیارات بتائے۔ وہ خالق ایسا ہے، جس کے دست قدرت میں ذرے سے لے کر کہکشاں تک کے سارے جہاں ہیں۔ ان پر اس کا حکم چلتا ہے اور وہ جیسے چاہتا ہے تسبیح کے دانوں کی طرح انہیں ایک کیفیت سے دوسری کیفیت اور ایک شکل سے دوسرے شکل کی طرف پھیرتا ہے۔ اگر اس مقدس وبلند ذات کی صفات کے بارے میں انبیائے کرام کی واضح تعلیمات نہ ہوتیں، تو اس کے بارے میں کوئی صحیح رائے قائم نہ کی جا سکتی۔

اس سے پتا چلا کہ اشیاء وواقعات کی حقیقت اور تہہ تک پہنچنے اور انسانیت کو مکمل ضابطہ حیات فراہم کرنے کے علاوہ انبیائے کرام کی ایک اہم ذمہ داری لامتناہی قدرت کی حامل ذات کے اسماء وصفات کی وضاحت کرنا اور حق تعالیٰ کے ساتھ ان اسماء وصفات کے تعلق پر روشنی ڈالنا بھی ہے۔

لہٰذا کسی بھی زمان و مکان کے انبیائے کرام کے انوارات کے فیض سے محروم رہنے کا احتمال نہیں ہو سکتا، خصوصاً جبکہ انسانیت ان کی تعلیمات کے بغیر کائنات کے بارے میں واضح اور صاف نظریات قائم کر سکی اور نہ ہی اس کے بارے میں فلسفیانہ شکوک وشبہات اور تضاد بیانیوں سے باہر نکل سکی، لہٰذا عقل، حکمت اور قرآن اس بات پر متفق ہیں کہ ہر قوم، براعظم اور دور کسی

نہ کسی نبی کی تعلیمات وہدایات سے بہرہ مند رہے ہیں۔اس کے برعکس کسی اوراحتمال کی قطعاً گنجائش نہیں۔

جب عام مشاہدہ ہے کہ چھوٹے سے عجائب گھر یا معمولی سی نمائش گاہ میں بھی تعارف کرانے والے ماہرین اور راہنماؤں کی ضرورت ہوتی ہے اوران کے بغیر عجائب گھر اور نمائش گاہیں اپنی افادیت اور مقصد کھو بیٹھتی ہیں تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ زائرین اس کائنات کے عظیم الشان محل کو اس کی خصوصیات اور رازوں سے آگاہ کرنے والے راہنماؤں اور مرشدوں کے بغیر دیکھنے کے لیے آئیں۔

کیااس نظام وکائنات کے قادرمطلق خالق،کائنات کو خدائی شاہکار کی بہترین صورتوں کی نمائش گاہ کے طور پر پیش کرنے والے اور اپنے آثار و تخلیقات کے ذریعے دیکھنے والوں کو اپنی ذات کا تعارف کرانے والے خدا کے بارے میں یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ اس نے ان تمام آثار اور نمائشوں کو پیش کرنے کے بعد شوق واشتیاق سے انہیں دیکھنے کے لئے آنے والوں کو اپنی ذات وصفات سے آشنا کرانے کے لیے خصوصی افراد کا انتخاب نہ کیا ہو گا۔اگر ایسا ہوتا تو نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے تمام پر حکمت کاموں کا بے مقصد ہونااوراس کے تمام حکیمانہ اقدامات کا قابل اعتراض ہونالازم آتا، حالانکہ کائنات کی ہر چیز یک زبان ہو کر اعلان کر رہی ہے کہ قادرمطلق کا ہر کام حکمت پر مبنی ہے اور وہ بے مقصد کام کرنے سے پاک ہے۔

مزید بر آں اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ہر امت میں انبیائے کرام کے مبعوث ہونے کی خبر بھی دیتے ہیں۔ارشاد خداوندی ہے:﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾(النحل:۳۶)"اور ہم نے ہر امت میں کوئی پیغمبر بھیجا کہ اللہ ہی کی عبادت کرو اور بتوں کی پرستش سے اجتناب کرو۔"لیکن انسانیت نے ان عظیم ہستیوں کے پڑھائے ہوئے سبق کو جلد ہی فراموش کر دیا، بلکہ انہی انبیائے کرام کو تقدس و الوہیت کا مقام دے کر صراط مستقیم سے انحراف اختیار کر لیااور دوبارہ بت پرستی میں مبتلا ہو گئی۔یونان کے کوہ اولمپس سے لے کر ہندوستان کے دریائے گنگا تک انسانی ذہن کے تخلیق کردہ سینکڑوں بت ملتے

ہیں۔ ان مذاہب کے موجودہ خد و خال اپنی ابتدائی شکل و صورت سے بہت مختلف ہیں، لہٰذا چین کے کنفیوشس اور ہندوستان کے برہما و مہاتما بدھ کو ان کے ظہور پذیر ہونے کے معروف حالات و اسباب کے تناظر میں دیکھنا درست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ زمانہ ہر چیز کو بوسیدہ کر دیتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی آراء و اقدار تبدیل ہوتی رہتی ہیں، لہٰذا اس کا درست اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں کہ ان حضرات کی طرف منسوب موقف ان کے ابتدائی اصل موقف سے کس قدر مختلف ہے۔ اگر قرآن کریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں ہمیں غیر مبہم انداز میں آگاہ نہ کرتا تو ہمارے لیے کنیسہ کی چاردیواری میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مورتیوں کے گرد بت پرستانہ رسوم ادا کرنے والے پادریوں کے خیالات و افکار کی روشنی میں آپ علیہ السلام کی شخصیت کی حقیقت سے آگاہی ممکن نہ ہوتی، کیونکہ انسان کو خدا کا مقام دینا اور خدا کو انسان کے مقام تک گرانا، تین کو ایک اور ایک کو تین قرار دینے کے واضح عقلی تضاد کا شکار ہونا، عقیدے کو مسخ کرنا اور عقل و دانش کا مذاق اڑانا اللہ تعالیٰ کے حق میں سب سے بڑی گستاخی اور توہین ہے۔

آج اس بات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ مسیحی عبادت خانوں میں تحریف شدہ دینی شعائر شکل و صورت کے لحاظ سے یونانی اور رومی بت پرستی سے زیادہ مختلف نہیں۔ اگر قرآنی وضاحتیں اور ہدایات نہ ہوتیں تو کنیسہ اور اس میں ہونے والی رسوم وعبادات کو دیکھ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ''اپالو'' کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہوتا۔

لہٰذا جب زمانی لحاظ سے ہم سے قریب تر ہونے کے باوجود مسیحیت کی کتاب اور نبی کے بارے میں اس قدر تحریف ہوئی ہے تو اس سے بھی پہلے ادوار میں نہ جانے کتنے مسیح گزرے ہوں گے اور تحریف و تبدیل کا نشانہ بنے ہوں گے۔ اس سلسلے میں نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ہر نبی کے حواری اپنے نبی کی رحلت کے بعد اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے، لیکن ان کے بعد آنے والوں نے ہر چیز کو بدل ڈالا۔ آج باطل دکھائی دینے والے نہ جانے کتنے مذاہب آغاز میں وحی کے چشمہ صافی سے پھوٹے ہوں گے، لیکن اپنے پیروکاروں کی جہالت اور

دشمنوں کی ظالمانہ عداوت کے نتیجے میں بالآخر مکمل طور پر اوہام و خرافات کا مجموعہ بن گئے۔ لہٰذا آج باطل مظاہر کے حامل اکثر مذاہب عام طور پر ماضیٰ میں صحیح اور مضبوط بنیادوں پر قائم تھے اور یوں لگتا ہے کہ ہر دور میں کسی نہ کسی نبی کی تعلیمات کے اثرات باقی رہے ہوں گے۔

جیسے کسی نبی کی نبوت کا انکار کرنا کفر ہے، ایسے ہی غیر نبی کو نبی کہنا بھی کفر ہے۔ بدھ مت کا ہندومت سے ظہور پذیر ہونا یا زیادہ محتاط الفاظ میں اس کا اس سے قریب تر ہونا بجا طور پر محل نظر ہے، اسی طرح کنفیوشں ازم کے بانجھ اور تنگ نظر فلسفے کے پیچھے موجود فکر کی تحقیق کرنا بھی ضروری ہے، میری رائے میں "شامانیہ"(8) کو بھی بکثرت تاویلات کا شکار ہونے کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔

خواہ ان مذاہب کے اصل سرچشمے اور مآخذ صاف ستھرے ہوں یا ان میں کچھ گدلاہٹ آگئی ہو، اتنی بات یقینی ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت سے مختلف تھے۔ وہ یا تو امتدادِ زمان کا شکار ہو گئے یا نئے نئے اضافوں کے نتیجے میں ان کی ابتدائی حالت میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔

اگر بفرض المحال ان مذاہب کے بانیان زندہ ہو کر لوٹ آئیں تو وہ اِنہیں اپنے مذاہب سے بالکل مختلف چیز سمجھیں گے۔ دنیا کے بہت سے مذاہب تحریف و تبدیلی کا نشانہ بن چکے ہیں، جن میں سے ایک بڑی تعداد کا اصل ماخذ صحیح تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِن أُمَّةٍ إِلَّا خلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (فاطر: ۲۴) "اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی خبر دار کرنے والا نہ گزرا ہو۔" یہ حکم عالمی اور عمومی ہے، لیکن ہمیں ساری دنیا میں آنے والے انبیائے کرام جن کی تعداد بعض روایات کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، کا علم نہیں۔ ہم ان میں سے صرف اٹھائیس انبیائے کرام کو جانتے ہیں اور ان کے بھی زمان و مکان کے بارے میں مکمل معلومات نہیں رکھتے، تاہم ہم دنیا میں مبعوث ہونے والے تمام انبیائے کرام کے بارے میں جاننے کے مکلف نہیں ہیں۔ جن انبیائے کرام کا قرآن کریم میں تعارف نہیں کرایا گیا ان کے بارے میں مسلمانوں کی عدم واقفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلاً

مَن قَبلِکَ مِنهُم مَّن قَصَصنَا عَلَیکَ وَمِنهُم مَّن لَّم نَقصُص عَلَیکَ﴾ (غافر:۷۸) ”اور ہم نے تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تم سے بیان کر دیئے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات بیان نہیں کئے۔“ لیکن علم تاریخ ،ادیان، فلسفہ اور انتھراپولوجی سے ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر واقع انسانی معاشروں کے عقائد میں بہت سے مشترکہ نقاط کی نشاندہی ہوتی ہے، مثلاً تمام معاشروں میں کثرت سے وحدت کی طرف سفر پایا جاتا ہے، غیر معمولی طور پر بڑی مصیبت کے وقت ہر چیز سے رخ موڑ کر ایک ہی ذات عالیہ سے امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں اور اس کے سامنے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں، دوسرے لفظوں میں ماورائے طبیعت ہستی سے متعلق طرز عمل اور کردار کے مظاہر میں مشابہت پائی جاتی ہے، جس سے سرچشمے اور معلم کی وحدت کی طرف اشارہ ملتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جزائر کناری (Canary Islands) سے لے کر ملائیشیا کے اصلی باشندوں اور ریڈ انڈینز سے لے کر قبائل ”ماوماو“ تک ایک جیسے دینی شعائر، مذہبی رنگ، انداز اور نغمات ملتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود مصطفی نے دو قدیم وحشی قبائل کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ ڈاکٹر محمود لکھتے ہیں کہ قبیلہ ماوماو ”موجای“ نامی خدا پر ایمان رکھتا ہے۔ یہ خدا اپنی ذات اور افعال میں یکتا ہے۔ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ ہی اس سے کوئی پیدا ہوا ہے، کوئی چیز اس سے مشابہت رکھتی ہے اور نہ ہی اس کی ہمسر ہے۔ اسے آنکھیں دیکھ سکتی ہیں اور نہ ہی ذہن اس کا احاطہ کر سکتے ہیں، تاہم اس کے آثار سے اسے پہچانا جا سکتا ہے۔ قبیلہ ”نیام نیام“ سے بھی قبیلہ ”ماوماو“ جیسی باتیں منقول ہیں۔ وہ ایک ایسے معبود پر ایمان رکھتے ہیں جو ہر چیز پر حکومت کرتا ہے، جنگل میں موجود ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت دینے اور چلانے پر قدرت رکھتا ہے اور شرپسندوں پر بجلی کے شعلے پھینکتا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ ”معبود حقیقی“ پر ایمان رکھتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا سے متعلق ان لوگوں کا عقیدہ قرآنی عقیدے سے بہت مشابہت رکھتا ہے، بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ قبیلہ ”ماوماو“ تقریباً سورۃ الاخلاص کے مضمون کا اظہار

کرتا ہے۔ تمدن سے دور اور معروف انبیائے کرام کے حلقہ اثر سے باہر رہنے والی یہ قدیم ترین اقوام ایسے وقت میں کیسے خدا سے متعلق اتنے عمیق اور صحیح عقیدے تک پہنچ گئیں جب وہ زندگی کے سادہ ترین قوانین سے بھی نا آشنا تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت مبارکہ ﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (یونس:۴۷) "اور ہر امت کی طرف پیغمبر بھیجا گیا پھر جب ان کا پیغمبر آجاتا ہے تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔" ایک عالمی اور عمومی حقیقت کی عکاسی کرتی ہے اور کوئی خطۂ ارض اس کی حدود سے خارج نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمود مصطفی کی گفتگو سے ملتی جلتی گفتگو میں نے عراق کے شہر کرکوک میں ریاضیات کے پروفیسر عادل زینل سے سنی۔ عادل زینل سے میں ۱۹۶۸ء سے واقف ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں اعلیٰ تعلیم کی غرض سے قیام کے دوران میں امریکا کے اصل باشندوں ریڈ انڈینز سے بکثرت ملتا اور ان کی بہت سی باتوں پر مجھے سخت تعجب ہوتا۔ امریکا کے اصل باشندے عقیدہ توحید سے ہم آہنگ مختلف دینی شعائر کی پابندی کرتے تھے۔ وہ زمانے سے ماورا ایک ایسے خدا پر ایمان رکھتے تھے، جو کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے۔ وہ بکثرت کہتے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اس خدا کی مشیت و ارادے سے ہو رہا ہے۔ وہ خدا کی بہت سی سلبی اور وجودی صفات(9) کا تذکرہ کرتے تھے۔ اس قدر بلند افکار ان کی سادہ اور غیر متمدن زندگی سے میل نہیں کھاتے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرق و مغرب اور دنیا کے دور دراز علاقوں میں رائج عقیدے کی توجیہہ صرف ان رسولوں کے ذریعے کرنا ہی ممکن ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے شہروں اور علاقوں کی طرف بھیجا تھا، کیونکہ بڑے بڑے فلسفیوں کے حیطۂ ادراک سے خارج اس قدر متوازن عقیدہ توحید کو ماوماو، نیام نیام اور مایا قبائل ایسے غیر متمدن لوگوں کے فکر کا نتیجہ قرار دینا ممکن نہیں، لہٰذا ثابت ہوا کہ جس انتہائی مہربان ذات نے شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں کو سربراہ سے محروم نہیں رکھا اس نے انسانیت کو انبیائے کرام کے بغیر نہیں چھوڑا، بلکہ تمام روئے زمین میں روشنی پھیلانے کے لیے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا۔

اب ہم سوال کے دوسرے حصے ''کیا جس شخص نے کسی نبی کو نہیں پایا اسے عذاب دیا جائے گا؟'' کی طرف آتے ہیں۔

سوال کے پہلے حصے کے جواب میں ہم نے دیکھا کہ زمین کا کوئی خطہ بھی نبوت کی روشنی سے محروم نہیں رہا۔ اگرچہ خشک سالی کے عارضی ادوار بھی گزرے ہیں، لیکن جلد ہی رحمت خداوندی موسلا دھار بارش کی مانند برسنے لگی، اس لیے ہر شخص نے کسی نہ کسی درجے میں اس رحمت کو سنا، دیکھا، چکھا یا اس سے سیر ہوا، تاہم جن علاقوں میں تحریف کا عمل جلد شروع ہوا ان میں زمانہ فترت(10) کی پہنچتی ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولاً﴾ (الاسراء:۱۵) ''اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔'' اس سے ثابت ہوا کہ سب سے پہلے قوموں کو عذاب سے ڈرایا جاتا پھر انہیں احکام کا مکلف بنایا جاتا اور اس کے بعد ان کے ساتھ عذاب یا رحمت کا معاملہ کیا جاتا تھا۔

یہ درست ہے کہ اس مسئلے کی تفصیلات میں علمائے اسلام کی آراء مختلف ہیں۔ امام ماتریدی اور ان کے پیروکاروں کے نزدیک وجودِ خداوندی سے ناآشنا شخص کا کوئی عذر قابل قبول نہیں، خصوصاً جبکہ کائنات میں موجود ہزاروں دلائل و براہین اس کے وجود پر دلالت کرتے ہیں، لیکن اشاعرہ کے نزدیک آیت مبارکہ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولاً﴾ (الاسراء: ۱۵) ''اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔'' کا مطلب یہ ہے کہ عذاب کا استحقاق صرف تبلیغ کی ادائیگی کی صورت میں ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے ان دونوں آراء میں تطبیق دیتے ہوئے کہا ہے کہ جس شخص نے کسی نبی کو نہیں پایا، لیکن اس نے کسی بت کی پرستش کی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کیا وہ نجات پائے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ فکری لحاظ سے تجزیہ و تحلیل کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں اور حوادث و واقعات سے نتائج اخذ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، لہٰذا پہلے ایسے لوگوں کی راہنمائی کرنا ضروری ہوتا ہے اور اس کے بعد ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ کون سزا کا مستحق ہے اور کون انعام کا سزاوار، لیکن اگر کوئی شخص کفر کو پیشہ اور طرز عمل بنالے، اس کے حق میں دلائل دے اور خدا کی خلاف اعلانِ جنگ کرے تو اسے اپنے کفر و الحاد کی سزا مل کر رہے گی، خواہ وہ زمین کے کسی بھی کونے میں رہتا ہو۔

خلاصہ کلام یہ کہ زمین کا کوئی خطہ یا شہر انبیائے کرام کے وجود سے محروم رہا اور نہ ہی زمانہ فترت کبھی بہت طویل ہوا۔ ہر دور کا انسان کسی نہ کسی نبی کی چلائی ہوئی بادِ نسیم کے معطر جھونکوں سے محظوظ ہوتا رہا، تاہم جن علاقوں میں مرور زمانہ سے وہاں کے نبی کا نام تک لوگوں کو بھول گیا اور اس کی تعلیمات کے نشانات مٹ گئے، ایسے دور کو دوسرے نبی کے ظہور پذیر ہونے تک زمانہ فترت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ایسے دور کا انسان اگر کفر اختیار کر کے شعوری طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار نہ کرے تو اس کی مغفرت کر دی جائے گی۔ واللہ اعلم

انسان گناہ کا ارتکاب اپنے جزئی ارادے سے کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے کلی ارادے سے؟

اس موضوع کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ انسان ارادے کا مالک ہے، خواہ اس ارادے کو جزئی ارادے کا نام دیں یا اسے انسانی مشیت و کسب سے تعبیر کریں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی صفت خلق پر کلی ارادے، قدرت اور تکوینی ارادے کا اطلاق ہوتا ہے۔ جب اس مسئلہ کو حق تعالیٰ کے تناظر میں دیکھا جائے تو یوں لگتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ اپنے ارادے کو نافذ کرتے ہوئے حالات کو ایک متعین رخ پر چلنے پر مجبور کرتے ہیں اور یوں جبر کا عمل دخل بڑھ جاتا ہے، لیکن اگر اسی مسئلے کو انسانی تناظر میں دیکھیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان اپنے کام خود سر انجام دیتا ہے، بلکہ معتزلہ کے الفاظ میں "ہر انسان اپنے اعمال کا خالق ہے۔"

اللہ تعالیٰ کائنات میں ظہور پذیر ہونے والی ہر چیز کے خالق ہیں۔ اوپر سوال میں ذکر کردہ کلی ارادے سے یہی مراد ہے۔ ارشاد خداوندی ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ (الصّافات :۹۶) "حالانکہ تم کو اور جو کچھ تم بناتے ہو اس کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اور تم سے صادر ہونے والے اعمال کو پیدا فرمایا ہے۔

مثال کے طور پر اگر آپ کوئی گاڑی تیار کریں یا گھر بنائیں تو ان کاموں کے خالق حق تعالیٰ ہیں، کیونکہ آپ اور آپ کے اعمال کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات ہے، تاہم ان افعال کا کسب اور انہیں سر انجام دینا انسان کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ یہ کسب عادی شرط اور ظاہری سبب ہے اور اس کی مثال بجلی کے اس وسیع نظام کی سی ہے، جو محض آپ کے ایک بٹن دبانے سے بہت بڑے علاقے کو روشن کر دیتا ہے۔ جس طرح یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آپ نے کچھ نہیں کیا اور جو کچھ ہوا اس میں آپ کا کوئی دخل نہیں ہے، اسی طرح یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ یہ روشنی مکمل طور پر آپ کی مرہونِ منت ہے۔ عمل کا حقیقی سبب حق تعالیٰ کی ذات ہے، لیکن ان اعمال کی تخلیق کے وقت اللہ تعالیٰ نے انسان کے جزئی ارادے کی مداخلت کو قبول کرتے ہوئے اسے اس کا عادی سبب اور اپنے فعل کو اس جزئی مداخلت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

مثال کے طور پر اس جامع مسجد میں روشن بلب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور اسے کام کرنے کے قابل بنا کر اس میں روشنی کرنے کی صلاحیت رکھی، کیونکہ الیکٹرانز کے بہاؤ سے بجلی پیدا کرنا اور جامع مسجد کو روشن کرنا ایک ایسا فعل ہے، جس کا حقیقی سبب "نورالنور"، "منورالنور" اور "مصورالنور" ہے، جو حق تعالیٰ کی ذات ہے، لیکن اس مسجد کو روشن کرنے کے عمل میں ایک چیز انسان کی طرف بھی منسوب ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ اس آلے میں موجود ایک بٹن کو دبانا ہے، دوسرے لفظوں میں کام، آلے، انسانی قدرت سے خارج روشنی کرنے کے عمل اور انسانی طاقت وارادہ کا حقیقی سبب حق تعالیٰ کی ذات ہے۔

اسے ایک اور مثال سے سمجھئے، فرض کریں ایک مشین کام کرنے کے لیے تیار ہے اور آپ کا کام صرف اس میں موجود ایک بٹن کو دبانا ہے۔ اس مشین کے چلنے کا حقیقی سبب اسے بنانے اور تخلیق کرنے والا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم انسان کی معمولی سی مداخلت کو کسب اور جزئی ارادے کا نام دیتے ہیں اور حق تعالیٰ شانہ کے عمل پر صفت "خلق" کا اطلاق کرتے ہیں۔ اس تفصیل سے ہمارے سامنے ارادے کی دو قسمیں آتی ہیں:

۱۔ کلی ارادہ
۲۔ جزئی ارادہ

ارادے کا مطلب متوجہ ہونا اور چاہنا ہے، جس کا حقیقی سبب حق تعالیٰ کی ذات ہے: ﴿وَمَا تَشَاؤُونَ إِلَّاأَن يَشَاءَ اللَّهُ﴾ (الانسان: ۳۰) "اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر جو اللہ کو منظور ہو۔" اس بارے میں غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ بندہ معمولی سے ارادے کا مالک ہے، جس کا ظہور انگلی دبانے کی صورت میں ہوتا ہے تو ہم جبر محض کے قائلین سے جدا ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو افعال کا خالق تسلیم کر کے اپنی راہ عقل پرستوں (Rationalists) سے علیحدہ کر لیتے ہیں، لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت والوہیت میں کسی کو

شریک بناتے ہیں اور نہ ہی کسی کو حق تعالیٰ شانہ کا مثل ٹھہراتے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں ایک اور یکتا ہیں، اسی طرح وہ اپنے افعال اور اقدامات میں بھی کسی کو شریک نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کے خالق ہیں، لیکن انہوں نے امتحان و آزمائش اور دیگر بہت سے اسرار اور حکمتوں کے تحت انسانی عمل دخل اور کسب کو ایک عادی شرط کے طور پر قبول فرمایا ہے۔ اس موضوع کی مزید وضاحت کے لیے میں ایک جلیل القدر عالم(11) کی پیش کردہ مثال ذکر کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

فرض کریں کسی بچے نے آپ سے مطالبہ کیا کہ آپ اسے گود میں اٹھا کر فلاں جگہ لے جائیں، چنانچہ آپ نے اس کی خواہش پوری کر دی، لیکن وہاں وہ سردی لگنے کی وجہ سے بیمار ہو گیا۔ کیا وہ آپ کو یہ کہہ کر ملامت کر سکتا ہے کہ آپ اسے وہاں کیوں لے کر گئے۔ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے، کیونکہ اس نے خود اس کا مطالبہ کیا تھا، بلکہ اگر وہ آپ کو ملامت کرے تو آپ اسے ڈانٹ سکتے ہیں۔ کیا آپ بچے کے ارادے کی نفی کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے، لیکن اس کے باوجود آپ ہی اسے اس جگہ لے کر گئے ہیں، نیز بیماری بچے کا فعل نہیں ہے، کیونکہ اس سے تو صرف مطالبہ سرزد ہوا تھا، لہٰذا یہاں بیمار کرنے والے، بچے کو وہاں لے جانے والے اور وہاں جانے کا مطالبہ کرنے والے کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے۔ ہم تقدیر اور انسانی ارادے کو بھی اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا فیصلہ فرمانے والے ہیں۔ واللہ اعلم

آیت مبارکہ ﴿ مَن يَهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيّاً مُّرْشِداً ﴾ (الزمر:۲۳) "جس کو اللہ ہدایت دے وہ ہدایت یاب ہے اور جس کو گمراہ رہنے دے تو تم اس کے لئے کوئی دوست راہ بتانے والا نہ پاؤ گے۔" اور آیت مبارکہ (فَمَن شَاء فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْيَكْفُرْ) (الکہف: ۲۹) "جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔" میں کیسے تطبیق ممکن ہے؟

اس سوال کے دو حصے ہیں پہلا حصہ یہ ہے کہ کائنات کا نظام اللہ تعالیٰ کے کلی ارادے کے تحت چلتا ہے یا انسانی ارادے کے تحت؟ آیت مبارکہ ﴿ مَن يَهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيّاً مُّرْشِداً ﴾ (الزمر:۲۳) "جس کو اللہ ہدایت دے وہ ہدایت یاب ہے اور جس کو گمراہ رہنے دے تو تم اس کے لئے کوئی دوست راہ بتانے والا نہ پاؤ گے۔" کا تعلق سوال کے اسی حصے کے ساتھ ہے۔ ہدایت انبیائے کرام کے سیدھے اور درست راستے کو کہتے ہیں۔ جبکہ "ضلالت" منحرف راستے کو کہتے ہیں۔ یہ درست راستے کو گم کرنے اور استقامت سے دوری کا نام ہے۔

اگر زیادہ گہری نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک عمل ہے اور انسانی تناظر میں دونوں عملی فعل شمار ہوتے ہیں، لہٰذا ان دونوں کا حقیقی سبب حق تعالیٰ کو قرار دینا ضروری ہے، کیونکہ ہر فعل کا حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور کوئی بھی فعل اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، ضلالت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفت "المضلّ" سے ہے اور ہدایت کا تعلق اللہ تعالیٰ کے نام "الھادی" سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی دونوں عطا کرنے والے ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کا کوئی عمل دخل اور کسب نہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یا گمراہی کو قبول کرنے پر مجبور ہے، جس کے نتیجے میں وہ گمراہ یا ہدایت یافتہ کہلاتا ہے۔ اس بات کو یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر مثال کے طور پر ہدایت یا گمراہی کے عمل کا وزن

دس ٹن ہو تو انسانی عمل دخل اس کے سوویں حصے کے برابر بھی نہیں، بلکہ عمل سارے کا سارا حق تعالیٰ کا ہی ہے۔

اسے ایک مثال سے سمجھئے: اللہ تعالیٰ ہدایت دیتے ہیں، لیکن ہدایت کے مختلف اسباب اور وسائل ہیں، مثلاً جامع مسجد کی طرف جانا، وعظ و نصیحت سننا، ذہن و فکر کی تربیت کرنا، قرآن کریم کو غور سے سننا اور اس کے معانی و مطالب پر گہرائی سے غور و فکر کرنا ہدایت کے وسائل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے مدرسے کا طالب علم بننا، آپ ﷺ کے ارشادات کو دھیان سے سننا، کسی مرشد سے راہنمائی لینا، اس سے اسباق پڑھنا، رسالت و نبوت کا روحانی ماحول اختیار کرنا اور اس کی بادِ نسیم کے جھونکوں کے لیے دل کے دریچوں کو کھولنا بھی ہدایت کے راستے ہیں۔ انسان ہدایت تک پہنچانے والے راستوں کو اختیار کر سکتا ہے۔ اگرچہ جامع مسجد کی طرف آنا ایک معمولی سا عمل ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت کا وسیلہ قرار دیا ہے، دوسرے لفظوں میں اگرچہ ہدایت اللہ کی توفیق سے نصیب ہوتی ہے، لیکن ہدایت کا دروازہ کھٹکھٹانے میں انسانی کسب کا بھی کسی حد تک عمل دخل ہے۔

بعض اوقات انسان شراب خانوں، ناچ گانوں کی محفلوں اور بت خانوں کے دروازے بھی کھٹکھٹاتا ہے، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے نام "المضلّ" کو پکار کر اس سے اپنے لیے گمراہی مانگتا ہے، جس کے جواب میں اگر اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو اسے گمراہ کر دیتے ہیں اور اگر چاہتے ہیں تو اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر کے اسے گمراہی و انحراف سے روک دیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی کسب ناکافی ہے اور وہ تنہا ہدایت یا گمراہی کا سبب نہیں بن سکتا۔ اسے ایک دوسری مثال سے سمجھئے: بعض اوقات آپ کو قرآن کریم یا وعظ و نصیحت سننے یا کوئی اچھی علمی کتاب پڑھنے سے اپنے دل پر نور کی برسات ہوتی محسوس ہوتی ہے، لیکن کسی اور شخص کو آذانِ محمدی، مواعظ اور دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی مناجات اور دعائیں سننے سے وحشت ہوتی ہے اور وہ آذان کی آواز سن کر کہتا ہے کہ یہ کیسی عجیب آواز ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی ہٹ دھرمی سے گمراہی کے راستے پر چل پڑے تو اللہ تعالیٰ ایک بہت بڑی مشین کو چلانے کے لیے بٹن دبانے کی مانند مکمل طور پر اپنی طرف منسوب ہونے والے عمل کے باقی ماندہ حصے کی تخلیق بھی فرمادیتے ہیں اور پھر انسان کے گمراہی کی طرف مائل ہونے اور اس میں رغبت رکھنے کی وجہ سے اسے سزادیتے ہیں یا معاف فرمادیتے ہیں۔

کیا دنیا کی فراوانی اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی اور فقر وفاقہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی کی علامت ہے؟

ایسا سوال اگر حصول معرفت کے سوا کسی اور مقصد کے لیے پوچھا جائے تو پوچھنے والا گناہ گار ہو گا۔ اگر کوئی شخص تنگی میں مبتلا ہو تو اسے شکوہ کرنے کی اجازت نہیں، لیکن وہ سمجھنے کی غرض سے یہ سوال پوچھ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں مال و دولت، گھر بار اور سواریاں عطا فرماتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں فقر وفاقہ اور تنگی میں مبتلا فرماتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بعض اسباب مثلاً خاندانی حالات وغیرہ کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے، نیز بعض لوگوں کی مال کمانے اور بڑھانے کی صلاحیتوں، سمجھ بوجھ اور قابلیت کا انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کے اپنے ماحول اور حالات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت کی تاثیر کو جھٹلایا جا سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود بسا اوقات اللہ تعالیٰ اعلیٰ قابلیت کے حامل لوگوں کو مال کی فراوانی نہیں دیتے۔ ہمارے موضوع سے متعلق ایک ضعیف حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مال جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں، لیکن علم صرف اسے عطا فرماتے ہیں جو اسے اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے۔

مال و جاہ کو ہر حال میں اچھی چیز سمجھنا غلط ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے مال، خوشحالی اور دنیوی آسائش مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بعض اوقات یہ چیزیں عطا فرد یتے ہیں اور بعض اوقات نہیں دیتے اور دونوں صورتوں میں بہتری ہی ہوتی ہے، کیونکہ اگر وہ شخص اچھا ہوا اور اس نے مال کو بھلائی کے کاموں میں خرچ کیا تو مال اس کے لیے بہتر ہو گا، لیکن اگر وہ شخص برا اور راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہو ا تو اللہ تعالیٰ اسے مال دیں یا نہ دیں حالات اس کے حق میں برے ہی رہیں گے۔ اگر وہ شخص برا ہوا تو اس کے لیے فقر کفر کا سبب بن سکتا ہے، کیونکہ وہ اسے اپنے رب کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر ابھارے گا، نیز استقامت سے دوری کا مطلب قلبی

زندگی اور صحیح روحانیت سے محرومی ہے، لہٰذا ایسی صورت میں مالداری الٹا مصیبت و آزمائش بن جاتی ہے۔﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾(التغابن:۱۵) ''تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو آزمائش ہیں۔''

آج بہت سے لوگ اس امتحان میں ناکام ہو چکے ہیں۔ کتنے ہی مالدار بہت زیادہ ثروت کے مالک ہیں، لیکن کفر کے سبب ان کے دل میں روشنی کی ادنی چمک بھی نہیں ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا ایسے لوگوں کو مال وجاہ عطا کرنا استدراج (12) اور ان کی گمراہی کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ چونکہ انہوں نے اپنی قلبی اور روحانی زندگی کا خاتمہ اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فطری صلاحیتوں کو برباد کر دیا ہے، اس لیے وہ اس سزا کے مستحق قرار پائے۔ ایک حدیث نبوی میں ہے:''اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ کی قسم اٹھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرما دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں سے ایک براء بن مالک رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔(13) لیکن اس کے باوجود حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی حضرت براء رضی اللہ عنہ کو کھانے کے لیے کھانا اور رہنے کے لیے ٹھکانہ میسر نہ تھا۔ وہ بقدر ضرورت روزی پر اکتفا کرتے تھے۔ حضرت براء رضی اللہ عنہ ایسے کتنے ہی پراگندہ بالوں اور غبار آلود کپڑوں والوں کی عظیم ہستیوں جیسی عزت و توقیر کی جاتی تھی اور ان کی روحانی وسعت، گہرائی اور عظمت اور ان کی قلبی نورانیت کے مطابق انہیں مقام و مرتبہ دیا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر وہ اللہ کی قسم اٹھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو پورا فرما دیتے ہیں۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ فقر اور مالداری میں سے کوئی بھی اپنی ذات کے اعتبار سے مصیبت یا نعمت نہیں۔ بعض اوقات موقع کی مناسبت سے فقر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت بن جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مرضی سے فقر کو اختیار فرمایا اور رسول ﷺ کے فقر و فاقہ کو دیکھ کر غمزدہ ہونے پر آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا تھا:''کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ان (کافروں) کے لئے دنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت۔''(14) نیز باوجود اس کے کہ دنیا کے خزانے بیت المال میں امڈ کر آرہے تھے، خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فقر کی

زندگی بسر کی اور بیت المال سے صرف اتنی تنخواہ وصول کی، جس سے جسم اور جان کا رشتہ قائم رہ سکے اور اس سے زیادہ کا کبھی مطالبہ نہ کیا۔

لیکن خدا حفاظت فرمائے! فقر کی ایک قسم کفر اور گمراہی بھی ہے، مثلاً اگر یہی سوال حصول معرفت کی بجائے ناراضگی کے اظہار کے لئے کسی ناشکرے انسان کی زبان سے نکلے تو یہ نہ صرف اللہ تعالی کی نعمتوں کی ناشکری، اللہ سے شکوہ اور اس کی نافرمانی قرار پائے گا، بلکہ کفر سمجھا جائے گا، لہٰذا فقر کبھی نعمت ہوتا ہے اور کبھی مصیبت، دوسرے لفظوں میں اصل چیز دل سے نکلنے والی صدا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے:

یارب!کل مایأتی منک مقبول	ان كان خلعة ... أو كان كفناً
ان كان وردة ... أو شوكاً	نعمتک ومحنتک ... کلاهماحسن

"اے پروردگار! آپ کی طرف سے آنے والی ہر چیز قبول ہے وہ خلعت ہو یا کفن، پھول ہو یا کانٹا۔ آپ کی نعمت اور آزمائش دونوں اچھی ہیں۔"

مشرقی اناطولیہ میں ایک ضرب المثل مشہور ہے: "کل ما جاء منک جمیل سواء أكان هذا أم ذاک" (آپ کی طرف سے آنے والی ہر چیز اچھی ہے، یہ ہو یا وہ۔) انسان کا تعلق اگر اللہ تعالیٰ سے مضبوط ہو تو اسے مالداری اور فاخرانہ لباس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ ایسا شخص شیخ عبد القادر جیلانی کی مانند ہوتا ہے، جن کا پاؤں اولیائے کرام کے کندھوں پر تھا اور سر رسول اللہ ﷺ کے دامن سے چھو رہا تھا، لیکن اگر انسان کا رشتہ خدا سے ٹوٹ جائے تو اس کا فقر دنیا و آخرت میں اس کے لیے خسارے کا باعث بنتا ہے، اسی طرح اگر مالدار شخص خدا سے غافل ہو تو دنیا میں اگرچہ وہ خوش بخت دکھائی دیتا ہے، لیکن آخرت میں بہت بڑا خسارا اس کا منتظر ہوتا ہے۔

ملک الموت ایک ہی لحظہ میں بہت سے مرنے والوں کی جانیں تنہا کیسے قبض کرتا ہے؟

اس سوال سے پتا چلتا ہے کہ انسانی معیارات کیسے انسان کو دھوکا دیتے ہیں۔ جس طرح فرشتوں کو انسانوں جیسا سمجھنا غلط ہے، اسی طرح جسم میں روح کے اثرات اور وظائف کے بارے میں تحقیق کرنا بھی فضول ہے، لہٰذا اس سوال کا جواب دینے سے پہلے "تعبیر کی غلطی" (Terminological Error) کی وضاحت ضروری ہے، دوسرے لفظوں میں پہلے اس سوال میں انحراف کے نقاط کی نشاندہی کی جائے گی اور پھر جواب دیا جائے گا۔

چونکہ فرشتوں کا تعلق ایک دوسرے عالم سے ہے، اس لیے ان کی فطرت، ماہیت اور وظائف مکمل طور پر ہمارے عالم سے مختلف ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے مخصوص عالم کو پیش نظر رکھے بغیر اور ان کی ماہیت و وظائف پر غور کیے بغیر کوئی بات کہنا درست نہ ہو گا، لہٰذا پہلے اس پہلو سے انہیں جاننا ضروری ہے۔

ملائکہ کا لفظ "مَلک" بمعنی قوت یا "مَلک" بمعنی پیامبر سے ماخوذ ہے۔ پہلے اشتقاق کے لحاظ سے اس کے معنی "بہت زیادہ طاقتور" کے ہوں گے اور دوسرے اشتقاق کے لحاظ سے اس کے معنی "اللہ تعالیٰ کے احکامات کو منتقل کرنے والے پیامبر" کے ہوں گے۔ ان امتیازی اوصاف کا اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ تمام فرشتوں میں بالعموم اور وحی الٰہی پہنچانے والے فرشتوں میں بالخصوص پایا جانا ناگزیر ہے۔ موت و حیات کے معاملات کی نگرانی کرنے والے فرشتوں سے لے کر حملۃ العرش اور ملائے اعلیٰ میں موجود فرشتوں تک یہ آسمانی مخلوق، مخلوقِ خدا کی نگہبانی اور دیگر فرائض کی انجام دہی پر مامور ہے۔

عالم اکبر (کائنات) سے لے کر عالم اصغر (ایٹم) تک میں ہونے والی تمام تبدیلیاں اور تغیرات اس عالی مقام اور ممتاز مخلوق کے زیر نگرانی وقوع پذیر ہوتے ہیں، نیز یہ طاقتور اور

امانت دار مخلوق اللہ تعالیٰ کی صفت کلام سے پھوٹنے والے شرائع اوراحکام خداوندی کو پہنچانے کے فرائض بھی سرانجام دیتی ہے۔ اگر ہم کائناتی سطح پر جاذبیت اور تنافر کے قوانین سے لے کر نیوکلیس کے گرد الیکٹرانز کی منظم گردش کے حیرت انگیز اور مشکل فرائض کو پیش نظر رکھیں تو ہمیں اس مخلوق کی طاقت اورامانت داری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

فرشتوں کے فرائض ووظائف بہت زیادہ اور مختلف انواع کے ہیں۔ کسی بھی واقعے کا ان کے فرائض سے خارج ہونا ناقابل تصور ہے۔ ان کی نگرانی کے بغیر بارش کا کوئی قطرہ برستا ہے اور نہ ہی بجلی کی کوئی کوند چمکتی ہے۔ کائنات کے تمام قوانین فطرت شعوروادراک کی مالک ان قوتوں کے واسطے سے کام کرتے ہیں اوران میں سے ہر ایک مالک الممالک حق سبحانہ وتعالیٰ کی عطاکردہ قابلیت وصلاحیت کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دیتی ہے، نیز اشرف المخلوقات حضرت انسان کے کردار کو سنوارنے، منظم کرنے اور صحیح رخ پر ڈالنے کے لیے انہی کے واسطے سے الہام اور وحی کا نزول ہوتا ہے۔

لہٰذا خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ بننے اورایٹم سے لے کر کہکشاؤں تک بہت سی اہم ذمہ داریاں سرانجام دینے کے لیے فرشتوں کو جو عظیم ملکوتی(15) طاقت اور قوت عطا کی گئی ہے، اگر اسے پیش نظر رکھیں تو انہیں انسان سے تشبیہ دینااورانسانوں کو پیش آنے والی رکاوٹوں کو فرشتوں کی راہ میں حائل سمجھنا جہالت اور فکر و خیال کی کجی کا نتیجہ قرار دیا جانا چاہیے۔ اگرانسان کے قابل تحلیل جسم کی طرح فرشتوں کے جسم بھی مادی ہوتے اور دیگر تمام جانداروں کی طرح وہ بھی زمانے کے تابع ہوتے تو ہم ان کے بارے میں انسانی معیار کو استعمال کرنے میں حق بجانب ہوتے، لیکن چونکہ ان دونوں کا تعلق دو مختلف جہانوں سے ہے، اس لیے ان کے درمیان ناقابل بیان امتیازات پائے جاتے ہیں۔

تخلیق کے لحاظ سے بھی فرشتے انسانوں سے مختلف ہیں۔ یہ فرق ان کے فرائض وواجبات کی وسعت سے پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ ان کی فطرت میں نورانیت ہے، اس لیے ان میں نفوذ اور سیال پن

زیادہ ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ہی لمحے میں بہت سی روحوں کے سامنے آنے اور ایک ہی وقت میں مختلف لوگوں کو دکھائی دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ایک فرشتہ متعدد روپ اختیار کر سکتا ہے۔ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ چونکہ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے ان میں نور کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

سورج کی طرح کا ہر روشن جسم کسی بھی شفاف جسم پر اپنا پرتو ڈال کر مختلف مقامات پر ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔نور کی خصوصیات اور صفات کے حامل فرشتے ایک ہی لمحے میں ہزاروں ارواح سے رابطہ رکھ سکتے ہیں۔

چونکہ خفیف اور لطیف ماہیت رکھنے والے فرشتے سورج ایسی مادی اور کثیف اشیاء سے بہت مختلف ہیں، اس لئے یہ جس طرح مختلف اوقات میں مختلف شکلیں اور صورتیں اختیار کرنے پر قدرت رکھتے ہیں، اسی طرح ایک ہی وقت میں مختلف صورتوں میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں۔مذہبی لوگوں کے ہاں تمثل کا تصور خاصا قدیم ہے، لیکن اب یہ مالدار اشرافی طبقے کی محفلوں میں بھی اس قدر عام اور معروف موضوعِ سخن بن گیا ہے کہ اسے تجربات سے ثابت شدہ حقائق کی طرح یقینی سمجھا جانے لگا ہے۔

آئے روز اخبارات و رسائل میں کسی نہ کسی عجیب و غریب روحانی مظہر کے بارے میں خبریں شائع ہوتی ہیں۔انہیں علم تحضیر الارواح کی اصطلاح میں "سیال جسم" یا "مثیل الانسان" (16) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ایک انسان کو اس کی موجودگی کے مقام سے دور کسی دوسرے مقام پر دیکھے جانے اور اس مثالی جسم سے عجیب و غریب قدرتوں اور صلاحیتوں کے ظہور پذیر ہونے کے بارے میں بکثرت خبریں ملتی ہیں۔ان کی حقیقت کچھ بھی ہو اتنی بات یقینی ہے کہ ارواح ایسی موجودات میں مادی اجسام کی بہ نسبت زیادہ سیال پن اور صلاحیتیں ہوتی ہیں، نیز وہ عام انسان کی بہ نسبت زیادہ آزادانہ نقل و حرکت کر سکتی ہیں۔مادے سے متجاوز یہ سیال پن

اور گھومنے پھرنے کی صلاحیت مثالی جسم کے عام انسان کی بہ نسبت زیادہ متحرک و فعال ہونے کی طرف مشیر ہے۔ چونکہ اس سلسلے میں فرشتے روح سے بھی زیادہ صلاحیتیں رکھتے ہیں، اس لیے ان کا ہمارے عالم میں جاری و ساری طبیعی قوانین سے ماورا ہونا بالکل ظاہر ہے۔

فرشتوں اور ارواح کا کسی صورت میں ظاہر ہونا قدیم دور سے مشہور ہے۔ بہت سے اہل دل خصوصاً انبیائے کرام نے اس بارے میں اپنے مشاہدات کی عام لوگوں کے سامنے وضاحت کی ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام حسبِ موقع مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے تھے۔ اگر موقع پیام رسانی اور وحی پہنچانے کا ہوتا تو وہ اس ذمہ داری کے مناسب حال شکل وصورت میں ظاہر ہوتے اور اگر جنگ کے دوران ظاہر ہوتے تو جنگجو کی صورت اختیار کرتے۔ یہ سب تمثل کی مثالیں ہیں۔ یہ تمثل عام فرشتوں کے بارے میں بالعموم اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کے بارے میں بالخصوص منقول ہے، جو صحابی رسول حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے۔(17) ایک اور فرشتہ جس کا نام ہمیں معلوم نہیں جنگ احد میں صحابی رسول حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی صورت میں ظاہر ہوا اور مشکل ترین حالات میں نبی اکرم ﷺ کے دفاع میں شام تک لڑتا رہا، اسی طرح غزوہ بدر میں بعض فرشتوں نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی صورت میں ظاہر ہو کر مسلمانوں کے حوصلے بلند کیے۔

بعض اہل دل اور اولیائے کرام کے عالم بالا کی ہستیوں سے رابطے کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ خواب کے ذریعے اس رابطے میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔ عام لوگوں کو بھی اس کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ تقریباً ہر انسان کو اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ کوئی روح جسے وہ جانتا ہوتا ہے، خواب میں اسے ہدایات دیتی ہے یا کسی معاملے میں اس کی راہنمائی کرتی ہے، تاہم بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ خواب محض لاشعور کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ دعوی کر کے وہ اس موضوع کو ایسی تاریکی میں دھکیل دیتے ہیں، جہاں کسی کو کچھ سجائی نہیں دیتا۔ ایسی جہالت سے خدا کی پناہ!

ہم فرشتوں، تمثل اور روحوں کے موضوع میں دلچسپی رکھنے والوں کو خاص اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کی طرف مراجعت کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، لیکن بطور نتیجے کے اتنی بات ضرور

کہیں گے کہ جس طرح ہر موجود چیز کی مثل آئینے میں ظاہر ہوتی ہے، اسی طرح فرشتوں کے لیے ہر چیز آئینے کی مانند ہے اور وہ اس میں جلوہ گر ہو سکتے ہیں، تاہم مادی اجسام کے بر خلاف ان کا ظہور صرف صورت کی مانند نہیں ہوتا، بلکہ اپنی تمام تر صفات اور خصوصیات کے ساتھ ہوتا ہے۔

اس بارے میں فرشتے یا روح کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ تنہا فرد ہے، کیونکہ وہ اپنی جگہ سے اپنا پرتو شعاع کی مانند، جس جگہ چاہے ڈال کر مطلوبہ فرائض سر انجام دے سکتا ہے۔ اس بارے میں دوری اور مسافت رکاوٹ بن سکتی ہے اور نہ ہی ان لوگوں کی کثرت جن تک پہنچنا مطلوب ہے۔ جس طرح سورج تنہا ہونے کے باوجود ہر ایسی جگہ پہنچ کر جہاں اس کی روشنی کو منعطف کرنے والا آئینہ موجود ہو، اپنے اثرات ڈالتا ہے، ایسے ہی نورانی مخلوق فرشتے کسی بھی جگہ ظہور پذیر ہو کر حیات و ممات سے متعلق اپنی ذمہ داریں ادا کرتے ہیں۔

مزید بر آں حقیقت میں ارواح کو قبض کرنے والی ذات تو اللہ تعالیٰ کی ہے۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام تو محض نگران اور واسطہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں اور ایسے ایسے امور سر انجام دیتے ہیں، جن کا انسانی عقل تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ ایک لمحے میں اربوں مخلوقات کو وجود بخشتے ہیں اور اتنی ہی مخلوقات کو فنا کرتے ہیں۔ یہ وہ لامتناہی قدرت ہے، جو ہر لمحے ہر چیز کو دیکھتی اور جانتی ہے اور وہ لامتناہی علم ہے، جس کا عقل تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ کائنات کے ذرے ذرے سے واقف ہیں، آنِ واحد میں ان ذرات کی بقدر کام سر انجام دیتے اور تمام مرنے والوں کی روحیں قبض کرتے ہیں۔

روح قبض کرنے والے اللہ تعالیٰ ہوں یا ملک الموت، جس کی موت کا وقت آ پہنچتا ہے وہ اپنی روح قبض کروانے کے لیے خود اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے: فرض کریں ہزاروں کی تعداد میں ریڈیو اور اینٹینا ہیں، جو کسی مخصوص فری کوئنسی پر کام کرتے ہیں۔ جب ہم اس فری کوئنسی پر کام کرنے والے ٹرانسمیٹر کا بٹن دباتے ہیں تو ایک ہی وقت میں ان تمام ریڈیوں پر الفاظ اور بولنے والے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح مخلوق اپنے تمام تر عجز و فقر کے ساتھ قدرت و عزت کی مالک ہستی کی طرف متوجہ ہے اور جب اس کی تخلیق یا روح

کی سپردگی کا مقررہ وقت آتا ہے وہ اپنی روح میں مخصوص اشارہ محسوس کرتی ہے۔ جب ایک عاجز انسان ایک بٹن دبا کر ہزاروں کلومیٹر دور پڑے آلات پر اثرانداز ہو سکتا ہے تو عجز و نقصان سے پاک اور قدرت والی ہستی جس کا ہماری ارواح وانفاس کے ساتھ گہرا تعلق بھی ہے، ہماری ارواح پر اثرانداز ہونے سے کیسے عاجز آسکتی ہے؟ جبکہ انسان ایک زندہ مشین ہی تو ہے۔

اوپر ذکر کردہ تفصیل سے قطع نظر قبض روح سے متعلق مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔

۱۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا روح عطا اور قبض کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں۔ ملک الموت کی حیثیت محض واسطے اور نگران کی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو ارواح قبض کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے اور اوپر ہم مثالوں سے اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ ایک ہی فرد یا فرشتہ تن تنہا اس کام کو سرانجام دے سکتا ہے۔

۳۔ بہت سے ملائکہ ایسے ہیں، جن کے تحت اور بہت سے ایسے ملائکہ کام کرتے ہیں، جنہیں بہت سے تکوینی امور کو سرانجام دینے اوران کی نگرانی کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، لہٰذا ملک الموت کی سربراہی میں بہت سے فرشتے ہیں، جو روحوں کے قبض کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ ان کی مختلف اقسام ہیں۔ ایک قسم کے فرشتے اہل ایمان کی روحیں بغیر تکلیف پہنچائے آسانی سے قبض کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے فرشتے مجرموں کی روحیں تکلیف دہ انداز میں قبض کرتے ہیں اور ایک تیسری قسم کے فرشتے ان روحوں کو تیزی سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں: ﴿وَالنَّازِعَاتِ غَرْقاً ٥ وَالنَّاشِطَاتِ نَشْطاً ٥ وَالسَّابِحَاتِ سَبْحاً ٥ فَالسَّابِقَاتِ سَبْقاً ٥ فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْراً﴾ (النازعات:۱۔۵) ”ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر کافروں کی جان کھینچ لیتے ہیں اور ان کی جو مؤمنوں کی جان آسانی سے نکالتے ہیں اور ان کی جو تیرتے ہوئے جاتے ہیں پھر لپک کر آگے بڑھتے ہیں پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے

ہیں۔ "لہٰذا الملک الموت کے تحت بہت سے ملائکہ کام کرتے ہیں، جنہیں وہ حکم خداوندی سے نیک بخت اور بد بخت لوگوں کی روحیں قبض کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ اس میں آغاز سے ہی فکری انحراف پایا جاتا ہے۔ وہ انحراف فرشتوں کو انسان کے مشابہہ قرار دینا ہے، حالانکہ فرشتے تخلیق میں انسان سے مشابہت رکھتے ہیں اور نہ ہی ماہیت کے اعتبار سے، نیز فرشتوں کے کام اور اقدامات بھی انسان کے کاموں اور اقدامات سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ انسانی روح کی طرح آن واحد میں مختلف مقامات پر ظاہر ہو کر مختلف کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ دورِ حاضر میں توروحوں کو حاضر کرنے اور غیر مرئی مخلوقات کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کا بہت چرچا ہے۔ حیاتیاتی قوانین سے ماورا اور شعور رکھنے والے قوانین کی طرف مشیر ہپناٹزم اور علم روحانیات (Spirtualisim) وغیرہ ایسی سرگرمیاں عام ہو چکی ہیں۔

یہ بات اس قدر عام ہے کہ اس سے یقین کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، لہٰذا اس قسم کی مخلوقات سے مشابہت رکھنے والے فرشتے ان کی ذمہ داریوں سے کئی گناہ زیادہ کام کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ روحیں قبض کرنے کی ذمہ داری بطور خاص قابل ذکر ہے، کیونکہ اس کاروائی کے دوران جس جاندار کی موت کا وقت آپہنچتا ہے، وہ روح سپرد کرنے کے لیے تیار اور آمادہ ہوتا ہے اور ایک ہی فری کوئنسی کے ذریعے وہ ان فرشتوں سے وابستہ ہوتا ہے، مزید بر آں اس ذمہ داری کو محض ایک ہی فرشتہ سرانجام نہیں دیتا، بلکہ یہ ذمہ داری لاتعداد فرشتوں کے سپرد ہے۔ اگر ہم جان کنی کے عالم میں مبتلا ہر شخص کی روح قبض کرنے کے لیے ایک مستقل فرشتے کو بھیجنے کو پیش نظر رکھیں تو اس معاملے میں کوئی بھی بات باعث اشکال نہیں رہتی۔ واللہ اعلم

کیا نیت نجات کے لیے کافی ہے؟

جو نیت انسان کو عمل پر اکساتی ہے، وہ اسے ناکامی سے بچا سکتی ہے، لیکن جو نیت عزم اور سعی میں نہ بدلے، اس میں یہ صلاحیت قطعاً نہیں۔ نیت ارادے، عزم، احساس اور کسی طرف متوجہ ہونے سے عبارت ہے۔ نیت کے ذریعے انسان کو اپنی منزل کی سمت کا اندازہ اور اپنی ترجیحات کا علم ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں اس میں اپنے مقصد کو پانے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ نیت تمام اعمال کی بنیاد اور انسان کی طرف منسوب تمام رجحانات اور میلانات کا وسیلہ ہے، نیز یہ انسانی ارادے اور تخلیقی صلاحیت کی مضبوط اور محفوظ ترین اساس ہے، بلکہ یہ کہنے میں مبالغہ نہ ہوگا کہ کائنات اور انسان سے متعلق ہر چیز کی ابتدا اور بقا نیت پر منحصر ہے۔ نیت کے بغیر کوئی چیز وجود میں آ سکتی ہے اور نہ ہی باقی رہ سکتی ہے۔

ہر چیز کا آغاز ایک ذہنی تصور سے ہوتا ہے پھر یہ ذہنی تصور منصوبے میں ڈھلتا ہے اور آخرکار عزم و ارادے کی بدولت حقیقت کا روپ دھارتا ہے، تاہم جیسے اس ابتدائی تصور اور نیت کے بغیر کسی کام کا آغاز نہیں ہو سکتا، ایسے ہی جس نیت کے پیچھے عزم اور فیصلے کی قوت نہ ہو وہ بے ثمر رہتی ہے اور اس کا کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا۔ بہت سے امور سے نیت کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن جو لوگ زندگی کا حقیقی شعور نہیں رکھتے وہ نیت کی تاثیر سے ناآشنا رہتے ہیں۔

انسان کے اچھے اور برے اعمال کے لیے بھی نیت کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر اس پہلو سے دیکھیں تو ایک طرف نیت شفا اور اکسیر کا درجہ رکھتی ہے، لیکن دوسری طرف یہ ایسی آندھی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جو انسان کے تمام اعمال کو ضائع کر کے ان کا نام و نشان تک مٹا دیتی ہے۔ بسا اوقات گندم کے ایک دانے کی بقدر چھوٹا سا عمل حسن نیت کی بدولت بڑھ کر ہزار خوشوں کی صورت اختیار کر لیتا ہے یا پانی کا ایک قطرہ دریا بن جاتا ہے، لیکن دوسری طرف پہاڑوں جیسے اعمال بری نیت کی وجہ سے بے ثمر اور برباد ہو جاتے ہیں۔

رکوع و سجود، روزہ اور گناہوں اور بعض مباح امور سے بھی اجتناب اگر بندگی کے مکمل احساس کے ساتھ ہو تو بندے کو عالم بالا کے عالی مقامات پر پہنچا کر بادشاہ بنا دیتا ہے، لیکن اگر اس شعور اور احساس کے بغیر ان سے بھی زیادہ اعمال کیے جائیں تو ان کے کرنے والے کو سوائے بے آرامی اور تھکاوٹ کے کچھ حاصل نہ ہو گا، لہٰذا رضائے الٰہی کے حصول کے لیے کچھ امور کو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ بعض اعمال کو ایسے طور پر سر انجام دینا بھی ضروری ہے کہ وہ اشرف المخلوقات حضرتِ انسان کے مقام کے شایاں ہوں۔ جس کام یا سعی کا مقصد خوشنودئ خداوندی نہ ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

حسن نیت ایسی اکسیر ہے، جو معدوم کو وجود بخشتی ہے، لیکن بری نیت موجود کو فنا کرکے اس کے اثرات تک زائل کر دیتی ہے۔ میدانِ جہاد میں اپنے خون سے لت پت بہت سے لوگ بری نیت کی وجہ سے جہنم میں جاتے ہیں، لیکن نرم و گداز بستروں پر جان دینے والے بہت سے لوگ حسن نیت کی بدولت جنت کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ روشن مستقبل کی خاطر لڑنے والوں کے ہمراہ بہت سے لوگ ذاتی مفادات کی خاطر بھی جنگ میں شریک ہو جاتے ہیں، لیکن جب اول الذکر لوگ اعلیٰ علیین کے مقام پر فائز ہوتے ہیں، مؤخر الذکر لوگوں کو اسفل السافلین میں پھینک دیا جاتا ہے۔

نیت ایک ایسی جادوئی چھڑی ہے، جو ہماری اس عارضی زندگی کو ابدی زندگی میں بھی تبدیل کر سکتی ہے اور عذاب اور بدبختی کی زندگی میں بھی بدل سکتی ہے۔ جو لوگ اس چھڑی کا درست استعمال کریں گے ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی تاریک نہ رہے گا، بلکہ ان کی ساری زندگی جگمگا اٹھے گی اور وہ ہمیشہ کی اطمینان بخش زندگی پالیں گے، کیونکہ جب یومیہ، ہفتہ وار اور ماہانہ فرائض اخلاص کے ساتھ ادا کیے جائیں تو ان پر ملنے والا اجر و ثواب صرف ان کی ادائیگی کے اوقات تک محدود نہیں رہتا، بلکہ زندگی کے تمام لمحات کا احاطہ کرکے ان پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔ جہاد کے لیے مستعد سپاہی کو اس وقت بھی جہاد کا ثواب ملتا رہتا ہے، جب وہ عملاً جہاد

نہیں کر رہا ہوتا، اسی طرح جو پہرہ دار اپنی باری پر کسی قلعے یا چھاؤنی میں پہرداری کے فرائض سرانجام دیتا ہے، اسے کئی کئی ماہ تک مسلسل عبادت کرنے والے کی عبادت کا ثواب ملتا رہتا ہے۔ بندۂ مؤمن کے عارضی زندگی میں ابدی سعادت کو پانے اور کافر کے نصیب میں ہمیشہ کی بد بختی اور ندامت کے لکھے جانے میں یہی راز مضمر ہے، ورنہ ظاہری انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان کو اس کی عبادت اور نیکی کے مطابق جزا اور گمراہی و معاصی کی بقدر سزا دی جاتی، یعنی نیک آدمی اتنے ہی سال جنت میں رہتا، جتنے سال اس نے دنیا میں نیکی کے ساتھ گزارے اور گناہ گار اتنے ہی سال جہنم میں جلتا جتنے سال اس نے دنیا میں گناہوں میں گزارے، حالانکہ نیک یا بد انسان کا خلود تو وہ آخری نقطہ ہے، جس سے پار کا انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابدی سعادت و شقاوت انسان کی نیت میں مضمر ہوتی ہے۔ جس طرح ابدی ایمان اور استقامت کا عزم ابدی سعادت کا ذریعہ ہے، اسی طرح ابدی کفر اور انحراف کا عزم ابدی شقاوت کا وسیلہ ہے۔ چونکہ زندگی کے آخری لمحات میں بندگی کے احساس سے سرشار انسان ساری زندگی خواہ وہ ایک ہزار سال ہی کیوں نہ ہو، اسی نہج پر گزارنے کے لیے پُرعزم ہوتا ہے، اس لیے اس کے ساتھ اسی عزم اور نیت کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے اور اس کی نیت کو حقیقی عمل کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے: ''مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔'' (18) دوسری طرف اگر زندگی کے آخری لمحات میں کافر کی نیت یہ ہو کہ وہ ساری زندگی خواہ وہ ایک ہزار سال ہی کیوں نہ ہو، کفر والحاد پر ہی گزارے گا تو اسے اس کی نیت کے مطابق سزا دی جائے گی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس بارے میں اصل اعتبار انسان کی عارضی زندگی کا نہیں، بلکہ مستقبل کے بارے میں اس کی نیت کا ہے۔ اس نیت کی تجلیات اور ابدی سعادت پر ایمان رکھنے کی بدولت مؤمن ابدی جنت کا اور کافر ابدی جہنم کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

جس طرح جانتے بوجھتے شعوری طور پر کفر اختیار کرنے والا ملحد سزا پائے گا، اسی طرح کفر اور گناہوں کا سبب بننے والے شیطان کو بھی نہ ختم ہونے والی سزا ملے گی۔ درحقیقت شیطان بھی اپنی تخلیق کے تقاضوں کے مطابق بہت سے فرائض و خدمات سرانجام دیتا ہے۔ انسان کی بہت سے

صلاحیتوں کو جلا اور ارتقا بخشنے، اس کی فطرت میں پوشیدہ خام صلاحیتوں کو پختہ کر کے ظاہر کرنے اور قلب و روح کو ہر وقت مستعد اور چوکنا رکھنے میں شیطان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شیطان فرد اور معاشرے پر تسلط حاصل کر کے ان کے دلوں میں اپنے زہر آلود بیج بونے اور ان میں گناہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دلوں میں انحراف پیدا کرنے کی ان شیطانی کوششوں کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان کے روحانی جذبات بیدار ہو کر بالکل ایسے ہی چوکنے ہو جاتے ہیں، جیسے جسم کا دفاعی نظام جراثیم کے خلاف الرٹ ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں انسانی لطائف اور ان کی استعداد میں نمو و ارتقا ہوتا ہے، کیونکہ اس دوران انسان اپنے ابدی دشمن کے شر سے بچنے کے لیے بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہ انسان کی قلبی و روحانی زندگی کے اعتبار سے معمولی سے نقصان کے بدلے بہت بڑا فائدہ ہے۔ اس قسم کی معنوی تاثیر انسانی روح میں جذبہ پیدا کر کے اسے بیدار اور چوکنا رہنے پر ابھارتی ہے، جس کے نتیجے میں انسان کی بہت سے قیمتی مگر خام صلاحیتوں کو پختگی ملتی ہے اور نفس کے خلاف جہاد کرنے والے بہت سے بہادر اولیائے کرام تیار ہوتے ہیں۔

اگرچہ شیطان ان ممتاز ہستیوں کے پیدا ہونے اور ان کے عالی مقامات پر فائز ہونے کا ذریعہ بنتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے وہ کسی ثواب کا مستحق نہیں ٹھہرتا، کیونکہ وہ یہ کام خدا کی محبت میں فنا ہستیوں کو مزید بلندیاں عطا کرنے کے لیے نہیں کرتا، بلکہ اس کا مقصد انہیں گناہوں میں مبتلا کرنا ہوتا ہے۔ چونکہ اس کی نیت بری ہوتی ہے، اس لیے اس کا عمل بھی برا ہے، لہٰذا اس کے ساتھ اس کی بری نیت اور برے اعمال کے مطابق معاملہ کیا جائے گا اور اس کے اس عمل کی وجہ سے نیک لوگوں کو جو عالی مقام حاصل ہوئے، اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ شیطان کی نیت اور عمل دونوں برے ہیں اور وہ قصداً گناہوں کی دعوت دیتا ہے: ﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ أَنَاْ خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ○ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَن تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِينَ ○ قَالَ أَنظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ ○ قَالَ إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ○ قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ

صِـرَاطَکَ الْمُسْـتَقِیْمَ﴾ (الأعراف: ۱۲-۱۶) ''اللہ نے فرمایا: ''جب میں نے تجھ کو بھی حکم دیا تھا تو کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے باز رکھا؟'' اس نے کہا کہ میں اس سے افضل ہوں۔ مجھے تونے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے بنایا۔ فرمایا: ''تو بہشت سے اتر جا۔ تجھے شایاں نہیں کہ یہاں تکبر کرے پس نکل جا کہ تو ذلیل لوگوں میں سے ہے۔'' اس نے کہا: ''مجھے اس دن تک مہلت عطا فرما، جس دن لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے۔'' فرمایا: ''اچھا تجھ کو مہلت دی جاتی ہے۔'' بولا کہ مجھے تونے گمراہ کیا ہی ہے میں بھی تیرے سیدھے رستے پر ان کو گمراہ کرنے کے لئے بیٹھوں گا۔'' یہ پہلی نافرمانی کر کے شیطان نے شعوری طور پر کفر اور معصیت کے راستے کو اختیار کیا اور انسانیت کو بہکانے کی شیطانی قسم مسلسل چلنے والے انسانی ڈرامے کی اساس ہے۔

اگرچہ شیطان کے اس عزم وارادے کے ردعمل میں بعض انسانی جذبات بیدار ہوتے ہیں اور انسان بعض فضائل اختیار کرتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے شیطان کو کوئی ثواب نہیں ملتا، لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مؤمن کے لیے نیت ہی سب کچھ ہے۔ وہ انفرادی عمل میں جان پیدا کرتی ہے اور انسانی زندگی کو ایک کے مقابلے میں ہزار گنا زیادہ پیداوار دینے والے کھیت میں تبدیل کرتی ہے، تاہم جس طرح نیت دنیا کی تھوڑی سے محدود زندگی کو ابدی زندگی میں تبدیل کر دیتی ہے، اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ کی بدبختی اور خسارے کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ آخرت کا معاملہ اعمال کے مطابق کیا جائے گا، لیکن اعمال کا مدار نیت پر ہے۔

اِلفت کیا ہے؟ اور اس کے کیا منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

اِلفت کا عمومی معنی عادت، دوستی اور محبت ہے۔ اگرچہ یہاں مقصود معنی کا کسی حد تک ان معانی کے ساتھ بھی تعلق ہے، لیکن اس میں ان کی بہ نسبت زیادہ وسعت ہے۔ اِلفت انسان کے اشیاء اور واقعات کے ساتھ تعلق اور اس تعلق سے پیدا ہونے والے حقائق کا نام ہے۔ ان حقائق کا پرتو انسانی دل کی گہرائیوں پر پڑتا ہے اور وہاں حقائق کی بادِ نسیم چلتی ہے، جس کے نتیجے میں انسانی طرزِ عمل میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور ان کے اثرات روح کو زندہ، حساس اور فعال رکھتے ہیں۔

انسان کے احساسات کائنات کے حسن وجمال اور جاذبیت کو محسوس کرکے اس سے متاثر ہونے، اس کے انتہائی پیچیدہ نظام کو پسند کرنے، اسے دیکھ کر اس میں حیرت کے جذبات پیدا ہونے، ہر نئی دریافت سے اس کے علم و تجربے میں اضافہ ہونے اور اپنی معلومات کے مختلف اجزاء کا آپس میں ربط قائم کرکے سوچنے کے منظم انداز تک رسائی حاصل کرنے سے بیدار ہوتے ہیں، اس کے ذہن اور روح کی کارکردگی بہتر ہوتی ہے اور وہ روحانی اعتبار سے بیدار ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر حسن وجمال اور نظام کائنات کے ہزاروں مناظر دیکھنے کے باوجود انسان کے احساسات بیدار نہ ہوں اور وہ ان کے اسباب اور حکمتوں کی تلاش میں نہ پڑے، بلکہ غفلت و بے پروائی سے ان کے پاس سے گزر جائے تو یہ روح اور احساسات کی پژمردگی اور بصیرت سے محرومی کی علامت ہے۔ اسرار سے بھری کائنات ایسے لوگوں کے لیے کوئی معنی رکھتی ہے اور نہ ہی انسانی نفس کی دنیا ان کی آنکھوں کے سامنے ورق ورق کرکے کھلتی ہے: ﴿وَكَأَيِّن مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ﴾ (یوسف: ۱۰۵) "اور آسمان و زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں، جن پر سے یہ گزرتے ہیں اور ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔" وہ ماضی کے واقعات سے استفادہ کرتے ہیں اور نہ ہی آنے والے اور گزشتہ واقعات سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔

جو شخص اپنے گرد و پیش میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کو سمجھتا اور محسوس کرتا ہے اور کائنات اور اس میں پوشیدہ رازوں کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کرتا ہے وہ بحر بے کراں میں کشتی رانی کرنے والے شخص کی مانند ہے۔ وہ اپنی سیاحت کے دوران گنجینہ ہائے اسرار کا سراغ پاتا ہے۔ جب بھی اس کی روح و قلب، پاکیزہ جذبات اور تیز ذہن ان اسرار کے چشمہ صافی سے سیراب ہوتے ہیں اسے ہر طرف معلق باغات دکھائی دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں اس کے افکار کی دنیا فردوس بریں کا نمونہ پیش کرنے لگتی ہے، لیکن جس شخص کی اس فہم اور حقیقت تک رسائی نہیں ہوتی وہ ہمیشہ گھٹن، بیزاری اور زندگی کی یکسانیت کا شکوہ کرتا دکھائی دیتا ہے، کیونکہ وہ جن چیزوں کو دیکھنے کا عادی بن چکا ہے ان کی قید سے رہائی نہیں پاسکا۔ ایسے لوگوں کے لیے ہر چیز بدنظمی، تاریکی اور بے معنی ہوتی ہے: ﴿وَإِن يَرَوۡاْ كُلَّ آيَةٍ لاَّ يُؤۡمِنُواْ بِهَا﴾ (الأعراف: ۱۴۶) ''اور اگر یہ سب نشانیاں بھی دیکھ لیں تب بھی ان پر ایمان نہ لائیں۔'' ان کی عقلوں پر تالے اور دلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں: ﴿وَعَلَى سَمۡعِهِمۡ وَعَلَى أَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ﴾ (البقرۃ: ۷) ''اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔'' ایسے لوگوں سے کسی خیر یا بھلائی کی توقع رکھنا فضول ہے۔

بعض اوقات معرفت و مشاہدہ یا کم از کم جسے لوگ معرفت و مشاہدہ سمجھتے ہیں، کے بعد بھی لوگ اِلفت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں سوال اسی نکتے پر پیدا ہوتا ہے، یعنی بعض لوگ تھوڑی سی معلومات اور معرفت حاصل ہونے پر یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ وہ سب کچھ جان چکے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ اِلفت و عادت کے زیر اثر دنیا میں رونما ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں کو محسوس کر پاتے ہیں اور نہ ہی لحہ بہ لحہ تغیر پذیر اور غور و فکر، عبرت اور قلب و روح کی گہرائی و گیرائی میں زیادتی کی طرف دعوت دینے والے عالم حسن و جمال پر توجہ دے سکتے ہیں، دوسرے لفظوں میں وہ بے حس ہو جاتے ہیں اور انہیں کسی بھی چیز سے عبرت حاصل نہیں ہوتی۔ یہ درحقیقت انسان کے انحطاط اور اس کے احساسات و جذبات کی موت کی علامت ہے۔ (خدا اپنی پناہ میں رکھے!)

اگر ایسا شخص جلد اپنی آنکھوں سے پردہ نہ ہٹائے، اپنے گرد و پیش میں موجود اشیاء کے اسرار و حکم پر غور و فکر کرنا شروع نہ کرے اور دھیان سے ملائے اعلیٰ اور خدائی پیغامات و اشارات

کی طرف کان لگا کر انہیں سمجھنے کی کوشش نہ کرے تو اس کا لازمی نتیجہ روحانی موت اور باطنی فساد کی صورت میں نکلتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کائنات کے خالق خدائے تعالیٰ وقتاً فوقتاً انبیائے کرام کو واضح معجزات دے کر بھیجتے رہے ہیں، جنہوں نے غفلت میں پڑے لوگوں کو جھنجھوڑا، ان کی آنکھوں کو بینائی اور دلوں کو معرفت و اطمینان کی دولت عطا کی اور اِلفت وعادت کے ہاتھوں گرفتار لوگوں کی عقلوں اور ضمیروں کو بیدار کر کے انہیں زمین وآسمان کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں متعدد مقامات پر مختلف اسالیب میں بتایا ہے کہ انہوں نے کیسے حضرت انسان کو پیدا کر کے زمین پر خلیفہ بنایا اور اس کے سکون کی خاطر اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے رحمت و محبت کے جذبات رکھ دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل نظر کو زمین وآسمان کی نشانیوں، اپنی مخلوقات کی عظمت، اقوام عالم کے رنگوں اور زبانوں کے اختلاف، دن رات کے آنے جانے اور برق وباراں کی صورت میں اپنے انعامات پر غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ غور و فکر اور نصیحت حاصل کرنے کی اس قدر دعوت وترغیب کے بعد کسی قسم کی اِلفت وعادت کی گنجائش باقی نہیں رہتی: ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنتُم بَشَرٌ تَنتَشِرُونَ ○ وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ○ وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ ○ وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُم مِّن فَضْلِهِ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ ○ وَمِنْ آيَاتِهِ يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفاً وَطَمَعاً وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيُحْيِي بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ (الروم: ۲۰۔۲۴) ”اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر اب تم انسان ہو کر جابجا پھیل رہے ہو اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تا کہ ان کی طرف مائل ہو کر آرام حاصل کرو اور تم میں محبت اور مہربانی

پیدا کر دی۔ جو لوگ غور کرتے ہیں ان کے لئے ان باتوں میں بہت سی نشانیاں ہیں اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔ اہل دانش کے لئے ان باتوں میں بہت سی نشانیاں ہیں اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا دن اور رات میں سونا اور اس کے فضل کو تلاش کرنا۔ جو لوگ سنتے ہیں ان کے لئے ان باتوں میں بہت سی نشانیاں ہیں اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تم کو خوف اور امید دلانے کے لئے بجلی دکھاتا ہے اور آسمان سے بارش برساتا ہے پھر زمین کو اس کے مر جانے کے بعد دوبارہ زندہ و شاداب کر دیتا ہے۔ عقل والوں کے لئے ان باتوں میں بہت سی نشانیاں ہیں۔" یہ آسمانی وضاحت کائنات میں وقوع پذیر ہزاروں معجزات اور خارق العادت واقعات پر غور و فکر کرنے کی سینکڑوں بار ترغیب اور دعوت دے کر اِلفت کے جواز کو ختم کر رہی ہے، لیکن اس کے باوجود ایسے لوگ پائے جاتے ہیں، جو اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات اور نشانیوں کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان پر غور و فکر کر سکتے ہیں۔ ان کی حالت اس مچھلی جیسی ہے، جو سمندر میں رہنے کے باوجود اس سے ناآشنا رہتی ہے۔

اِلفت کی ایک صورت اور بھی ہے اور وہ ہے فکر، سوچ اور تصور میں اِلفت۔ اس کے انسان کے طرز عمل اور عبادت پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس قسم کی اِلفت اور عادت سے انسان کے وجد و عشق کے جذبات مردہ ہو جاتے ہیں اور وہ احساس ذمہ داری، گناہ سے نفرت اور معاصی پر آنسو بہانے کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے۔ ایسے انسان کی پہلی کیفیت کو بحال کرنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ اسے پاکیزہ اور اچھے انداز میں نصیحت ہی کی جا سکتی ہے تاکہ وہ اپنی خودی کی طرف لوٹ کر اسے از سر نو دریافت کرے اور اپنے گرد و پیش کو متلاشی آنکھوں اور دلِ بینا سے دیکھے۔

اگر ہم انسان کی شخصیت اور روح کی تعمیر نو کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے اس میں مذکورہ بالا اوصاف پیدا کرنا ناگزیر ہے۔ یہ درست ہے کہ انسان میں جمود کی طرف میلان پایا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے دل کا احیائے نو ناممکن نہیں۔ اس کے لیے اتنا کافی ہے کہ کوئی نشتر سے اس کے جمود کو روک دے تاکہ اس کا خون پھر سے گردش کرنے لگے: ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا

الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾
(الحدید: ۱۶) ”کیا ابھی تک مؤمنوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ اللہ کی یاد کرنے کے وقت اور قرآن جو حق کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کے سننے کے وقت ان کے دل نرم ہو جائیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے پہلے کتابیں دی گئی تھیں پھر ان پر طویل عرصہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔“

حاصل یہ کہ الفت انسان کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت ہے، جس میں بہت سے لوگ گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس میں مبتلا شخص اپنے گردوپیش کے واقعات سے بے خبر رہتا ہے، وہ کتاب فطرت کے حسن و جمال کو دیکھتا ہے اور نہ ہی واقعات کی زبانی حق کی آواز سن پاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا ایمان سطحی اور ناکافی اور اس کی عبادت وجد و کیف سے خالی ہو جاتی ہے اور انسانوں کے ساتھ معاملات میں اسے کسی نگران و محاسب کا خوف نہیں رہتا۔ ایسے شخص کی الفت سے چھٹکارے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اسے نئی سماعت اور بصارت عطا کرنے کے لیے خصوصی توجہ دی جائے۔

جو شخص اِلفت کے چنگل میں پھنس جائے اسے انفس و آفاق میں غور و فکر کرنے، موت کو یاد کرنے، آخرت کا مشاہدہ کرنے، دینی خدمات سر انجام دینے والے اداروں میں جانے، ایمانی خدمات اور وظائف سر انجام دینے، مسلمانوں کے درخشاں ماضی سے واقفیت حاصل کرنے اور اپنی روحانی کیفیات کی تجدید کے لیے فکر و ثقافت کے حامل صاحب وجد و حال لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان تجاویز کے علاوہ اور بھی مفید تجاویز پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن چونکہ اوپر ذکر کردہ معروضات اس موضوع کے مختصر تعارف کے لیے کافی ہیں، اس لیے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے دلوں سے اِلفت کے مضر اثرات کو زائل فرمادے۔ بلاشبہ تمام دل اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

کیا ایتھر کا وجود ہے؟ اگر ہے تو اس کی حقیقت کیا ہے؟

ایتھر کا وجود یقینی نہیں ہے، لیکن چونکہ بعض قابل احترام سائنسدانوں نے بعض مثالوں کی ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے، اس لیے ہم محتاط انداز میں اس موضوع پر گفتگو کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔

Christaan Huygens(۱۹۲۶ء۔۱۶۹۵ء) نے سب سے پہلے بغیر جزم کے ایتھر کو بہت ہی لطیف ماہیت کے حامل ایسے مادے کی حیثیت سے پیش کیا، جو ہر چیز میں سرایت کیے ہوئے ہے، لیکن جونہی ماکس ویل(Maxwell) نے اس نظریئے کی تائید کی "خلائے بسیط کا نظریہ" اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ ماکس ویل کہتا ہے: "الیکٹرومیگناٹک (Electromagnetic) " مظہر کے اثبات سے ایتھر کی صورت میں کسی نہ کسی واسطے کی ضرورت جنم لیتی ہے۔" دوسرے لفظوں میں عالم اکبر (کائنات) سے لے کر عالم اصغر (ایٹم) تک ہر چیز ایتھر کے ضمن میں حرکت کرتی ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس دریافت کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ روشنی کی لہریں محض الیکٹرومیگناٹک لہریں ہیں یا یوں کہیں کہ روشنی کا مظہر دراصل الیکٹرومیگناٹک مظہر ہے۔ درحقیقت یہ دریافت مظاہر فطرت کی وحدت کی طرف پہلا قدم سمجھا جاتا ہے۔

درحقیقت "مائیکل فریڈے"(Michael Faraday)"ماکس ویل" سے بھی پہلے یہ کہہ چکا تھا کہ الیکٹرومیگناٹک لہریں خلا میں نقل و حرکت نہیں کر سکتیں، لہٰذا انہیں نقل و حرکت کے لیے کسی واسطے کی ضرورت ہے۔ اپنے دریافت کردہ قوانین میں اس نے لکھا ہے کہ یہ لہریں عرضی لہریں ہیں جو انعطاف، تکسر اور مرکب تکسر کے اعتبار سے روشنی کی خصوصیات رکھتی ہیں، جبکہ ماکس ویل کا دعوی یہ ہے کہ روشنی کسی قدر چھوٹی الیکٹرومیگناٹک لہروں کا ہی نام ہے۔ اس کے بعد "ہرٹز(Hertz)" نے متعدد تجربات سے مکس ویل کے نظریئے کی تائید کی، کیونکہ اس نے مشاہدہ کیا کہ جب وہ کمرے کے کسی بھی کونے میں برقی رو چھوڑتا ہے تو کمرے کے دوسرے

کونے میں رکھے برقی دورے میں دونوں کے درمیان کسی قسم کے ربط کے نہ ہونے کے باوجود فوراً بجلی کے شرارے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بقول ان لہروں کی رفتار روشنی کی رفتار جتنی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان لہروں کو "ہرٹزی لہریں (Hertzian waves)" کہا جاتا ہے۔ بعد میں یہی نظریہ ریڈیو، وائرلیس اور ٹیلی فون کی دریافت کی بنیاد بنا۔

ایتھر کے نظریئے کے مقبول ہو جانے کے کافی عرصہ بعد "مورلے (Morley)" اور مچلسن (Michelson) نے تجربات کی روشنی میں ایتھر کے وجود کو پرکھنا چاہا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے درج ذیل تجربہ کیا: "اگر ہم دو شعاعیں ڈالیں۔ ایک زمین کی حرکت کے رُخ پر اور دوسری عمودی رُخ پر اور آئینے کے ذریعے ان شعاعوں کو تجربے کا مشاہدہ کرنے والے کی آنکھ پر منعطف کریں، تو زمین کی حرکت کے رُخ پر ڈالی گئی شعاع کو زمین کی حرکت سے عمودی رُخ پر ڈالی گئی شعاع کی بہ نسبت دیر سے اپنی منزل پر پہنچنا چاہیے، کیونکہ اسے زمین کی حرکت کے مخالف رُخ پر ایتھر کے بہاؤ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے، لیکن ان کی یہ توقع پوری نہ ہوئی، کیونکہ دونوں شعاعیں ایک ہی لمحے میں بغیر کسی فرق کے اپنے مقام پر پہنچیں اور بار بار تجربہ دہرانے کے باوجود یہی نتیجہ نکلا۔ یہ ایتھر کے وجود کے خلاف ایک ثبوت تھا، جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ریڈیائی لہریں نقل و حرکت کے لیے کسی واسطے کی محتاج نہیں ہیں۔

اس نتیجے پر بعض لوگوں نے اعتراضات کیے۔ ان میں سے ایک لورنٹز (Lorentz) بھی تھا۔ لورنٹز نے یہ اصول دریافت کیا کہ حرکت کے رخ پر اجسام اپنے طول کا کچھ حصہ کھو بیٹھتے ہیں اور مورلے اور مچلسن کے تجربے میں یہی اصول کارفرما تھا۔ اس نے ریاضی کے اصولوں سے دو شعاعوں کے ایک ہی وقت میں مرکز یا مشاہدہ کرنے والے کی آنکھ تک پہنچنے کو ثابت کیا۔ اس وقت اس اعتراض کو کافی وزنی سمجھا گیا، تاہم یہ بات سمجھنے کی ہے کہ مچلسن جس چیز کے وجود کو ثابت کرنا چاہتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور لورنٹز جس ایتھر کے وجود کا قائل ہے اس کی ماہیت کیا ہے؟

اول الذکر سائنسدان اپنے تجربے کی بنیاد پر ایتھر کے نہ ہونے کا قائل ہے، کیونکہ وہ ایتھر کو ایک کثیف چیز سمجھتا ہے یا کم از کم اسے کرۂ ارض پر محیط ہوا کے مشابہ قرار دیتا اور زمین پر محیط اس سیال مادے کی حرکت کو زمین کی حرکت کے مساوی قرار دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ ایک فرضی ایتھر کے تصور پر اپنے تجربات کر رہا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ایتھر کا وجود مادے سے ماوراء ہو یا ہمیں دکھائی دینے والے عالم کے مقابلے میں کوئی عالم غیب ہو۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس طرح ماضی میں بہت سے علمی رسائل نے ایتھر کے موضوع پر مقالات شائع کئے ہیں، اسی طرح آج بھی ایتھر کے بارے میں متعدد مقالات شائع ہو رہے ہیں۔

حاصل یہ کہ مشاہدے اور تجربے پر مبنی حکم کی عدم موجودگی کے باوجود جلدبازی میں اس کے وجود کی نفی کرنا درست نہیں، کیونکہ ہمیں اس کے وجود یا عدم وجود کے بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں۔

ہر چیز کی انتہا موت کیوں ہے؟

قادر مطلق خالق کی صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ کائنات کی خوبصورت ترین مخلوقات کو انتہائی سادہ اور معمولی اشیاء سے پیدا کرتے ہیں اور ہر چیز میں مسلسل اور بلا اسراف تجدید نو کرتے ہوئے اسے تکمیل کی طرف لے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ساری کائنات میں بالکل ایسے ہی غروب کے بعد طلوع ہوتا ہے، جیسے رات دن ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہیں۔ اس حیرت انگیز نظام کے تحت نئے ثمرات اور تروتازگی حاصل ہوتی ہے۔ سورج اور ہماری زمین کا تعلق اور موت وحیات کے درمیان ربط بھی اسی نظام کا حصہ ہے۔

آئندہ سطور میں ہم ان موضوعات پر گفتگو کریں گے، لیکن سب سے پہلے موت کے بارے میں چند معروضات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ موت اشیاء کی طبعی انتہا اور خاتمہ ہے اور نہ ہی دائمی فنا اور عدم۔ یہ انتقال مکان، کیفیت کی تبدیلی، ابعاد کے تغیر اور ذمہ داریوں کے بوجھ سے نجات پاکر راحت ورحمت کے حصول سے عبارت ہے، بلکہ بعض اعتبار سے یہ ہر چیز کے اپنی اصل حقیقت کی طرف لوٹنے کا نام ہے، یہی وجہ ہے کہ موت میں زندگی جیسی کشش ہے اور اس کا سامنا کرکے دوست احباب کی ملاقات جیسی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ یہ ابدی زندگی کے حصول کا ذریعہ ہے، اس لیے یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ موت کی اس حقیقت سے ناآشنا مادہ پرست لوگوں نے ہمیشہ موت کو خوفناک صورت میں پیش کیا ہے اور اس کے بارے میں اندوہ ناک مرثیے پڑھے ہیں۔ موت کی حقیقت سے ناواقف لوگوں کی ماضی میں بھی یہی کیفیت تھی اور آج بھی یہی حالت ہے۔

یہ درست ہے کہ جدائی کا سبب ہونے کی وجہ سے عقلی اور انسانی پہلو سے موت ایک المناک حادثہ سمجھی جاتی ہے، لہٰذا موت کے اثرات کا انکار ممکن ہے اور نہ ہی دل کی آواز کو دبایا جا

سکتا ہے، خصوصاً نرم دل اور حساس طبیعت کے مالک لوگوں کے جذبات کو موت بری طرح سے متاثر کرتی ہے، گو اکثر یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے حق میں بعث بعد الموت کا عقیدہ ایسے ہی ہے جیسے کسی فقیر کو بادشاہت یا پھانسی کے مجرم کو ابدی زندگی مل جائے۔ یہ عقیدہ ایسے لوگوں کے ہر غم کو دور کر کے انہیں عظیم سعادت عطا کر سکتا ہے۔

موت کی حقیقت کا ادراک رکھنے والوں کے لیے موت جگہ کی تبدیلی، رخصت اور ایک ایسے جہاں کی سیاحت سے عبارت ہے، جہاں انسان کی اپنے ننانوے فیصد دوست احباب سے ملاقات ہوگی، لیکن جو لوگ موت کی حقیقت سے ناواقف ہیں اور انہوں نے اس کا صرف ظاہری خوفناک چہرہ دیکھا ہے، ان کے لیے یہی موت جلاد، تختہ دار، اندھے کنویں اور تاریک رستے سے کم نہیں۔

جو لوگ موت کو دائمی زندگی کا آغاز سمجھتے ہیں انہیں جب بھی موت کی باد نسیم کے جھونکے محسوس ہوتے ہیں ان کی آنکھوں کے سامنے جنت کے حسین مناظر گھوم جاتے ہیں، لیکن اس عقیدے کے حسن سے محروم کافر موت کا خیال آنے پر خوف سے کانپ اٹھتا ہے۔ اگر یہ معاملہ صرف اس کی ذات تک محدود رہتا تو بھی اس کا غم کچھ ہلکا ہو جاتا، لیکن وہ اپنے غم میں ان لوگوں کے غموں کو بھی شامل کر لیتا ہے، جن کی غمی خوشی میں وہ شریک ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کا دل غموں کا مرکز بن جاتا ہے، لیکن مؤمن کے نزدیک کسی بھی چیز کی موت دنیا کی مشقتوں اور تکلیفوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے اور ارفع و اعلیٰ ماہیت حاصل کر کے دوسرے جہاں میں مثالی انداز سے حیاتِ جاوید پانے کے مترادف ہے۔

چونکہ موت ابدی زندگی کی کلی کے چٹخنے اور دنیا کی زندگی کے مصائب سے خلاصی پانے کا نام ہے، اس لیے یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت اور گرانقدر تحفہ ہے۔ ہر کمال، ترقی اور نعمت صفائی کرنے والے بعض ایسے آلات سے گزرنے پر موقوف ہے، جو انہیں ایک نئی صورت عطا کرتے ہیں، بلکہ تمام موجودات پگھلنے اور صفائی کے ان مراحل سے گزر کر پہلے سے بلند مقام

حاصل کرتے ہیں، مثلاً سونے اور لوہے کی دھاتیں پگھلے بغیر اپنی حقیقی صورت نہیں اختیار کر سکتیں۔ جب تک وہ موت کے مشابہ اس عمل سے نہیں گزرتیں ان کی حیثیت مٹی اور پتھر کی سی رہتی ہے۔ جب ہم دوسری اشیاء کو سونے اور لوہے پر قیاس کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز کی زندگی میں غروب ہونے، پگھلنے، ختم ہونے اور معدوم و فنا ہونے کا مرحلہ آتا ہے، لیکن در حقیقت یہ مرحلہ ارفع و اعلیٰ حالت کی طرف منتقل ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

ہوا کے ذرات سے لے کر پانی، جڑی بوٹیوں، درختوں اور جانداروں کے خلیوں تک ہر چیز بے تابی سے موت کی طرف دوڑ رہی ہے، کیونکہ اس میں ان کا کمال مضمر ہے۔ جب آکسیجن اور ہائیڈروجن کا اتحاد ہوتا ہے تو وہ دونوں اپنی سابقہ خصوصیات کھو کر موت کا شکار ہو جاتی ہیں، لیکن اس کے نتیجے میں زندگی کا اہم ترین عنصر پانی وجود میں آتا ہے اور اس طرح ان دونوں کی بہتر صورت میں نئی بعثت ہوتی ہے۔

اسی لیے ہم نظروں سے اوجھل ہونے اور جگہ اور کیفیت کی تبدیلی پر موت کا اطلاق کرتے ہیں، لیکن ہم یہ نہیں کہتے کہ موت عدم یا فنا کا نام ہے۔ ایسا کہنا ممکن بھی نہیں، کیونکہ چھوٹے چھوٹے ذرات سے لے کر بڑے بڑے اجرام فلکی تک کائنات میں ہونے والا ہر واقعہ ہر تبدیلی اور ہر ٹوٹ پھوٹ پہلے سے بہتر اور خوب تر صورت پر منتج ہوتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام موجودات محو سفر ہیں، لیکن یہ سفر عدم کی طرف نہیں ہے۔

مالک الملک کی نظر میں موت ذمہ داری کی تبدیلی کا نام ہے۔ ہر چیز کو اس کے خالق کی طرف سے مخصوص ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ جب اس کی ذمہ داری کے مقاصد پورے ہو جاتے ہیں تو وہ کسی دوسری مخلوق کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے، تاکہ دنیا کے اس اسٹیج پر تمام امور ایک ہی ڈگر پر نہ چلتے رہیں، بلکہ نئے اور بہتر لوگ آکر اس میں نئی روح اور نشاط پیدا کریں۔ اس طرح موجودات دنیا کے اسٹیج پر جلوہ نما ہو کر اپنا کردار ادا کرتی ہیں اور جو انہیں کہنا ہوتا ہے کہہ کر پردے کے پیچھے غائب ہو جاتی ہیں، تاکہ دوسروں کو بھی سامنے آکر اپنا کردار ادا کرنے اور اپنی

آواز سنانے کا موقع مل سکے۔ کسی نے درست کہا ہے: "من أتى سيذهب و من حلّ سيرحل" (جو آیا ہے، اسے بالآخر جانا ہے اور جو ٹھہرا ہے اسے بالآخر رخت سفر باندھنا ہے۔) اس آمدورفت اور طلوع وغروب کے ذریعے کائنات میں نئی زندگی اور نشاط پیدا ہوتا ہے اور ہر چیز کی تجدید ہوتی ہے۔

ایک اور پہلو سے موت میں نصیحت کا بڑا سامان ہے۔ وہ انسان کو یاد دلاتی رہتی ہے کہ کائنات کی کوئی بھی چیز خود سے قائم نہیں، بلکہ ہر چیز ٹمٹماتے چراغوں کی مانند کبھی نہ گل ہونے والے ابدی آفتاب کی نشاندہی اور زوال و فنا کے خوف سے لرزاں دلوں کی اطمینان و سکون کے رستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں دل میں کبھی نہ زائل اور فنا ہونے والے حبیب کی جستجو کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس احساس کا پیدا ہونا احساسات و جذبات کے عالم میں ابدیت کو پانے کی طرف پہلا قدم ہے، لہٰذا موت انسان کو اس پہلے مرحلے تک پہنچانے والے غیر مرئی زینے کی مانند ہے۔

موت کو فنا کے گھاٹ اتارنے والی تلوار کی بجائے عمل جراحی کے ذریعے علاج کرنے والے دست شفقت کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے، بلکہ خود فنا اور زوال کو کوئی مستقل بالذات چیز سمجھنا بعض پہلوؤں سے درست نہیں، کیونکہ خالص عدم کا کوئی وجود نہیں، بلکہ ہمارے مشاہدے اور نگاہ کے تنگ دائرے سے غائب ہونے والی ہر چیز اپنی مثالی اور علمی صورت میں ہماری یاداشت، لوح محفوظ، ہر چیز پر محیط وسیع علم کے دائرے، مختلف ابعاد اور ان ابعاد سے ماورا جہانوں میں ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔ ہر چیز اس بیج کی مانند ہے جو پھٹ کر خوبصورت پھول بن جاتا ہے اور بالآخر مرجھا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود اپنے وجود اور ماہیت کو ہزاروں خوشوں اور کلیوں کے ضمن میں ہمیشہ برقرار رکھتا ہے۔ اب ہم اس کا ایک اور پہلو سے جائزہ لیتے ہیں۔

اگر ہر چیز کا انجام موت کی بجائے زندگی ہی ہوتا اور وہ فنا اور زوال کی بجائے اپنے وجود کو ہمیشہ برقرار رکھتی تو ایسی صورت میں دنیا کی کیا حالت ہوتی؟ اگرچہ اوپر ذکر کردہ دلائل یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ موت رحمت اور حکمت کا تقاضا ہے، لیکن ہم اس سے بڑھ کر یہ بھی

کہتے ہیں ہر پہلو سے زندگی کا دوام اور موت کا عدم وقوع ایک ایسی خوفناک صورت حال ہے کہ اگر اس کی صحیح منظر کشی اور تصور ممکن ہو تو لوگ موت کی بجائے ایسے دوام سے تنگ آکر آہ وبکا کرنے لگیں۔

ایک لمحے کے لیے سوچیں کہ اگر کوئی بھی چیز نہ مرتی تو زندگی کے ابتدائی ادوار میں بھی انسان تو درکنار ایک مکھی کو بھی رہنے کے لیے جگہ نصیب نہ ہوتی۔ حیوانات میں سے چیونٹیاں اور نباتات میں سے بیلیں ہی تھوڑے سے عرصے میں سارے جہاں کو اپنے وجود سے بھر دینے کے لیے کافی ہوتیں۔ اگر وہ موت اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہوتیں تو روئے زمین پر ایک بالشت بھی خالی جگہ نہ رہتی، بلکہ چیونٹیوں اور بیلوں کی کثرت کی وجہ سے ان کے سطحِ زمین سے سینکڑوں میٹر بلند ڈھیر لگ جاتے۔ اس قدر ہولناک منظر کا تصور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ موت اور اشیاء کا تحلیل ہونا کس قدر باعث رحمت اور پر حکمت نظام ہے۔

کیا ہم ایسی صورت میں کائنات کے اس قدر حسین اور دلفریب مناظر دیکھ سکتے؟ چیونٹیوں اور بیلوں کی اس قدر بہتات میں اس حسن وجمال کا کتنا حصہ دکھائی دیتا؟ وہاں تو صرف چیونٹیوں اور بیلوں کے ڈھیر نظر آتے۔ کیا جس انسان کی خاطر اس خوشنما کائنات کو مسخر کیا گیا ہے وہ ایسے بد نما ماحول میں رہ سکتا؟ اس کے لیے ایسا کرنا قطعاً ممکن نہ ہوتا، بلکہ ایسی گندی جگہ سے تو ادنیٰ ترین مخلوق بھی بھاگنے پر مجبور ہو جاتی۔

اس کائنات کے نظام میں ایسی حکمت کار فرما ہے کہ اس کا ایک ذرہ بھی بے فائدہ یا زائد از ضرورت نہیں۔ کامل ترین حکمت کے مالک گھٹیا ترین اشیاء سے قیمتی اور خوبصورت ترین چیزوں کو وجود بخشتے ہیں، لہٰذا ان کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی چیز کو بے فائدہ بنائیں گے، بلکہ وہ کسی بھی چیز کے باقی ماندہ بے وقعت اجزاء کو کسی دوسرے مقام پر نئے جہان بنانے کے لیے استعمال کریں گے اور اپنی طرف اٹھائی جانے والی روحوں، خصوصاً انسانی روحوں کو بہترین

استعمال میں لا کر ان سے نئی اور عمدہ مخلوقات وجود میں لائیں گے۔ جس مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے عزت بخشی اور اسے اپنی تقدیر، انعامات اور تخلیق وایجاد کا مظہر بنایا، اسے اس طرح نظر انداز کرنا اس کی لامتناہی حکمت کے شایاں نہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے اقدام سے یقیناً بری ہیں۔

حاصل یہ کہ دلِ بینا رکھنے والے تمام سلیم العقل لوگ ہر چیز کو نظم ونسق اور ترتیب کے لحاظ سے اپنے اپنے مقام پر اس قدر ٹھیک ٹھیک پاتے ہیں کہ ان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور ان کے دلوں پر کائنات کے حسن وجمال کو تعبیر کرنے کے لیے الہام ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں ذرات کی حرکت اور ٹوٹ پھوٹ سے لے کر نباتات اور جڑی بوٹیوں کی نشوونما، دریاؤں کے سمندروں میں گرنے اور پانی کے بادلوں میں تحلیل ہو کر بارش کی صورت میں دوبارہ زمین پر برسنے تک ہر چیز مسلسل ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف گامزن ہے۔ کسی شاعر نے درست کہا ہے:

ذہن وفکر کو جھنجھوڑنے والی یہ دنیا بھی کس قدر عجیب ہے!
ہر لمحہ قدرت کی کرشمہ سازیاں میرے سامنے ظہور پذیر
ہیں۔ حق تعالیٰ آسمان سے جو چیز بھی نازل فرماتے ہیں
وہ آسمانی نشانی ہے۔ جڑی بوٹیاں، سمندر، پہاڑ اور بہار
کی آمد سب کے سب رنگوں کے پیچھے چھپے انورات ہیں۔
اس دنیا میں پیدا ہونے والا کوئی بھی شخص اس حقیقت کو
محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کافر اور منکرِ خدا سے گفتگو کا آغاز کیسے کرنا چاہیے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے کچھ امور کی وضاحت کرنا مفید معلوم ہوتا ہے :

خدا کے انکار اور منکرین کی کئی اقسام ہیں۔ مخصوص معتقدات، ایمان کے بارے میں طرز عمل اور ایمانی مسائل کے بارے میں ایمان یا کفر کی سطح کے نتیجے میں ایمان یا کفر کے متعدد درجات وجود میں آتے ہیں۔ جس طرح ایمان کی بنیادی تعلیمات کے بارے میں لاپروائی کا مظاہرہ کرنے والا شخص ان کا انکار کرنے والے سے مختلف ہوتا ہے، اسی طرح یہ دونوں شخص ایسے شخص سے مختلف ہیں جو تمام ارکان ایمان کا بالکلیہ انکار کرتا ہے اور کسی کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں انکارِ خدا کی انواع کی درج ذیل ترتیب سے درجہ بندی کی جاسکتی ہے:

انکار کی ایک قسم ایمانی تعلیمات سے لاپروائی برتنے کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔ انکار کی یہ قسم کسی فکر یا مقصد و ارادے پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا سبب بے توجہی ہے۔ عام طور پر اس قسم کا انکار خواہشات کی پیروی کرنے والے ایسے کم عقل لوگوں میں دیکھنے میں آتا ہے، جنہیں منطقی انداز سے سوچنے کی عادت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو ایمانی تعلیمات دینا اور سمجھانا نہ صرف مشکل، بلکہ بعض اوقات ناممکن ہوتا ہے۔ ان کا طرز عمل بھیڑ چال سے متصف ہوتا ہے۔ وہ اکثریت کے ساتھ چلتے ہیں اور معاشرتی دباؤ کے مطابق طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو ایمان کی بنیادی تعلیمات قبول نہیں کرتے۔ ان کے انکار کا سبب کچھ بھی ہو انہیں کافر و بے دین ہی سمجھا جائے گا۔ معاشرے کے اکثر و بیشتر بے دین اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے، جو ان باتوں کو قبول نہیں کرتے، جنہیں قبول کرنے کی ایمان دعوت دیتا ہے۔ ماضی کی بہ نسبت دورِ حاضر میں ایسے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ آخری دو قسم کے ملحدین کو مزید دو ذیلی اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

الف : وہ ملحدین جو ہر چیز کا سبب مادے کو قرار دیتے ہیں اور کسی بھی مابعد الطبیعات بات پر ایمان نہیں رکھتے۔

ب : دوسری قسم کے ملحدین وہ ہیں جو بعض مابعد الطبیعات اور روحانی مظاہر کو تسلیم کرتے ہیں۔

انکارِ خدا جابر اور سرکش انسانوں کی اہم ترین خصوصیت اور دورِ حاضر میں نوجوانوں کو درپیش بحران کا اہم ترین سبب ہے۔ انکارِ خدا بدامنی، بربادی اور مصائب کا بنیادی سرچشمہ اور سبب ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ انسانیت کے لیے سب سے زیادہ منحوس اور تاریک دور انکارِ خدا اور ایمان سے دوری کا دور رہا ہے۔ سب سے پہلے نشاۃ ثانیہ اور انقلابِ فرانس کے راہنماؤں نے انکارِ خدا کا علم بلند کیا اور اس کی اشاعت کی۔ ان کے بعد آنے والوں نے اسے مستقل دین کی حیثیت سے قبول کر لیا، جس کے نتیجے میں اسے فروغ ملا، یہاں تک کہ آج اسے دنیا کے کئی حصوں پر غلبہ حاصل ہے۔(19)

دورِ حاضر میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انکارِ خدا محض ایک وحشیانہ اور جنونی فلسفہ ہے۔ معاشرتی اور اقتصادی علوم کی بہ نسبت علم نفسیات کو اس پر زیادہ توجہ دینی چاہیے، کیونکہ جب ہم ذہنی امراض اور نفسیاتی مریضوں کی مختلف اقسام کا دورِ حاضر کے دہریوں سے موازنہ کرتے ہیں تو ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ الحاد ایک نفسیاتی مرض ہے، جس پر علم نفسیات کو توجہ دینی چاہیے۔

اگرچہ یہ میرا اختصاصی موضوع ہے اور نہ ہی اس کا اوپر ذکر کردہ سوال سے براہ راست تعلق ہے، لیکن چونکہ ہم نے الحاد کی سادہ سی تقسیم کی ہے، اس لیے ہم یہ کہنا مناسب سمجھتے ہیں کہ ایمان کی طرح الحاد کے بھی مختلف مراتب اور درجات ہوتے ہیں۔ منکرِ خدا کو کہی جانے والی ہر بات میں اس کے مرض کا علاج اور شفا نہیں ہوتی، بلکہ منکرین خدا کی مختلف اقسام میں سے ہر قسم کے ساتھ علیحدہ برتاؤ کیا جانا چاہیے اور اس کے تقاضوں کے مطابق اس کی راہنمائی کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے، لہٰذا منکرین خدا کے انکار کے اختلاف کے مطابق ان کی اصلاح و ارشاد کے اصول بھی

مختلف ہونے چاہئیں۔ اصلاح وارشاد کو بارآور بنانے کے لیے سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ منکر خدا کا اوپر ذکر کردہ اقسام میں سے کس قسم سے تعلق ہے۔ جب یہ مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہو جائے گا تو اس بات کی بھی کسی حد تک وضاحت ہو جائے گی کہ اس کی اصلاح کے لیے کیا بات کہنی چاہیے۔ ذیل میں اس بارے میں کچھ ضروری ہدایات ذکر کی جاتی ہیں۔

۱۔ مخاطب کے انکار کی نوعیت معلوم کی جائے کہ اس کا انکار کلی نوعیت کا ہے یا اس کا تعلق صرف بعض ارکانِ ایمان سے ہے، تا کہ ہم صرف انہی نقاط پر توجہ مرکوز کر کے انہیں زیادہ اہمیت دے سکیں، نیز مخاطب کے انکار کی نوعیت کا جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اگر مخاطب لاپروائی یا اندھے تعصب میں مبتلا ہے تو ہم وقت اور محنت کو فضول ضائع نہ کریں۔

۲۔ مخاطب کے ساتھ اس کے فہم کے مطابق گفتگو کرنے کے لئے اس کے معاشرتی اور علمی مقام کا جاننا بھی بہت اہم ہے۔ مشاہدہ ہے کہ انسان اپنے سے کم تعلیم یافتہ شخص کی بات پر کان نہیں دھرتا، بلکہ اس پر منفی ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ خود پسندی اور انا پرستی کے اس دور میں کسی کو قائل کرنا یا کوئی بات سمجھانا بہت مشکل ہے۔ یہ دشواری اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب مخاطب پڑھا لکھا ہوا اور کچھ معلومات رکھتا ہو۔ ایسے لوگوں سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بات کرنے والے کا علمی معیار ان کے مساوی ہو، ان سے براہ راست گفتگو نہ کی جائے اور ان پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا جائے کہ وہ اس گفتگو کے مخاطب ہیں۔

مخاطب کے لیے قابل فہم زبان کا استعمال بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے فکری بگاڑ اور زبان پر پڑنے والے اس کے اثرات سے ہماری زبان کو اس قدر نقصان پہنچا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم اپنے وطن میں ایک ہی زبان استعمال کر رہے ہیں۔(20) ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینلز اور اخبارات اس زبان کی وحدت سازی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، لیکن مختلف نظریات کی پیروکار مختلف جماعتیں اپنے رسائل، کتابوں اور اخبارات میں ایک ہی

زبان کے مختلف اسالیب اور انداز استعمال کرتی ہیں،(21) جس کی وجہ سے بیچاری نئی نسل تذبذب کا شکار ہے۔

ترکی زبان کی مختلف اصطلاحات اور اسالیب نے نسلوں کے درمیان وسیع خلیج حائل کر دی ہے، لہٰذا ایسے لوگوں کے مناسبِ حال اسلوب اور زبان سے واقفیت بہت ضروری ہے، بصورتِ دیگر ان کے ساتھ گفتگو بہروں کے ساتھ گفتگو کے مانند ہو گی، دوسرے لفظوں میں ایسی اصطلاحات اور الفاظ استعمال کرنے چاہئیں جن سے فکر اور مقصد اچھی طرح واضح ہو جائے۔

۳۔ ہم جو بات مخاطب کو بتانا یا سمجھانا چاہتے ہیں اس کے بارے میں ہمیں گہری واقفیت ہونی چاہیے اور ہمارے ذہن میں متوقع سوالات کے تسلی بخش جوابات پہلے سے موجود ہونے چاہئیں، ورنہ چھوٹی سے غلطی یا لغزش سے سارا معاملہ تل پٹ ہو جائے گا۔ ہماری ناواقفیت اور عدم بصیرت کے ان اعلیٰ حقائق پر منفی اثرات پڑیں گے، جن کا ہم دفاع کرنا چاہتے ہیں اور مخاطب کی نظر میں ان کی قدر و منزلت ختم ہو جائے گی، جس سے منفی تاثر ملے گا اور مخاطب دوبارہ ایسی گفتگو میں شرکت سے گریز کرے گا۔

ایسی صورتحال پیدا کرنے والے کی نیت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو وہ شدید غلطی کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے۔ کتنے ہی نوجوان جاہل مرشدوں کی ناقص معلومات کے نتیجے میں بے دینی کی کھائی میں جا گرتے ہیں۔ پرانے دور کی ایک عوامی کہاوت ہے: "الامام الجاہل یذھب بالدین و الطبیب الجاہل یذھب بالروح" (جاہل امام کی وجہ سے دین کا خاتمہ اور جاہل طبیب کی وجہ سے جان کا خاتمہ ہوتا ہے۔) بلکہ جاہل امام کا نقصان جاہل طبیب سے کہیں بڑھ کر ہے، کیونکہ جاہل طبیب کا نقصان دنیا کی مختصر سی زندگی تک محدود ہوتا ہے، جبکہ جاہل امام لوگوں کی ابدی زندگی برباد کرتا ہے۔

۴۔ مناظرانہ اسلوب اختیار کرنے اور مخاطب کو خاموش کرانے کی کوشش کرنے سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ ایسا اسلوب اختیار کرنے سے ایک تو مخاطب کے انا پرستی کے

جذبات بھڑکتے ہیں دوسرے اس کا کوئی مثبت نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا۔ دلوں میں نورِ ایمان کا پیدا ہونا مرشد کے تعلق مع اللہ پر موقوف ہوتا ہے۔ ہدایت اللہ تعالیٰ کے چاہنے پر ملتی ہے، لہٰذا رضائے الٰہی کے حصول کی نیت کے بغیر غافل لوگوں کے اسلوب کے مطابق گرما گرم مباحثوں اور مناقشوں سے اگر مخاطب خاموش ہونے پر مجبور بھی ہو جائے تب بھی ان کے کوئی مثبت اثرات مرتب نہیں ہوتے، خصوصاً جبکہ ایسے بحث و مباحثے کا وقت پہلے سے طے ہو اور اعصابی تناؤ کی کیفیت میں اس کے لیے تیاری کی گئی ہو۔ ایسے لوگ مناظر کی بجائے مدمقابل کی حیثیت سے آتے ہیں۔ ان کے دل ایک دوسرے کے خلاف غیظ و غضب اور کینے سے بھرے ہوتے ہیں اور وہ اپنے سے پوچھے جانے والے تمام سوالات کے جوابات تلاش کر کے آتے ہیں۔ اس کے بعد جو صورت حال پیش آتی ہے وہ سب کو معلوم ہے... آپ اسے جو بات سمجھانا چاہتے ہیں وہ اسے رد کرنے کے لیے دوستوں سے مراجعت کرتا ہے، کتابیں کھنگالتا ہے اور ہر ممکن حیلہ اختیار کرتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ انکار خدا کے راستے میں ایک قدم اور آگے چلا جاتا ہے، گویا ایسی صورت میں مطلوبہ نتائج سے بالکل برعکس نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۵۔ مخاطب سے گفتگو کرتے ہوئے اس کے دل کی تاروں کو چھیڑنا چاہیے۔ ہر جملہ سچائی، محبت اور خلوص سے لبریز ہونا چاہیے اور گفتگو کے دوران مخاطب کی شخصیت اور اس کے افکار پر چوٹ مارنی چاہیے اور نہ ہی درشتگی کا اظہار کرنا چاہیے، ورنہ ہماری گفتگو کا اس پر کوئی اثر نہ ہو گا، بلکہ ممکن ہے کہ وہ ہمارا مخالف بن جائے۔ مرشد کو شفیق و مہربان طبیب کا سا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ اپنے مخاطب کو شفایاب کرنے کی کوشش کرے، اسے توجہ دے، اس کی بات غور سے سنے اور ایک سچے مکالمہ کرنے والے اور حقیقت کے متلاشی انسان کی مانند اس کے دردِ دل کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اگر ایسے ماحول میں بات کی جائے تو وہ آبِ زم زم کی طرح مخاطب کے دل میں اتر کر اسے پاک کر دیتی ہے۔ اس وقت کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں اس کے دل تک رسائی حاصل ہو گئی ہے۔

ہمیں مخاطب کے چہرے کے تاثرات پڑھ کر ان کے مطابق گفتگو کرنی چاہیے اور کسی ایسی بات کو نہیں دہرانا چاہیے، جس سے اسے تکلیف پہنچتی ہے۔

یہ بات ہمیں نہیں بھولنی چاہیے کہ جب مخاطب ہم سے جدا ہونے لگے تو اس کے دل پر ہماری گفتگو کی سچائی، ایک ایک عضو سے جھلکتے خلوص، دمکتے چہرے، مسکراہٹ اور محبت بھری نگاہوں کے اچھے اثرات موجود ہونے چاہئیں۔ اگر وہ ہم سے دوبارہ ملنے کی خواہش کا اظہار کرے تو ہمیں یقین ہو جانا چاہیے کہ ہم اس تک جو بات پہنچانا چاہتے تھے، اس کا اکثر حصہ اس تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

۶۔ ہمیں اپنے مخاطب کے غلط افکار اور نادرست تعبیرات پر ایسے انداز سے تنقید نہیں کرنی چاہیے کہ جس سے اس کی عزتِ نفس مجروح ہو یا دوسروں کے سامنے اس کی بے عزتی ہو۔ اگر ہمارا مقصود اس کے دل میں جگہ بنانا اور اس تک اپنی بات پہنچانا ہے تو ہمیں کھلے دل سے اپنی عزتِ نفس کے مجروح ہونے کو قبول کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم مخاطب کے جذبات کو مجروح کرکے اس سے اپنی کوئی بات نہیں منوا سکتے، بلکہ ایسا رویہ اسے ہم سے مزید دور کرنے کا باعث بنے گا۔

۷۔ بعض اوقات ایسے منکر کا صحیح العقائد اور روشن ضمیر احباب سے تعارف کرانا وعظ و نصیحت سے کہیں زیادہ مؤثر اور بہتر ہوتا ہے، لیکن یہ طریقہ ہر منکرِ خدا کے لیے مفید نہیں ہوتا، لہٰذا مرشد کو اپنے مخاطب کی نفسیات جان کر اس کے مطابق طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔

۸۔ لیکن اس کے برعکس ایسے شخص کو غیر سنجیدہ طرز عمل اور نادرست فکر کے حامل افراد سے متعارف ہونے سے بچانا چاہیے، نیز دینداری کے مدعی، لیکن عبادت کے عشق سے محروم اور فکری پراگندگی میں مبتلا افراد کو بھی ایسے شخص سے دور رکھنا چاہیے۔

۹۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ایسے شخص کو وقتاً فوقتاً اپنی بات کہنے اور اپنے جذبات کا اظہار کرنے کا موقع دیں، کیونکہ انسان ہونے کے ناطے اس کا احترام کرنا ضروری ہے۔ اگر انسان کے

عقیدے کی مضبوطی اور قطعیت کا رخ اس کے اپنے دل کی طرف ہو تو یہ عقیدے کی پختگی اور فضیلت کا باعث ہوتا ہے، لیکن اگر اس کا رخ باہر کی طرف خصوصاً جاہل شخص کی طرف ہو تو یہ نفرت پھیلانے اور افہام و تفہیم کے موقع کو ضائع کرنے کا باعث بنتا ہے۔

اگرچہ باطل افکار سننے سے دل مجروح اور فکر پراگندہ ہوتا ہے، لیکن اپنے مخاطب کا دل جیتنے کے لیے اس پر صبر کرتے ہوئے یہ کڑا گھونٹ پینا پڑے گا، بصورتِ دیگر اگر ہم نے اسے اپنی بات اور فکر کے اظہار کا موقع نہ دیا اور ساری نشست میں خود ہی گفتگو کرتے رہے تو ممکن ہے اسے اس میں سے کوئی بات بھی سمجھ میں نہ آئے۔ کتنے ہی مرشد حضرات اس سلسلے میں شہرت رکھتے ہیں اور لوگوں میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایسے مرشدوں کی حالت ایسی ہی ہے، جیسے کوئی پھٹے ہوئے مشکیزے یا چھلنی کے ذریعے پانی کو منتقل کرنا چاہے۔ ایسی صورت میں کوشش بسیار کے باوجود مثبت اثرات مرتب نہیں ہوتے، اس لیے جو لوگ دوسروں کی گفتگو سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کے آداب کا خیال رکھتے ہیں انہیں کامیابی نہیں ہوتی۔

۱۰۔ مرشد کو اپنی گفتگو کے دوران اس بات کا اظہار کرنا چاہیے کہ وہ جن خیالات کا اظہار کر رہا ہے وہ صرف اسی کے خیالات نہیں ہیں، بلکہ ماضی و حاضر کے بہت سے بڑے بڑے مفکرین کے بھی یہی خیالات ہیں اور ایک چھوٹے سے گروہ کو چھوڑ کر دورِ حاضر کے اکثر مفکرین خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ مرشد ایسے مفکرین کے نام بطور مثال کے ذکر کرے، تاکہ اس کی گفتگو کو صرف اسی کے خیالات کی ترجمانی نہ سمجھا جائے۔

۱۱۔ ہمیں سب سے پہلے شہادتین کی تفہیم و توضیح کرنی چاہیے اور اگر محسوس ہو کہ وہ سابقہ معلومات یا اس گفتگو کے نتیجے میں ایمان کی حقیقت سمجھ چکا ہے تو پھر دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنی چاہیے، لیکن جب تک اس کے دل میں ایمان کے پختہ ہو جانے کا یقین و اطمینان نہ ہو جائے اس وقت تک ایسے مسائل پر گفتگو کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے، جن پر وہ تنقید کر سکتا ہے۔

حاصل یہ کہ منکرِ خدا کی نوعیت کا تعین کرنے کے بعد اوپر ذکر کردہ طریقے کے مطابق سب سے پہلے اس کے سامنے ایمان کی وضاحت کرنی چاہیے اور جب اس کے دل میں ایمان کے جاگزیں ہو جانے کا اطمینان ہو جائے تو پھر دیگر موضوعات کی طرف آنا چاہیے، ورنہ غلط ترتیب سے گفتگو کرنا ایسے ہی ہو گا، جیسے دعوت میں پہلے میٹھی ڈش پیش کی جائے یا گھوڑے کے سامنے گوشت اور کتے کے سامنے گھاس ڈال دی جائے۔ ایسی غلط ترتیب ہمیں کتنی ہی اچھی کیوں نہ لگے، اس کا کوئی مثبت نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا، بلکہ مخاطب پر اس کے منفی اثرات پڑتے ہیں۔

ہم اپنا یہ مضمون ان نوجوان اہل علم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، جنہوں نے حال ہی میں عقیدے کی متلاشی اور کفر والحاد کے طوفان میں مضطرب کھڑی نسل نو کو گمراہی سے بچانے کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔

کہا جاتا ہے: "وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔" اس کی دلیل کیا ہے؟

قرآن کریم ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ کتاب ماضی، حال اور مستقبل کی ہر چیز کا علم رکھنے والے خدائے تعالیٰ کے معجزانہ کلام کی حامل ہے۔ دورِ حاضر اور مستقبل میں انسانیت کو پیش آنے والے مسائل اور ارتقا کے نتیجے میں ان مسائل کی پیدا ہونے والی صورتحال کے بارے میں قرآن کریم کا تعلیمات فراہم کرنا ایک ایسا امتیازی وصف ہے، جسے اس کے معجزات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ قرآن کریم چودہ صدیاں پہلے اترا، لیکن اس کا نزول ملائے اعلیٰ سے ہوا ہے، جو ایک ایسا مقام ہے، جہاں سے ماضی، حال اور مستقبل کا علم حاصل ہو سکتا ہے اور اس کا صدور ایسی ہستی کے علم سے ہوا ہے، جس نے زمین و آسمان کو تھاما ہوا ہے، جس کے دستِ قدرت میں ساری کائنات ہے، وہ نظام کائنات چلاتی ہے اور ہر چیز کی تقدیر لکھتی ہے حتیٰ کہ وہ ہمارے دلوں کی دھڑکنوں سے بھی واقف ہے۔

بلاشبہ مرورِ زمانہ سے قرآن کریم کے علوم میں تروتازگی آتی ہے۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کا تجربہ بڑھتا ہے اور اس کی پختگی اور تجزیہ و تحلیل کرنے کی ذہنی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے، گو قوتِ یاداشت میں کمی آتی ہے، یہی معاملہ معاشروں کا ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے نئے نئے راستے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں وسعت آتی ہے، انسان کی جدوجہد میں اضافہ ہوتا ہے اور کائنات کے رازوں کو افشا کرنے کے لیے نئے نئے علوم وجود میں آتے ہیں۔ علم طبیعیات کو دیکھ کر یوں لگتا ہے، جیسے یہ مسلسل نموپذیر ہو اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں وسعت پیدا ہو رہی ہو۔ یہی بات علم کیمیا، فلکیات، کائناتی طبیعیات، طب اور دیگر علوم پر بھی صادق آتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہر علم زمانے کی دوڑ میں شریک ہے اور کائنات کے کسی ایک راز کو اپنا موضوعِ تحقیق بنا کر اس کی حقیقت لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس سے

ثابت ہوتا ہے کہ جوں جوں زمانہ قیامت سے قریب ہو رہا ہے، دنیا کو کمال اور پختگی حاصل ہو رہی ہے، گویا علوم دنیا کے سر میں پختگی اور کمال کی طرف اشارہ کرنے والے سفید بال ہیں۔ جیسے جیسے دنیا کی انتہا قریب آ رہی ہے، ویسے ویسے اس میں کمال پیدا ہوتا جا رہا ہے۔

یہ صورت حال قرآن کریم کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ ایک دن آئے گا جب علوم کے حقائق و اسرار کے متلاشی بڑے بڑے مغربی مفکرین کو ہدایت نصیب ہو جائے گی۔ جب وہ قرآن کریم کو کماحقہ سمجھنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے اور انسانیت پکار اٹھے گی: "اے پروردگار! آپ کتنے عظیم ہیں!" یقیناً وہ دن آنے والا ہے، جب سائنسدان کھربوں نوری سال کی مسافت پر واقع کائنات کے دور دراز مقامات کو دیکھ کر وہی بات کہیں گے جو پاسکل نے روتے ہوئے کہی تھی "اے پروردگار! آپ کتنے عظیم ہیں!"

قرآن کریم نے چودہ صدیاں پیشتر بہترین معاشرے کے لیے بہترین معاشرتی نظام پیش کیا تھا، لیکن ہم اس معاشرتی نظام کو ابھی تک نہیں سمجھ پائے، جس کے نتیجے میں ہم کیپٹلزم، اشتراکیت، فاشزم اور لبرل ازم ایسے نظاموں کے مقابلے میں قرآن کریم کے معاشرتی نقطہ نظر کی وضاحت نہیں کر سکے۔ ہم نے نہ صرف معاشرتی مسائل کے پہلو سے قرآن کریم کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے، بلکہ زندگی کے دیگر مسائل سے متعلق قرآنی تعلیمات کو بھی نہیں سمجھا۔ آج ہماری سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم زندگی کے مسائل سے متعلق قرآنی تعلیمات کی وضاحت کر کے انہیں انسانیت کو درپیش مشکلات کے حل کے طور پر پیش کریں۔

جب ہم اذنِ خداوندی سے اوپر ذکر کردہ ذمہ داری ادا کریں گے تو قرآن کریم کا ایک انتہائی گہرے سرچشمے سے نازل ہونا روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گا۔ شاید اس گہرائی کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہ ہو، لیکن ایک دن ساری انسانیت دیکھ لے گی کہ قرآن کریم میں کس قدر علمی حقائق پوشیدہ ہیں۔ ہم سے ابھی تک اپنے معاشی مسائل حل نہیں ہو پائے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں جس نظام کو ہم نے نافذ کیا تھا آج وہ بہت سی مشکلات اور مصائب کا باعث بن چکا ہے تو

ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے نظام کے پیچھے یہ کہتے ہوئے دوڑ پڑتے ہیں کہ اس نظام کے بغیر ملک کبھی ترقی نہ کر سکے گا، لیکن جب ہم اسے نافذ کرتے ہیں تو تھوڑے سے مالداروں کے مقابلے میں فقر و فاقہ کے مارے ہوئے ستم رسیدہ لوگوں کی فوج ظفر موج وجود میں آجاتی ہے۔ غرض نظام بدلتے رہتے ہیں اور ہم ان کے ہاتھوں کھلونا بنے رہتے ہیں۔ قرآن کریم پر نئے سرے سے غور و فکر کرنے سے ہمیں معلوم ہوگا کہ ہم کیسے اس سے نئی اور عمدہ ہدایات حاصل کر سکتے ہیں، کیسے مرورِ زمانہ کے ساتھ علوم کی ترقی و تجدید سے قرآن کریم کے شباب میں تجدید ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کا نزول ابھی ہوا ہے۔ اگرچہ دورِ حاضر میں ابھی تک قرآن کریم کے بارے میں گہرائی کی حامل سنجیدہ تحقیقات نہیں ہوئی ہیں، لیکن اس کے باوجود بعض اوقات ہم اپنی نارسا عقل اور اعلیٰ حقائق کے ادراک سے عاجز دل کی مدد سے قرآن کریم سے بعض ایسے مفاہیم اخذ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، جن پر خود ہماری عقل دنگ رہ جاتی ہے اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں: ”انسان ایسی بات ہرگز نہیں کہہ سکتا۔“

کتنے ہی سائنسی حقائق کو قرآن کریم نے ایک جملے میں بیان کر دیا اور کتنے ہی میدانوں میں ہونے والی تحقیقات کے سائنسی نتائج قرآنی آیات کے مفاہیم سے ہم آہنگ ہیں اور ان میں صداقت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ہماری یہ بات محض بے بنیاد دعویٰ نہیں ہے، بلکہ سائنسی تجربات سے ثابت شدہ حقیقت ہے۔ ذیل میں ہم دو ایک مثالوں سے اس کی وضاحت کریں گے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقاً حَرَجاً كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاء كَذَلِكَ يَجْعَلُ اللّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لاَ يُؤْمِنُونَ﴾ (الأنعام: ۱۲۵) ”اور جسے چاہتا ہے کہ گمراہ کرے اس کا سینا تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے، گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر جو ایمان نہیں لاتے عذاب بھیجتا ہے۔“

یہ آیت مبارکہ ایک طبیعاتی قانون کی طرف مشیر ہے، کیونکہ اس میں ”السماء“ اور ”یصّعّد“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ”یصّعّد“ ”صعّد یصّعّد“ سے ماخوذ ہے، جس کا معنی اوپر کی طرف بلند ہونا ہے۔ لفظ ”یصّعّد“ جہد و مشقت کرنے سے عبارت ہے حتیٰ کہ اس لفظ کو بولتے

ہوئے سانس اکھڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اس آیت مبارکہ میں قرآن کریم درج ذیل حقیقت بیان کررہاہے:"انسان جس قدر سطح زمین سے بلند ہوتا ہے، دباؤ کی کمی کی وجہ سے اسی قدر اس کے لیے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ ہر سو میٹر کی بلندی پر ہوا کے دباؤ میں ایک درجے کی کمی واقع ہو جاتی ہے، حتی کہ سطح سمندر سے ۲۰۰۰ میٹر کی بلندی پر انسان مخصوص آلاتِ تنفس استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ایک اور مثال لیجیے:﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ﴾ (الحجر: ۲۲) "اور ہم ہوائیں چلاتے ہیں جو پانی سے بھری ہوئی ہوتی ہیں، سو ہم آسمان سے مینہ برساتے ہیں پھر ہم تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں اور تم تو اس کا خزانہ نہیں رکھتے۔"

اس آیت مبارکہ میں قرآن کریم نے چودہ صدیاں پیشتر جس سائنسی حقیقت کا ذکر کیا تھا اسے صرف دورِ حاضر میں ہی سمجھا جاسکا ہے۔اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوائیں آبی بخارات کے حامل بادلوں کو چلاتی ہیں، بادل آپس میں ملتے ہیں، جس سے مثبت اور منفی برقی بار کا آپس میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور بجلی چمکتی ہے، نیز جس طرح ہوائیں بادلوں سے بارش برساتی ہیں، اسی طرح وہ نباتات میں عمل بارآوری کا باعث بھی بنتی ہیں، یعنی مادہ زردانوں کو بارآور کرنے کے لیے نر زردانوں کو اٹھا کر لے جاتی ہیں اور اس طرح نباتات میں عمل بارآوری کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

اس آیت مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بارش کی صورت میں آسمان سے برسنے والا پانی زمین کے اندر محفوظ ہو جاتا ہے اور پھر کنوؤں اور چشموں کے ذریعے اس پانی کو نباتات، حیوانات اور انسانوں کے پینے کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم چودہ صدیاں پہلے طبیعی قوانین کی طرف اشارہ کرکے اپنے اعجاز پر دلائل قائم کرتا ہے۔
ایک اور آیت مبارکہ میں ہے:﴿وَمِن كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾

(الذاریات: ۴۹) "اور ہر چیز کے ہم نے دو دو جوڑے بنائے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔"
عربی زبان میں عموم کا فائدہ دینے والے لفظ "کل" کی اضافت اگر اسم معرفہ کی طرف ہو تو یہ مضاف الیہ کے تمام اجزاء کے عموم کا فائدہ دیتا ہے اور اگر اس کی اضافت اسم نکرہ کی طرف ہو تو مضاف الیہ کے تمام افراد مراد ہوتے ہیں۔ اوپر ذکر کردہ آیت مبارکہ میں لفظ "شئ" اسم نکرہ ہے، لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام مخلوقات کو جوڑوں کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے۔

جس طرح انسانوں کے جوڑے ہیں اسی طرح ساری زندہ مخلوقات کے جوڑے ہیں، چنانچہ نباتات میں بھی نر اور مادہ کے جوڑے ہیں۔ اوپر قرآن کریم میں مذکورہ لفظ "زوجین" سے نر اور مادہ مراد ہیں حتی کہ ہر چیز کے لئے بنیاد کی حیثیت رکھنے والے ایٹم کے بھی جوڑے ہیں۔ اس کے بعض اجزاء مثبت برقی بار اور بعض منفی برقی بار کے حامل ہوتے ہیں، نیز جس طرح قوتِ دافعہ ہوتی ہے، اسی طرح قوتِ جاذبہ بھی ہوتی ہے۔ حاصل یہ کہ جوڑوں کا ظہور مختلف صورتوں اور شکلوں میں ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کائنات اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکتی۔

سورت یٰسین کی درج ذیل آیت میں اس حقیقت کو مزید تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:
﴿سُبۡحَانَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنۡبِتُ الۡاَرۡضُ وَمِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا یَعۡلَمُوۡنَ﴾ (یٰس: ۳۶) "وہ ذات پاک ہے، جس نے زمین کی نباتات کے اور خود ان کے اور جن چیزوں کی ان کو خبر نہیں سب کے جوڑے بنائے۔" یہ آیت ایسی اشیاء کا بھی ذکر کرتی ہے، جن کا اُس دور کے لوگوں کو علم نہ تھا، کیونکہ اِس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے بعض ایسی چیزوں کو بھی جوڑوں کی صورت میں پیدا کیا ہے، جنہیں تم نہیں جانتے۔

ایک اور آیت مبارکہ میں ایک دوسرے موضوع پر غور فرمایئے: ﴿وَالسَّمَاءَ بَنَیۡنَاهَا بِاَیۡدٍ وَاِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ﴾ (الذاریات: ۴۷) "اور آسمان کو ہم نے اپنی قدرت سے بنایا اور ہم کو ہر طرح کی قدرت ہے۔"

عربی زبان میں جملہ فعلیہ تجدد اور جملہ اسمیہ استمرار کا فائدہ دیتا ہے۔ اوپر ذکر کردہ آیت مبارکہ میں "وانالموسعون" کا جملہ "جملہ اسمیہ" ہے، جس کا زمانہ ماضی، حال یا مستقبل سے کوئی

تعلق نہیں، بلکہ یہ استمرار کا فائدہ دے رہا ہے۔ آیت مبارکہ میں یہ نہیں کہا گیا کہ ہم نے ماضی میں (کائنات کو) پھیلایا اور پھر اس عمل کو چھوڑ دیا یا ہم اسے اب پھیلا رہے ہیں یا مستقبل میں پھیلائیں گے، بلکہ یوں کہا ہے کہ ہم (کائنات کو) بغیر رکے ہر وقت پھیلا رہے ہیں، چنانچہ ۱۹۲۲ء میں ماہر فلکیات ایڈوِن ہبل نے انکشاف کیا کہ پانچ یا چھ کہکشاؤں کے سوا تمام کہکشائیں زمین سے اپنے فاصلے کے تناسب سے دور ہو رہی ہیں۔ اس کے اندازے کے مطابق اگر کوئی ستارہ زمین سے ایک ملین نوری سال کی مسافت پر ہو تو وہ زمین سے ایک لاکھ ستاسٹھ ہزار کلو میٹر فی منٹ کی رفتار سے دور ہو رہا ہوتا ہے، دو ملین نوری سال کی مسافت پر واقع ستارہ دگنی رفتار سے اور تین ملین نوری سال کی مسافت پر واقع ستارہ تگنی رفتار سے دور ہو رہا ہوتا ہے۔ اس حقیقت سے بلجیم کے پادری اور ریاضی دان لیمٹری کے اس نظریے کی بھی تائید ہوتی ہے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔

سائنسی حلقوں میں آج بھی وزن رکھنے والے "کائنات کے پھیلاؤ" کے اس سائنسی نظریے کا انکشاف قرآن کریم نے چودہ صدیاں پہلے کر دیا تھا۔ ایک اُمّی شخص کی زبان سے ایسی سائنسی حقیقت کے انکشاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ سائنسی حلقے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے، لیکن انہوں نے ایسے نہ کیا، بلکہ آج بھی انکار کا سلسلہ جاری ہے۔

ایک آیت مبارکہ میں ہے: ﴿خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى أَلَا هُوَ الْعَزِيزُ الْغَفَّارُ﴾ (الزمر: ۵) "اسی نے آسمانوں اور زمین کو تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہی رات کو دن پر لپیٹتا اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے۔ سب ایک وقت مقرر تک چلتے رہیں گے۔ دیکھو وہی غالب ہے، بخشنے والا ہے۔" عربی زبان میں "تکویر" کسی کپڑے مثلاً پگڑی وغیرہ کو کسی دائروی چیز کے گرد لپیٹنے یا کسی دائروی چیز کے گرد چکر لگانے کو کہتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت مبارکہ میں ﴿يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ﴾ سے واضح طور پر زمین کے کروی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ سورت النازعات کی آیت ﴿وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا﴾ (النازعات:

۳۰) "اور اس کے بعد زمین کو پھیلا دیا۔" میں اس حقیقت کو زیادہ واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو "دحیۃ" (شتر مرغ کے انڈے) کی طرح بنایا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری زمین کی ساخت دائروی، مگر قطبین سے کچھ دبی ہوئی ہے، جس سے اس کی شکل شتر مرغ کے انڈے جیسی بن گئی ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو اس قدر وضاحت سے بیان کیا ہے کہ اس میں کسی شک وشبہ یا تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس سلسلے میں اور بھی بہت سی آیات بطور مثال کے پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے تربیت کے کچھ اصول پیش کیے ہیں، لیکن جب تربیت کے قرآنی اصولوں کو نظر انداز کر کے ماہرین نفسیات اور علمائے عمرانیات کے وضع کردہ تربیتی نظاموں کا تجربہ کیا گیا تو اس کا نتیجہ نوجوان نسل کے مشکلات میں پھنسنے اور خواہشاتِ نفس کے سیلاب میں بہہ جانے کی صورت میں نکلا۔ جب تک انسانیت تربیت کے قرآنی اصولوں سے دور رہے گی اس وقت تک وہ مسلسل مشکلات اور بحرانوں میں گھری رہے گی۔

انہی وجوہ کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں اس میں پختگی اور کمال پیدا ہو گا اور قیامت کا وقت قریب آئے گا توں توں محققین اور متلاشیانِ حق کو قرآنی حقائق آسمان پر جگمگاتے ستاروں کی مانند دمکتے نظر آئیں گے اور قرآنی تعلیمات کی گہرائی، سنجیدگی اور درستگی واضح ہو کر لوگوں کے لیے پہلے سے زیادہ باعث اطمینان بنے گی، دوسرے لفظوں میں جس قدر زمانہ ترقی کرے گا اسی قدر قرآن کے شباب میں جدت پیدا ہو گی اور انسانی عقل کے سامنے نئے نئے راستے کھلیں گے، جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ "لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پکار اٹھیں گے۔

قرآن کریم کے نبی کریم ﷺ کی تصنیف نہ ہونے پر کیا دلائل ہیں؟

اس موضوع پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے اور ہر قسم کے شبہات کا ازالہ کر دینے والے بہت سے دلائل پیش کیے جا چکے ہیں۔ سوالات و جوابات کے لیے مختص اس حصے میں ہم اختصار کے ساتھ اس موضوع کے صرف چند بنیادی نکات پر گفتگو کریں گے۔

قرآن کریم کے رسول ﷺ یا کسی اور انسان کی تالیف ہونے کا دعوی زمانۂ جاہلیت کے بعض افراد اور قرآنِ کریم سے عداوت رکھنے والے مستشرقین کے سوا کسی نے نہیں کیا۔

مستشرقین یہ دعویٰ کر کے ذہنوں کو پراگندہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ ماضی وحال کے مشرکین کی سوچ غیر جانبدارانہ نہیں، بلکہ بغض وعداوت پر مبنی ہے، کیونکہ قرآن کریم کے ہر لحاظ سے انسانی استطاعت سے بہت بلند تر مقام پر فائز ہونے کی وجہ سے جو شخص بھی انصاف پسندی اور غیر جانبداری سے اس کا بغور مطالعہ کرتا ہے وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کا سرچشمہ خدا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

ہم اس موضوع کے تفصیلی مطالعے میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کو اس موضوع پر عظیم مفکرین کی تحریروں کی طرف مراجعت کرنے کا مشورہ دیں گے اور آئندہ سطور میں اس موضوع سے متعلق چند بنیادی باتوں کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔

۱۔ قرآنِ کریم اور احادیث نبویہ کے اسلوب میں واضح فرق موجود ہے، یہی وجہ تھی کہ جب اہل عرب رسول اللہ ﷺ کی احادیث مبارکہ کو اپنے عام انداز گفتگو کے مطابق پاتے تو قرآن کریم کے معجزانہ اسلوب پر حیرت واستعجاب کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔

۲۔ احادیث نبویہ کا مطالعہ کرنے والے کو واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے شخص کی گفتگو اور نتیجۂ فکر ہے، جس کا دل خوفِ خدا سے لبریز ہے، لیکن اس کے برعکس قرآن کریم کے اسلوب میں جاہ و جلال، دبدبہ اور عظمت جھلکتی ہے۔ ایک ہی شخص کے اندازِ گفتگو میں اس قدر تفاوت ناممکن اور ناقابل فہم ہے۔

۳۔ ایک ایسے اُمّی شخص (میری ماں باپ اس پر قربان ہوں) جس نے کبھی مدرسے کا منہ دیکھا اور نہ کوئی کتاب پڑھی، کی جانب سے ہر عیب و نقص سے پاک ایسے جامع نظام کا پیش کیا جانا، جس کی ہمہ گیری میں فرد، خاندان، معاشرہ، معاشیات اور قانون سب داخل ہوں نہ صرف ناممکن ہے، بلکہ عقل و نکر اور کامن سینس کے بھی خلاف ہے، خصوصاً جبکہ وہ نظام نہ صرف زمانہ دراز تک مختلف اقوام کے ہاں قابل عمل رہا ہو، بلکہ آج بھی قابل عمل ہو اور اس کی تر و تازگی بر قرار ہو۔

۴۔ قرآنِ کریم میں زندگی، کائنات اور ان سے متعلقہ موضوعات، عبادات، قوانین اور معاشیات وغیرہ میں اس قدر حیرت انگیز توازن پایا جاتا ہے کہ اگر اس کی نسبت کسی انسان کی طرف کی جائے تو اسے مافوق الفطرت ہستی تسلیم کرنا پڑے گا، کیونکہ اوپر ذکر کردہ مسائل میں سے ہر ایک مسئلہ زمانے کی حدود سے ماورا اور اعلیٰ ترین عبقری صلاحیتوں کے حامل انسان کی استطاعت سے بھی خارج ہے، لہٰذا ایسے سینکڑوں مسائل جن میں سے ایک مسئلہ بھی بڑے بڑے عبقری انسانوں کے لیے پیش کرنا ممکن نہیں، پر مشتمل کتاب کو ایسے امی شخص کی طرف منسوب کرنا جس نے کسی مدرسے کا منہ دیکھا ہو اور نہ کوئی کتاب پڑھی ہو، بے بنیاد خام خیالی کے سوا کچھ نہیں۔

۵۔ قرآنِ کریم کی ایک خارق العادت خصوصیت یہ ہے کہ یہ ماضی اور مستقبل کے بارے میں غیب کی خبروں پر مشتمل ہے، لہٰذا اسے انسانی کلام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآنِ کریم نے صدیوں پیشتر ماضی کی قوموں کی طرز زندگی، معیشت اور اچھے یا برے انجام کے بارے میں جو معلومات فراہم کی تھیں، دورِ حاضر کی تازہ ترین تحقیقات سے ان کی صداقت ثابت ہو چکی ہے۔ حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کی قوموں کے حالاتِ زندگی اور ان کی نشان عبرت بننے والی رہائش گاہیں سب کے سامنے موجود ہیں۔

قرآنِ کریم نے ماضی کی اقوام کے حالات کی طرح مستقبل کے واقعات کے بارے میں بھی معجزانہ انداز میں پیش گوئیاں کی ہیں، مثلاً قرآنِ کریم نے فتح مکہ کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا

تھا، نیز یہ بھی بتادیا تھا کہ مسلمان فتح مکہ سے کچھ مدت پہلے اطمینان کے ساتھ مکہ میں داخل ہوں گے:﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُؤُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَلِكَ فَتْحاً قَرِيباً﴾ (الفتح: ۲۷)"بے شک اللہ نے اپنے پیغمبر کو سچا اور صحیح خواب دکھایا تھا کہ تم ان شاءاللہ مسجد حرام میں اپنے سر منڈوا کر یا اپنے بال ترشوا کر امن و امان سے داخل ہو گے اور کسی طرح کا خوف نہ کرو گے۔ جو بات تم نہیں جانتے تھے اللہ کو معلوم تھی، سو اس نے اس سے پہلے ہی جلد ایک فتح عطا فرمائی۔" قرآنِ کریم نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ دین اسلام تمام غلط نظاموں پر غالب آکر رہے گا: ﴿هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللّٰهِ شَهِيْداً﴾ (الفتح: ۲۸) "وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت کی کتاب اور دینِ حق دے کر بھیجا تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اور حق ثابت کرنے کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔"

قرآنِ کریم کی ایک پیش گوئی یہ بھی تھی کہ رومیوں پر غالب آنے والے ساسانیوں کو کچھ سالوں کے بعد شکست ہو جائے گی اور مسلمان ایک آنے والی فتح پر خوش ہوں گے۔ اس فتح کا مصداق غزوہ بدر کی فتح ہے، جو ایک رائے کے مطابق رومیوں کی فتح کے زمانے میں ہی مسلمانوں کو حاصل ہوئی: ﴿الم ○ غُلِبَتِ الرُّومُ ○ فِيْ أَدْنَى الْأَرْضِ وَهُم مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ ○ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ لِلّٰهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (الروم: ۱-۴) "الم۔ اہل روم مغلوب ہو گئے نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آجائیں گے چند ہی سال میں۔ پہلے بھی اور بعد میں بھی اللہ ہی کا حکم ہے اور اس روز مؤمن خوش ہو جائیں گے۔"

چنانچہ وقت مقررہ پر قرآنِ کریم کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔ اسی سے ملتی جلتی آیت حسبِ ذیل ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ﴾

(المائدۃ: ٦٧) ”اے پیغمبر! جو ارشادات اللہ کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچادو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم اللہ کا پیغام پہنچانے میں قاصر رہے اور اللہ تعالیٰ تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ بے شک اللہ منکروں کو ہدایت نہیں کرتا۔“ اگرچہ آپ ﷺ دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے اور چچا، قوم اور ارد گرد کی حکومتیں آپ کی جان کے درپے تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے آپ ﷺ کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور اس وعدے کو پورا کر کے دکھایا۔

آیت مبارکہ ﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ (فصلت: ٥٣) ”ہم عنقریب ان کو اطرافِ عالم میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن حق ہے۔ کیا تم کو یہ کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے باخبر ہے۔“ سے ثابت ہوتا ہے کہ مستقبل میں روایتی اور نفسیاتی علوم میں کافی ترقی ہوگی اور یہ ترقی انسان کو ایمان کے قریب تر لے آئے گی۔ دورِ حاضر میں سائنسی علوم اس مقصد کو تیزی سے حاصل کر رہے ہیں اور اس کے کافی قریب پہنچ چکے ہیں۔

مزید برآں قرآنِ کریم نے سارے جن و انس کو چیلنج کیا ہے: ﴿قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَن يَأْتُواْ بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لاَ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراً﴾ (الاسراء: ٨٨) ”کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔“ یہ چیلنج مکہ معظمہ میں اس آیت کے نزول سے لے کر آج تک قائم ہے۔ سوائے دو ایک بے معنی کوششوں کے کسی نے اس چیلنج کو قبول کرنے یا قرآن کریم کے مشابہ کلام پیش کرنے کی جرأت نہیں کی۔ یہ قرآن کریم کی صداقت اور اعجاز کی روشن ترین دلیل ہے۔

نزولِ قرآن کے ابتدائی سالوں میں مسلمان بہت کمزور اور ناتواں تھے۔ وہ کسی قسم کی طاقت اور قوت کے مالک تھے اور نہ ہی ان کے ذہن میں مستقبل کے بارے میں کوئی واضح خاکہ تھا، لہٰذا ان کے ذہنوں میں دنیا پر حکمرانی کرانے کا خیال تھا اور نہ ہی مستقبل میں سارے عالمی

نظاموں پر غالب آنے والے اپنے دین کی طاقت کے سرچشموں کے بارے میں کوئی منصوبہ تھا، لیکن قرآنِ کریم کہتا ہے: ﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ (النور: ۵۵) "جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے گا تو ایسے ہی لوگ بدکار ہیں۔" قرآنِ کریم اس انداز سے انہیں خطاب کر کے انہیں ان کے اعلیٰ اہداف سے آگاہ کرتا اور انہیں دنیا پر حکمرانی کی خوشخبری سناتا۔ دیگر بہت سی آیات مبارکہ جنہیں یہاں ذکر کرنا ممکن نہیں، اسلام اور مسلمانوں کی فتوحات اور ہزیمتوں اور عروج و زوال کا تذکرہ کرتی ہیں۔

مستقبل کے بارے میں قرآنِ کریم کی بیان کردہ اکثر و بیشتر پیش گوئیاں مختلف علوم میں ہونے والی تحقیقات وانکشاف کا منتہا ہوں گی۔ قرآنِ کریم نے بعض سائنسی حقائق کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں، وہ اس قدر حیران کن ہیں کہ انہیں نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی انسان کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ بہت سی کتابوں میں اس موضوع پر سینکڑوں آیات کے ضمن میں سیر حاصل بحث کی جاچکی ہے، اس لیے ہم اس موضوع کی تفصیلات جاننے میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ان کتابوں کی طرف مراجعت کا مشورہ دے کر آئندہ سطور میں صرف چند ایک مثالوں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔

۱۔ تخلیق کائنات

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقاً فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاء كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ﴾ (الانبیاء: ۳۰)

''کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے ان کو جدا جدا کر دیا اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔'' اس آیت مبارکہ کا تعلق تخلیقِ کائنات سے ہے۔ اگرچہ اس آیت مبارکہ کی بعض تفصیلات کی تفسیر میں اختلاف ہے، لیکن اس کا عمومی مفہوم تخلیقِ کائنات سے متعلق ایک غیر متغیر اصول کی طرف مشیر ہے۔ خواہ ''الرتق'' اور ''الفتق'' سے کہکشاؤں اور ستاروں کا گیسوں اور بادلوں سے مرکب ہونا مراد ہو، نظام شمسی کی طرح کے نظاموں کا وجود میں آنا مراد ہو یا بادلوں اور دھند کا تقسیم ہو کر مخصوص ہم آہنگ اور باہم مربوط صورتیں اختیار کرنا مراد ہو اس سے اس آیت کے عمومی مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا، لہٰذا یہ آیت مبارکہ اپنے الفاظ اور اسلوب کے ساتھ اپنی جدت اور تروتازگی کو آج بھی برقرار رکھے ہوئے ہے اور دیگر تمام نظریات کے ناکام اور نامقبول ہو جانے کے باوجود اپنی تروتازگی کو آئندہ بھی برقرار رکھے گی۔

۲۔ علم فلکیات

قرآنِ کریم میں علم فلکیات سے متعلق بہت سی آیات ہیں۔ اگر ان سب کو یکجا کر کے ان کا تفصیلی تجزیہ کیا جاتا تو بہت خوب ہوتا، لیکن اس مقصد کے لیے کئی جلدوں پر مشتمل کتاب درکار ہوگی۔ ذیل میں میں صرف ایک دو آیات مبارکہ کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمَاوَاتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِأَجَلٍ مُّسَمًّی یُدَبِّرُ الْأَمْرَ یُفَصِّلُ الْآیَاتِ لَعَلَّكُم بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ﴾ (الرعد: ۲) ''اللہ وہی تو ہے، جس نے ستونوں کے بغیر آسمان جیسا کہ تم دیکھتے ہو اتنے اونچے بنائے پھر عرش پر جلوہ افروز ہوا اور سورج اور چاند کو کام میں لگایا۔ ہر ایک ایک میعادِ معین تک گردش کر رہا۔ وہی دنیا کے کاموں کا انتظام کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم اپنے پروردگار کے روبرو جانے کا یقین کرو۔''

یہ آیت مبارکہ آسمانوں کی رفعت و وسعت کا تذکرہ کرنے کے بعد کائنات میں کارفرما انتہائی منظم نظام کی طرف اشارہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک قابل مشاہدہ مثال بھی پیش کرتی ہے۔ اگرچہ

بظاہر ایسے ستون دکھائی نہیں دیتے، جنہوں نے نیلی چھت کو گرنے سے بچار کھا ہو، لیکن کسی بھی قسم کے ستونوں کی موجودگی کی نفی کرنا درست نہیں، کیونکہ کائنات میں کارفرما قوانینِ فطرت کی صورت میں دراصل ایسے ستون موجود ہیں، جو کائنات کو بکھر کر فنا ہونے سے محفوظ رکھنے کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فی نفسہ ستونوں کا وجود ناگزیر ہے۔

اس قرآنی تعبیر کو پڑھتے ہوئے ذہن مرکزی قوت اور مرکز سے دور دھکیلنے والی قوت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ بات نیوٹن کے "قانونِ جاذبیت" یا آئن اسٹائن کی کوئنٹم تھیوری سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

درحقیقت قرآنِ کریم کا آفتاب ومہتاب کی حرکت کی طرف اشارہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سورت رحمن میں بتایا گیا ہے کہ سورج اور چاند بڑے منظم انداز میں حرکت کرتے ہیں: ﴿الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ﴾ (الرحمن: ۵) "سورج اور چاند ایک حسابِ مقرر سے چل رہے ہیں۔" سورت انبیاء میں ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ﴾ (الأنبياء: ۳۳) "اور وہی تو ہے، جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو بنایا۔ یہ سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔" اور سورت یٰسین میں سورج کی گردش کے ذکر کے بعد ہے: ﴿لَا الشَّمْسُ يَنبَغِيْ لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ﴾ (یس: ۴۰) "نہ تو سورج ہی سے یہ ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آ سکتی ہے اور سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔" جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سورج، چاند اور ستاروں کی تخلیق مخصوص نظام کے تحت کی گئی ہے اور وہ سب کے سب ریاضی کے اصولوں کے مطابق منظم انداز میں حرکت کر رہے ہیں۔

سورت زمر کی آیت مبارکہ: ﴿خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِيْ لِأَجَلٍ مُسَمًّى أَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ﴾ (الزمر: ۵) "اسی نے آسمانوں اور زمین کو تدبیر کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہی رات کو دن پر لپیٹتا اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو کام

میں لگا رکھا ہے۔ سب ایک وقت مقرر تک چلتے رہیں گے۔ دیکھو وہی غالب ہے، بخشنے والا ہے۔" میں رات دن کے آنے جانے کو رات کو دن کے گرد اور دن کو رات کے گرد لپیٹنے سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسرے لفظوں میں دنیا میں روشنی اور تاریکی کے یکے بعد دیگرے آنے جانے کو کرۂ ارض کے سر پر پگڑی باندھنے سے تشبیہ دی گئی ہے اور ایک آیت مبارکہ ﴿وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا﴾ (النازعات: ۳۰) "اور اس کے بعد زمین کو پھیلا دیا۔" سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین کی شکل بیضوی ہے۔ یہ تمام آیات رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی مضبوط ترین دلیلیں ہیں۔ کائنات کی وسعت پذیری کے بارے میں ایک آیت مبارکہ میں ہے: ﴿وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ﴾ (الذاریات: ۴۷) "اور آسمان کو ہم نے اپنی قدرت سے بنایا اور ہم کو ہر طرح کی قدرت ہے۔" خواہ اس وسعت پذیری کا تعلق آئن سٹائن کے نظریئے سے ہو یا "ایڈون ہبل" کے کہکشاؤں کے ایک دوسرے سے دور ہونے کے نظریئے سے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اہم بات یہ ہے کہ قرآن کریم نے سائنسی علوم سے بہت پہلے اس نظریئے کے بنیادی حصے کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔

۳۔ میٹرولوجی (Meteorology)

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور ان سے نصیحت حاصل کرنے کے لیے کہنے، نیز عذابِ خداوندی سے ڈرائے جانے کے مواقع پر بکثرت ایسی آیات ملتی ہیں، جن میں ہواؤں اور آندھیوں کے چلنے، بادلوں کے آپس میں ملنے اور برق و چمک کے پیدا ہونے کا ذکر ہے، مثلاً ایک آیت مبارکہ میں ہے: ﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِن جِبَالٍ فِيهَا مِن بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ عَن مَّن يَشَاءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ﴾ (النور: ۴۳) "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی بادلوں کو چلاتا ہے پھر ان کو آپس میں ملا دیتا ہے پھر ان کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ بادل سے مینہ نکل کر برس رہا ہے اور آسمان میں جو اولوں کے پہاڑ ہیں ان سے اولے نازل کرتا ہے تو جس پر چاہتا ہے اس کو برسا دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ہٹا رکھتا ہے اور بادل میں جو بجلی ہوتی ہے اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر کے بینائی کو اچکے لے جاتی ہے۔"

اس آیت مبارکہ میں قرآنِ کریم بارش کے نظام کی وضاحت کرتا ہے اور بادلوں کی خوفناک گرج اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی بجلی کی چمک میں مخفی خدائی نعمتوں کا ذکر کر کے دلِ بینا رکھنے والوں کو ہر وقت متوجہ رہنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے بعد قرآنِ کریم بارش اور برف باری کے نظام کی معروف سائنسی حقائق کے مطابق ایسی عمدگی سے وضاحت کرتا ہے کہ انسان داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا، تاہم قرآنِ کریم بارش کے نظام کی جزئی تفصیلات میں نہیں جاتا، مثلاً وہ یہ نہیں بتاتا کہ دو قسم کے برقی بار ہوتے ہیں۔ ایک ہی قسم کے دو برقی باروں میں تنافر جبکہ دو مختلف قسم کی برقی باروں میں کشش پائی جاتی ہے۔ اس نظام میں ہوائیں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں اور دو مختلف قسم کے برقی باروں کے حامل بادلوں کو آپس میں ملاتی ہیں۔ سطحِ زمین سے بلند ہونے والے مثبت برقی باروں کے فضا میں موجود منفی برقی باروں کے ساتھ ٹکراؤ کے نتیجے میں بجلی چمکتی ہے اور پھر قطروں کی صورت میں بارش برسنے لگتی ہے... قرآن کریم ان تفصیلات میں نہیں جاتا، بلکہ صلبِ موضوع کی طرف اشارہ کر کے تفصیلات کو آنے والے دور میں سائنسی ترقی پر چھوڑ دیتا ہے۔

سورت حجر کی آیت مبارکہ: ﴿وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنتُمْ لَهُ بِخَازِنِينَ﴾(الحجر: ۲۲) "اور ہم ہوائیں چلاتے ہیں جو پانی سے بھری ہوئی ہوتی ہیں، سو ہم آسمان سے مینہ برساتے ہیں پھر ہم تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں اور تم تو اس کا خزانہ نہیں رکھتے۔" ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انسان کی توجہ درختوں، پھولوں اور بادلوں کی بارآوری کے سلسلے میں ہواؤں کے کردار کی طرف مبذول کرا رہی ہے، حالانکہ نزولِ قرآن کے وقت درختوں، نباتات، پھولوں اور بادلوں کا بارآوری کے عمل کا محتاج ہونا معروف تھا اور نہ ہی کسی کو اس سلسلے میں ہواؤں کے کردار کا علم تھا۔

۴۔ علم طبیعیات

قرآنی موضوعات میں سے ایک موضوع یہ بھی ہے کہ جس مادے سے ساری کائنات وجود میں آئی ہے، اس کی تخلیق دوئی پر مشتمل ہے۔ سورت ذاریات میں ہے: ﴿وَمِن كُلِّ

شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُونَ﴾ (الذاریات: ۴۹) ''اور ہر چیز کے ہم نے دو دو جوڑے بنائے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔'' اس آیت مبارکہ سے پتا چلتا ہے کہ ہر چیز کا جوڑے جوڑے کی صورت میں پیدا ہونا ایک بنیادی قانونِ فطرت ہے۔ سورت شعراء میں ہے: ﴿أَوَلَمۡ یَرَوۡا إِلَی الۡأَرۡضِ کَمۡ أَنبَتۡنَا فِیهَا مِن کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیمٍ﴾ (الشعراء: ۷) ''کیا انہوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس میں ہر قسم کی کتنی نفیس چیزیں اگائی ہیں۔'' اس آیت مبارکہ میں روئے زمین پر موجود نباتات اور حیوانات کے ہزاروں جوڑوں کی طرف توجہ مبذول کرا کے اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کی یاد دہانی کرائی گئی ہے، تاہم سورت یسین کی ایک آیت میں یہ بات زیادہ جامعیت اور تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے: ﴿سُبۡحَانَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡأَزۡوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنۡبِتُ الۡأَرۡضُ وَمِنۡ أَنفُسِهِمۡ وَمِمَّا لَا یَعۡلَمُونَ﴾ (یس: ۳۶) ''وہ ذات پاک ہے جس نے زمین کی نباتات کے اور خود ان کے اور جن چیزوں کی ان کو خبر نہیں سب کے جوڑے بنائے۔'' یہ آیت مبارکہ جہاں ہمارے علم میں موجود جوڑوں کی طرف مشیر ہے، وہیں یہ بھی بتاتی ہے کہ بہت سی اشیاء کے جوڑوں کا ہمیں علم نہیں۔ اس میں ہمارے لیے غور و فکر کی دعوت بھی ہے۔

اوپر بطور مثال ذکر کردہ آیات کے علاوہ اس موضوع سے متعلق اور بھی بہت سی مثالیں ہیں، جن میں سے ہر ایک قرآنی معجزہ ہے اور قرآن کریم کے کلام اللہ اور حضرت محمد ﷺ کے رسول خدا ہونے کی واضح ترین دلیل ہے۔

قرآن کریم نے روئے زمین پر زندگی کے آغاز سے لے کر نباتات میں عمل بار آوری، ان کی بہتات، حیوانات کی مختلف اقسام کی تخلیق، ان کے پراسرار نظامہائے زندگی، شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں کی عجیب و غریب دنیاؤں، پرندوں کی اُڑان، حیوانات میں دودھ کی تیاری اور رحم مادر میں جنین کے مختلف مراحل جیسے بہت سے سائنسی موضوعات پر اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کی ہے۔ قرآن کا اسلوب مختصر، ٹھوس، بلیغ اور مضبوط ہے۔ اگر انسانی تشریحات کو علیحدہ کر دیا جائے تو ان آیات کی تر و تازگی اور شباب ہمیشہ برقرار رہے گا اور وہ ہمیشہ سائنس کے لیے آخری ہدف سمجھی جاتی رہیں گی۔

قرآنِ کریم ایک ایسا ہدف مقرر کر کے موضوع کو ٹھوس انداز میں پیش کرتا ہے کہ جس تک ہزاروں انسان صدیوں کی جدوجہد کے باوجود بھی نہیں پہنچ سکے۔ ایسی کتاب چودہ صدیاں پہلے کے کسی انسان کی تصنیف نہیں ہو سکتی، کیونکہ آج سینکڑوں ماہرین اور ہزاروں عبقری انسان مل کر بھی قرآن جیسے مضامین، فصاحت وبلاغت اور معجزانہ اور دلکش الہامی اسلوب کی حامل کتاب لکھنا چاہیں تو نہیں لکھ سکتے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اُمّی نے کہ جس کا اُمّی ہونا معجزے سے کم نہیں، اس دور میں کس سے جانوروں میں دودھ کی تیاری کی کیفیات سیکھیں کہ جب مدارس کے قیام اور لکھنے پڑھنے کا رواج ہی نہیں تھا؟ اسے ہواؤں کے ذریعے بادلوں اور نباتات کے بارآور ہونے کا کیسے علم ہوا؟ وہ بارش اور برف باری کی کیفیت کا کیسے آشنا ہوا؟ اس نے کون سی رصد گاہ اور دوربین کے ذریعے کون ومکان کی وسعت پذیری کا مشاہدہ کیا؟ اسے کرۂ ارض کی شکل کے بیضوی ہونے کے بارے میں کس نے بتایا؟ کون سی تجربہ گاہ میں اسے فضا کے عناصر کا علم ہوا؟ اسے کیسے معلوم ہوا کہ کرۂ فضائی کے اوپر والے حصے میں آکسیجن کم ہوتی ہے؟ اس نے کیسے اور کون سی ایکس ریز مشین کے ذریعے رحمِ مادر میں جنین کے مراحل کا مشاہدہ کیا؟ اور کیسے اس نے ان تمام معلومات کو ان علوم کے ماہر کی حیثیت سے پورے اعتماد اور اطمینان کے ساتھ بغیر کسی تذبذب کے اپنے مخاطبین تک پہنچایا؟

۵۔ جس طرح قرآنِ کریم نے رسول اللہ ﷺ کو آپ کے وظائف، ذمہ داریوں، فرائض اور صلاحیتوں کے بارے میں تعلیم دی، اسی طرح بعض اوقات آپ کو تنبیہہ کی اور آپ پر اظہار ناراضگی بھی کیا، مثلاً جب آپ ﷺ نے بعض منافقین کو جہاد میں نہ جانے کی اجازت دی، جبکہ انہیں اس کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی تو درج ذیل آیت مبارکہ نازل ہوئی: ﴿عَفَا اللّٰهُ عَنکَ لِمَ أَذِنتَ لَهُمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَکَ الَّذِينَ صَدَقُواْ وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ﴾ (التوبۃ: ۴۳) "اللہ تمہیں معاف کرے تم نے پیشتر اس کے کہ تم پر وہ لوگ بھی ظاہر ہو جاتے جو سچے ہیں اور وہ بھی تمہیں معلوم ہو جاتے جو جھوٹے

ہیں ان کو اجازت کیوں دی۔" اسی طرح قرآن کریم نے بدر کے قیدیوں کے بارے میں بھی آپ ﷺ کے موقف کی حمایت نہیں کی اور کہا: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ لَّوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (الانفال: ٦٧-٦٨) "پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک کافروں کو قتل کر کے زمین میں کثرت سے خون نہ بہا دے۔ تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور اللہ آخرت کی بھلائی چاہتا ہے اور اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کا حکم پہلے نہ ہو چکا ہوتا تو جو فدیہ تم نے لیا اس کے بدلے تم پر بڑا عذاب نازل ہوتا۔"

جب قریش نے رسول اللہ ﷺ سے روح، اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: "کل میرے پاس آنا میں تمہیں ان کے بارے میں بتا دوں گا۔" لیکن آپ ﷺ نے "ان شاء اللہ تعالیٰ" نہ کہا، اس پر آپ ﷺ کی تنبیہہ کے لیے درج ذیل آیت مبارکہ کا نزول ہوا: ﴿وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۝ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ﴾ (الکھف: ٢٣-٢٤) "اور کسی کام کی نسبت نہ کہنا کہ میں اسے کل کر دوں گا، مگر انشاء اللہ کہہ کر یعنی اگر اللہ چاہے تو کر دوں گا۔" ایک اور موقع پر لطیف پیرائے میں آپ ﷺ پر اس بارے میں عتاب کیا گیا کہ صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے: ﴿وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ﴾ (الاحزاب: ٣٧) "اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپا رہے تھے جسے اللہ جانتا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے، حالانکہ اللہ ہی اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔" اسی طرح جب آپ ﷺ نے اپنی بعض ازواج مطہرات کی خوشنودی کی خاطر شہد کا پانی نہ پینے کی قسم اٹھائی تو قرآن نے اس بات کی مخالفت کرتے ہوئے ناراضگی کا اظہار کیا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (التحریم: ١) "اے پیغمبر جو چیز اللہ نے تمہارے لیے جائز کی

ہے اس سے کنارہ کشی کیوں کرتے ہو؟ کیا اس سے بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہو؟ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔"

لہٰذا جہاں بہت سی آیات رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داریوں، فرائض اور آپ کی صلاحیتوں کی حدود کی وضاحت کرتی ہیں، وہیں جب آپ ﷺ مقربین کی حدود سے سرِ مو باہر نکلتے ہیں تو بعض آیات آپ کی راہنمائی اور تنبیہہ کے لیے نازل ہو جاتی ہیں۔ کیا کوئی شخص اپنی تالیف کردہ کتاب میں اپنے ہی بارے میں تنبیہات اور عتاب آمیز کلام شامل کر سکتا ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے، لہٰذا قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بلند پایہ رسول اور مبلغ ہیں۔

۶۔ قرآنِ کریم بلاغت کے ایسے بلند ترین مقام پر فائز ہے کہ اس بارے میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ اس جیسا ہے، لہٰذا اسے کسی انسان کی طرف منسوب کرنا ممکن نہیں۔ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے نبوت کا اعلان فرمایا اس وقت وہاں بہت سے قابل فخر اور متاثر کن شعراء اور بلاغت و بیان کے ماہرین موجود تھے اور ان میں سے اکثر آپ ﷺ کے مخالفین میں شامل تھے۔ انہوں نے قرآن کریم کا مقابلہ کرنے کے لیے کئی بار مشورہ کیا حتیٰ کہ بسا اوقات اس بارے میں یہود و نصاریٰ کا نقطۂ نظر جاننے کے لیے ان سے بھی رابطہ کیا، کیونکہ انہوں نے قرآن کریم کے سیلِ رواں کو روکنے اور اس کے چشمۂ حیواں کو خشک کرنے کا عزم کر رکھا تھا اور اس مقصد کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار تھے، لیکن ان تمام رکاوٹوں کے باوجود آپ کافروں اور بے دینوں کے خلاف ڈٹے رہے اور اس جدوجہد کے دوران آپ ﷺ کا واحد ہتھیار قرآنِ پاک تھا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کو دشمنوں کے نہ چاہتے ہوئے بھی فتح حاصل ہوئی۔

جب فصحائے عرب نے علمائے یہود و نصاریٰ کے ساتھ مل کر اسلام کے خلاف آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا، اس وقت قرآن کریم کا فصیح و بلیغ اسلوب، سحر انگیز گفتگو اور دلکش روحانیت دلوں

کو فتح کر رہی تھی۔ قرآن کریم نے اپنے مخالفین کو بر سر میدان اپنے جیسا کلام پیش کرنے کا چیلنج کیا: ﴿قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَن يَأْتُواْ بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لاَ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراً﴾ (الاسراء: ۸۸) "کہہ دو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مدد گار ہوں۔" پھر مزید کہا کہ اگر ان سے یہ نہیں ہو سکتا تو اس جیسی دس سورتیں لے آئیں: ﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُواْ بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُواْ مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ (ھود: ۱۳) "کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن از خود بنا لیا ہے کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم بھی ایسی دس سورتیں بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جس جس کو بلا سکتے ہو بلا بھی لو۔" اور اگر اس پر بھی انہیں قدرت نہیں ہے تو صرف ایک سورت ہی پیش کر دیں: ﴿وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُواْ بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ وَادْعُواْ شُهَدَاءكُم مِّن دُونِ اللّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ (البقرۃ: ۲۳) "اور اگر تم کو اس کتاب میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل فرمائی ہے کچھ شک ہو تو اسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جو تمہارے مدد گار ہیں ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔" بصورت دیگر اپنی شکست تسلیم کر لیں۔

اس طرح ایک کے بعد دوسرا چیلنج کیا جاتا رہا، لیکن دو ایک لغو قسم کی کوششوں کے سوا کسی نے ان چیلنجوں کو قبول کیا اور نہ کسی کی ایسا کرنے کی ہمت ہوئی۔(22) یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآنِ کریم کا سرچشمہ انسانی نہیں ہے، کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مخالفین اور دشمنوں نے آپ ﷺ سے دشمنی اور جنگ کرنے اور آپ کو ایذائیں پہنچانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے قرآن کے مشابہ کلام پیش کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔ اگر یہ ان کے بس کی بات ہوتی تو ایسا کرنے میں ذرا دریغ نہ کرتے اور اس کے ذریعے قرآن کریم کی آواز دبا دیتے۔ ایسی صورت میں انہیں جنگ کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، لہٰذا فصاحت و بلاغت کے شہسواروں کا جنگ کا راستہ اختیار کرنا کہ جس میں جان اور عزت و آبرو داؤ پر لگ جاتی ہے، ان کے قرآنِ کریم کے چیلنج کا جواب نہ دے سکنے کی کھلی دلیل ہے۔

فصحائے عرب کے قرآن کریم جیسا کلام پیش نہ کر سکنے کے بعد قرآن کریم کے ماخذ کو علمائے یہود و نصاری کے ہاں تلاش کرنا ایک لاحاصل جستجو اور ناکامی کی علامت ہے۔ اگر قرآن کریم جیسے پر حکمت مضامین پر مشتمل کتاب تیار کرنا یہود و نصاری کے بس میں ہوتا تو وہ اسے کسی دوسرے شخص کی طرف منسوب کرنے کی بجائے خود اس پر فخر کرتے۔

نیز اگر ہم گنتی کے چند مستشرقین اور کفار سے قطع نظر کر لیں تو ہزاروں ایسے مفکرین، اہل تحقیق اور اہل علم ہیں، جنہوں نے قرآن کے مضامین کی عظمت اور اس کے اسلوب کی بلاغت پر حیرت و استعجاب کا اظہار کیا ہے، چنانچہ چارلس ملر لکھتا ہے: "قرآن کریم کے اسلوب کی بلاغت اور اس کے مضامین کی عظمت کی وجہ سے اس کا ترجمہ کرنا مشکل کام ہے۔" ڈاکٹر امبروس لکھتا ہے کہ قرآن کے مضامین میں اس قدر وسعت پائی جاتی ہے کہ وہ تمام قوانین کے لیے ماخذ بن سکتا ہے۔ ارنسٹ رینان لکھتا ہے کہ قرآن نے دینی انقلاب کے ساتھ ساتھ ادبی انقلاب بھی برپا کیا ہے۔ گستاولے بون اعتراف کرتا ہے کہ قرآن کا لایا ہوا دین اسلام سب سے زیادہ خالص اور صاف ستھرا عقیدۂ توحید پیش کرتا ہے۔ کے اے ہیورٹ کہتا ہے کہ اسے یقین ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول محمد ﷺ پر نازل ہونے والی وحی ہے۔ ایچ ہولمین لکھتا ہے: "محمد ﷺ خدا کی طرف سے انسانیت کی طرف آخری رسول ﷺ ہیں اور دین اسلام آخری آسمانی مذہب ہے۔" امیل در منھیم (کذا) کو اعتراف ہے کہ قرآن رسول اللہ ﷺ کا سب سے پہلا معجزہ ہے، جو اپنے لازوال حسن و جمال کی وجہ سے ہمیشہ ایک ناقابل حل معمہ بنا رہے گا۔"

آرتھر بلغزی کہتا ہے: "محمد ﷺ نے جس قرآن کو پہنچایا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔" جین پال روکس لکھتا ہے: "پیغمبر اسلام کا سب سے بڑا معجزہ ان پر نازل ہونے والا قرآن ہے۔" رائمنڈ چارلس کی رائے میں قرآن بندوں تک پہنچنے والی پہلی الہامی کتابوں کی بہ نسبت سب سے زیادہ حیات بخش کتاب ہے۔ ڈاکٹر موریس لکھتے ہیں: "قرآن معجزہ اور ناقابل تنقید ہے۔ ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ادبی ماخذ ہے، ماہرین لغت کے لیے اس میں زبان کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور شعراء کے تخیلات کا سرچشمہ ہے۔" مانویل کنگ لکھتے ہیں: "نبوت کے

طویل عرصے میں رسول اللہ ﷺ کو وصول ہونے والی وحی کے کامل ترین مجموعے کا نام قرآن ہے۔ "روڈویل کہتے ہیں: "جب بھی انسان قرآن کی تلاوت کے دوران غور و فکر کرتا ہے وہ حیرت واستعجاب کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔"

یہ اقتباسات بعض اہل علم اور مفکرین کی گفتگو کے چند ایک جملے ہیں، ورنہ ان کے علاوہ سینکڑوں اور لوگ بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں اور قرآنِ حکیم کے اسلوب پر حیرت و استعجاب کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ بہت سے اساتذہ کرام اور پروفیسر حضرات نیز اس موضوع پر لکھی گئی گرانقدر کتابوں کی موجودگی میں ہمارے لیے مزید کوئی بات کہنا شاید مناسب نہیں، تاہم ہم نے اس سلسلے میں تھوڑی سے جرأت سے کام لیا ہے۔ امید ہے کہ صاحب قرآن ﷺ اس جرأت سے درگزر فرمائیں گے۔

انبیائے کرام کی تعداد کتنی ہے؟ اور کیا منصبِ نبوت پر صرف مرد ہی فائز ہوئے ہیں؟

زمین کے ہر خطے میں انبیائے کرام کی بعثت ہوئی ہے۔ ہمیں ان کی تعداد یقینی طور پر معلوم نہیں، لیکن کتب حدیث کی ایک روایت میں ایک لاکھ چوبیس ہزار اور ایک دوسری روایت میں دو لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام کی بعثت کا ذکر ملتا ہے، لیکن ایسی تمام روایات پر اصولِ حدیث کی روشنی میں جرح و قدح موجود ہے، تاہم انبیائے کرام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہو یا دو لاکھ چوبیس ہزار، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی دور یا قوم کو انبیائے کرام کی تعلیمات سے محروم نہیں رکھا۔

انبیائے کرام کو صرف مخصوص علاقوں اور معاشروں کی طرف ہی نہیں بھیجا گیا، بلکہ مختلف شہروں اور علاقوں میں ان کی بعثت ہوئی ہے۔ یہ بات قرآن کریم کی نصوص سے واضح طور پر ثابت ہے: ﴿وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (فاطر:۲۴) "اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ گزرا ہو۔" اس صریح نص سے ثابت ہوتا ہے کہ روئے زمین کے ہر معاشرے میں انبیائے کرام کی بعثت ہوئی ہے۔ ایک دوسری آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولاً﴾ (الاسراء: ۱۵) "اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔" یعنی جس قوم کی طرف اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو نہ بھیجا ہو، اسے عذاب نہیں دیتے، کیونکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کے شایاں نہیں: ﴿فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ ٥ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ﴾ (الزلزال: ۷۔۸) "تو جس نے ذرا بھر نیکی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرا بھر برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔"

اس آیت مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نیکی اور بدی کا بدلہ ضرور ملے گا، لیکن چونکہ جن لوگوں کی طرف انبیائے کرام کی بعثت نہ ہوئی ہو وہ بھلائی اور برائی کے درمیان تمیز نہیں کر سکتے

اس لیے ان کا محاسبہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی انہیں سزا دی جا سکتی ہے، تاہم چونکہ اللہ تعالیٰ ہر بھلائی اور برائی کا بدلہ دیں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ساری انسانیت کی طرف انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (فاطر: ۲۴) "اور کوئی امت ایسی نہیں جس میں کوئی خبر دار کرنے والا نہ گزرا ہو۔" منطقی انداز میں باہم مربوط ان تین قوانین کی وضاحت کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔

بعض لوگوں کا یہ خیال درست نہیں کہ انبیائے کرام کی بعثت صرف جزیرہ نمائے عرب میں ہی ہوئی، بلکہ مختلف زمانوں میں زمین کے ہر خطے میں انبیائے کرام کو بھیجا گیا۔ صرف جزیرہ نمائے عرب میں انبیائے کرام کی بعثت کا دعوی قرآنی نصوص کے معارض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں جزیرہ نمائے عرب میں مبعوث انبیائے کرام کی صحیح تعداد کا علم ہے اور نہ ہی دنیا کے دوسرے خطوں کی طرف بھیجے گئے انبیاء کی تعداد معلوم ہے۔ انبیائے کرام کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہو یا دو لاکھ چوبیس ہزار، ہم ان میں سے صرف اٹھائیس انبیائے کرام کو جانتے ہیں، لیکن ان میں سے بھی تین کے بارے میں ہماری معلومات نامکمل ہیں اور ان کے بارے میں سوالیہ نشانات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی اکرم حضرت محمد ﷺ تک صرف اٹھائیس انبیائے کرام کے بارے میں بتایا ہے اور ان میں سے بھی اکثر و بیشتر کی جائے بعثت کا ہمیں علم نہیں، مثلاً کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی قبر "جدہ" نامی شہر میں ہے، لیکن یہ بات کس حد تک درست ہے، ہمیں اس کا علم نہیں۔ جن روایات میں "جدہ" میں حضرت آدم علیہ السلام کے اماں حوّا سے ملنے کا تذکرہ ہے، ان کی صحت بھی ثابت نہیں، لہٰذا ہمیں معلوم نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کہاں سے زندگی کا آغاز کیا اور کہاں فرائض نبوت سرانجام دیئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہمیں کسی قدر زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ وہ بابل اور اناطولیہ کے علاقے میں گھومنے پھرنے کے بعد شام چلے گئے۔ حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں بھی خیال یہ ہے کہ انہوں نے بحیرۂ مردار کے گرد آباد اپنی قوم میں فرائض سرانجام دیئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ "مدین" نامی شہر میں مبعوث

ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مصر میں پرورش پائی اور حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام بحر ابیض متوسط کے علاقے میں رہے۔ ممکن ہے وہ اناطولیہ بھی آئے ہوں، کیونکہ "افسس" میں موجود آثارِ قدیمہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہ السلام سے متعلق آثارِ قدیمہ سے اس احتمال کی تائید ہوتی ہے، تاہم ان میں سے کوئی بھی روایت یقین اور پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

اوپر ذکر کردہ اٹھائیس انبیائے کرام کے سوا ہمیں کسی نبی کے مقام ولادت و نبوت کے بارے میں علم نہیں، لہٰذا اس بارے میں یقینی معلومات کا حصول ناممکن ہے، خصوصاً جبکہ ان کے مذاہب کے نشانات مٹ گئے ہیں اور تعلیمات ناپید ہو چکی ہیں۔

عیسائیت کو ہی لے لیجئے: نیکایا(Nicaea) شہر میں منعقد ہونے والی کونسل نے نصرانی عقیدے کو بدل کر اسے ایک نئے رخ پر ڈال دیا، کیونکہ انہوں نے اس کے عقیدۂ توحید کو "اقانیم ثلاثہ" کے عقیدے میں بدل دیا، جس کے نتیجے میں عیسائیت اپنے ہی پیروکاروں کے ہاتھوں بدترین خیانت کا شکار ہو گئی، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی کتاب کو بھی تحریف کا نشانہ بنایا گیا۔ جب خدائی کتاب میں انسانی تحریف شامل ہو گئی اور توحید کو تثلیث میں بدل دیا گیا تو بعض لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) خدا کا بیٹا قرار دے دیا اور ان کی والدہ حضرت مریم علیہ السلام کی طرف الوہیت کے وصف کو منسوب کیا اور بعض دوسرے لوگوں نے یہ دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ جسم بن کر ان میں حلول کر گئے ہیں۔ یہ گمراہی کی بدترین صورت ہے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بت پرستانہ عیسائیت اور یونان کے بت پرستانہ عقائد اور زیوس اور افروڈائٹ نامی خداؤں کے درمیان کوئی بہت بڑا فرق نہ رہا۔ اپنی کتاب میں تحریف کرنے والوں نے اپنے مذہبی راہنماؤں کو ایسے ہی خداؤں کا درجہ دے دیا، جیسے یونانیوں نے اپنے بڑے لوگوں کو معبود بنالیا تھا۔ انسانی تاریخ میں ساری گمراہیوں کا آغاز اسی طرح ہوا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اگر قرآن کریم ہمیں یہ نہ بتاتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے معزز نبی اور ان کی

والدہ صدیقہ ہیں تو ہم بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کو اسی نظر سے دیکھتے، جس نظر سے یونانی زیوس اور افروڈائٹ کو دیکھتے ہیں۔

بہت سے مذاہب کو انسانوں نے تبدیل اور مسخ کر دیا، جس کے نتیجے میں ان کی الہامی تعلیمات مٹ گئیں، لہٰذا کسی مخصوص علاقے یا معاشرے کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں کسی نبی کی بعثت ہوئی یا نہیں۔ ممکن ہے کنفیوشس نبی ہو، لیکن اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مذاہب کی تاریخ اس بارے میں ناکافی معلومات فراہم کرتی ہے اور جو معلومات موجود ہیں وہ غیر مربوط ہیں، تاہم تاریخ سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ کنفیوشس اور بدھا کسی دور میں گزرے ہیں، انہوں نے دو مذاہب کو متعارف کرایا اور بہت سے لوگ ان کے پیروکار بنے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان مذاہب میں بہت سے انحرافات اور غلطیاں موجود ہیں اور وہ فطرتِ سلیمہ اور سنت الٰہیہ سے ہٹے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان میں گائے کی عبادت، خود سوزی، چھ چھ ماہ تک روزے رکھنے اور اس دوران جنگلوں میں نکل جانے ایسے تصورات موجود ہیں۔ ان وجوہ کی بنا پر انہیں دین کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کسی دور میں وہ سچے مذاہب رہے ہوں، لیکن بعد میں عیسائیت کی طرح تحریف کا شکار ہو گئے ہوں۔

اگر مسلمان اپنے دین کے سرچشموں کی حفاظت کے بارے میں انتہائی حساس نہ ہوتے اور اس کا اہتمام نہ کرتے تو دین اسلام کا بھی یہی انجام ہوتا، تاہم دور حاضر اور ماضی میں اس قسم کی کوششوں کا بالکلیہ انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بعض مسلمان دانستہ یا نادانستہ تاویل و تلفیق کے ذریعے اسلامی تعلیمات کا چہرہ مسخ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، مثلاً کسی شخص کا یہ خیال کہ شراب نوشی اور زناکاری کے ارتکاب کے باوجود وہ صحیح معنوں میں مسلمان رہ سکتا ہے، عملی زندگی میں تحریف کی واضح مثال ہے۔ چوری، جوئے اور سود خوری کی بھی یہی مثال ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ کنفیوشس نبی تھا، کیونکہ غیر نبی کو نبی کہنا ایسے ہی کفر ہے، جیسے کسی نبی کی نبوت کا انکار کرنا کفر ہے۔ یہی بات یورپ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، لیکن اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

سقراط کے بارے میں بھی مختلف آراء ملتی ہیں، لیکن ہم تک اس کی زندگی کے بارے میں پوری معلومات نہیں پہنچیں۔ وہ یہودی فکر سے متاثر فلسفی تھا یا کسی اور قسم کے افکار کا حامل تھا، یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض مفکرین کی رائے میں وہ یہودی فکر سے متاثر تھا، لیکن تاریخی دستاویزات سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ افلاطون کے بقول سقراط اپنے بارے میں خود لکھتا ہے:
"میرے سامنے بعض اشیاء ظاہر ہوتی ہیں (ممکن ہے وہ خیالات ہوں) اور مجھے انسانیت کی راہنمائی کے لیے بعض باتیں الہام کرتی ہیں۔ مجھے بچپن سے ہی علم تھا کہ مجھے خدا کی طرف انسانیت کی راہنمائی کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔" چونکہ اس کے کلام میں کچھ نہ کچھ سچائی پائی جاتی ہے، اس لیے اسے عقل و فلسفہ سے قریب تر یورپی معاشرے کا نبی کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہم سقراط کو نبی نہیں کہتے، کیونکہ اگر وہ نبی نہ ہوا تو ہمارا یہ کہنا کفر کہلائے گا، تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا نبی ہونا محتمل ہے۔

اگرچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار یا دو لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام مبعوث ہوئے، لیکن ہمیں چار انبیائے کرام کے سوا کسی نبی کی جائے بعثت کا علم نہیں، صادق و امین حضرت محمد ﷺ نے ہمیں بتایا ہے کہ انبیائے کرام کی بعثت ہر خطے میں ہوئی ہے۔ اپنے سچے نبی کی احادیث کی روشنی میں ہم زمین کے مختلف خطوں میں انبیائے کرام کی بعثت کی بعض علامات کی طرف اشارہ کریں گے، اگرچہ ہمیں ان کی یقینی تعداد اور جائے بعثت کا علم نہیں۔

پہلی علامت ریاض یونیورسٹی کے ریاضیات کے پروفیسر عادل زینل کی پیش کردہ ہے۔ عادل زینل عراق کے شہر کرکوک کے رہنے والے ہیں اور انہوں نے ریاستہائے متحدہ امریکا سے تعلیم حاصل کی ہے۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ جب میں ریاستہائے متحدہ امریکا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا تو میں وہاں کے اصل باشندوں اور سیاہ فام لوگوں سے میل جول رکھتا تھا۔ مجھے ان قبائل کے دینی شعائر میں اپنے بنیادی عقائد کی جھلک محسوس ہوتی تھی، مثلاً میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ چونکہ اگر دو معبود ہوتے تو کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا، اس لیے اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ ان کی یہ بات درج ذیل آیت مبارکہ سے مطابقت رکھتی ہے:

﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾ (الأنبياء: ۲۲) ”اگر آسمان وزمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین وآسمان درہم برہم ہو جاتے۔“

اگر کسی نبی نے انہیں یہ بات نہ بتائی ہوتی تو ان سیاہ فام لوگوں کے لیے اس حقیقت تک رسائی ممکن نہ ہوتی۔ ان سیاہ فام لوگوں کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا: ”اللہ ایک ہے۔ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔“ اس حقیقت تک کسی عالی دماغ شخص کی رسائی ہی ہو سکتی ہے، کیونکہ ولادت انسانیت کا خاصہ ہے اور اس کی ضرورت اسے ہی پیش آتی ہے جو اس کا محتاج ہوتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر کسی نبی نے انہیں ان باتوں کی تعلیم نہیں دی تو انہیں ان باتوں کا ادراک کیسے ہوا؟ لہٰذا صرف متمدن اور تعلیم یافتہ قوموں میں پائے جانے والے اعلیٰ اور عمیق عقائد کا ایسے غیر متمدن قبائل میں از خود پایا جانا ناممکن ہے، جو ابھی تک آگ کے الاؤ کے گرد رقص کرتے اور عمر رسیدہ افراد کو ذبح کر کے کھا جاتے ہیں۔ اس کی صرف ایک ہی توجیہہ ممکن ہے کہ کسی نہ کسی نبی کے واسطے سے انہیں ان حقائق کا علم ہوا ہے۔

ایک بے دین منکرِ خدا ڈاکٹر مصطفی محمود آج کے فیشن کے مطابق مادہ پرستانہ فلسفہ کے داعی تھے، لیکن جب انہوں نے اسلام کا قریب سے گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا تو ان کا نقطہ نظر یکسر بدل گیا۔ یہ مفکر افریقہ کے اپنے ایک سفر کی روداد لکھتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جب وہ ماوماو اور نیام نیام نامی قبائل کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان سے ان کے عقیدے کے بارے میں دریافت کیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ ہم آسمان میں موجود ایک ایسے معبود پر ایمان رکھتے ہیں، جو زمین کا نظام چلاتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ آسمان وغیرہ کسی مکان میں نہیں سماتے، لیکن جیسا کہ آیت مبارکہ: ﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى﴾ (طٰہٰ: ۵) ”یعنی رحمان جو عرش پر جلوہ افروز ہوا۔“ سے معلوم ہوتا ہے خدائی احکام و اوامر آسمان سے اترتے ہیں، اسی لیے ہم دعا کے وقت ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں۔ ڈاکٹر مصطفی محمود مزید لکھتے ہیں: ”میں نے انہیں سورت اخلاص سے ملتے جلتے مفہوم پر ایمان رکھتے اور تذکرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کسی چیز کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کا کوئی ماں باپ

ہے اور نہ ہی کوئی ہمسر و شبیہ۔" وہ ایک اور قبیلے کے پاس گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ اگر چہ وہ ابھی تک بیماروں اور عمر رسیدہ افراد کو ذبح کر کے کھا جاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اللہ کے بارے میں ان کا عقیدہ قرآن کے عقیدۂ توحید سے ملتا جلتا ہے۔" اگر یہ عقائد ان تک کسی نبی کے ذریعے سے نہ پہنچے تو ان کے لیے ان تک پہنچنا ممکن ہوتا، لہٰذا آغاز میں کسی نہ کسی نبی نے اس عقیدے کی تبلیغ و اشاعت کی ہوگی، جو باپ دادا سے اولاد کی طرف منتقل ہوتے ہوئے دورِ حاضر تک پہنچ گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم اور تاریخی حقائق اس طرف مشیر ہیں کہ زمین کے ہر خطے میں انبیائے کرام مبعوث ہوئے ہیں، گو ہمیں ان کی تعداد کا یقینی طور پر علم نہیں۔

جہاں تک خواتین کے نبی کی حیثیت سے مبعوث ہونے کا تعلق ہے تو علمائے اہل السنت والجماعت اور جمہور محدثین کسی خاتون کے نبی کی حیثیت سے مبعوث ہونے کے قائل نہیں اور حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت آسیہ علیہا السلام کی نبوت سے متعلق وارد احادیث شاذ اور ضعیف ہیں۔ حاصل یہ کہ عورتوں کی نبوت کے بارے میں کوئی یقینی حکم نہیں لگایا جاسکتا، نیز کسی عورت کا نبی نہ ہونا کوئی عیب کی بات نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی تخلیق مثبت اور منفی کی بنیاد پر کی ہے۔ ایک جیسی اشیاء میں تنافر پایا جاتا ہے۔ اگر ایٹم میں اس کے اجزاء کو یکجہت رکھنے والی غیر معمولی طاقت نہ ہوتی تو اس کے ایک جیسے اجزاء میں تنافر پایا جاتا۔ ایٹم سے لے کر کہکشاؤں تک ہر چیز میں یہ قانون جاری ہے۔ چونکہ چھوٹے چھوٹے ذرات سے ترکیب پانے والا حضرت انسان عالم صغیر (ایٹم) اور عالم کبیر (کائنات) کے درمیان حلقۂ وسط کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے اس پر بھی یہی قانون جاری ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں اس کے بھی ایک دوسرے سے مختلف جوڑے ہونے چاہئیں، تاکہ ان میں ایک دوسرے کی طرف کشش پیدا ہو۔ ان میں سے ایک میں ضعف اور دوسرے میں قوت کا ہونا ہی ان کے درمیان محبت کے پائے جانے اور خاندان کے تشکیل پانے کا سبب ہے۔

آج عورتوں کے مردوں جیسے طور اطوار سیکھنے کا نتیجہ مسخرہ پن اور مشکلات کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ عورت کو نسوانیت سے نکال کر مردوں جیسے طور اطوار سکھانے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ

عورت مرد سے الجھنے لگی ہے، جس کے نتیجے میں خاندان اپنے سربراہ اور اطمینان دونوں سے محروم اور بچے خاندانی ماحول سے دور ہوگئے، کیونکہ ان کے والدین انہیں نرسری ہومز کے حوالے کر کے خود خواہشات کے پیچھے دوڑنے لگے ہیں۔

عورتوں کے بارے میں اس عمومی خدائی قانون سے عورتوں کی نبوت کے معاملے پر بھی روشنی پڑتی ہے، نیز عورتوں سے ولادت کا معاملہ بھی وابستہ ہے۔ اگر یہی صورتحال مردوں کو پیش آتی تو وہ بھی نبی بننے کی اہلیت سے محروم ہو جاتے، کیونکہ ایسی صورت میں ماہواری کی وجہ سے ہر ماہ تقریباً ایک ہفتہ فرائض نبوت وامامت اور صوم وصلوۃ کی ادائیگی نہ کر سکتے۔ نفاس کی مدت اس پر مستزاد ہے، نیز حمل کے ایام میں نبوت کی ذمہ داری ادا کرنا مشکل ہوتا، کیونکہ اگر بچہ گود یا پیٹ میں ہو تو جنگوں میں شرکت محال اور عسکری وانتظامی منصوبہ سازی دشوار ہوتی ہے، جبکہ نبی کے لیے جنگ کی صف اول میں شریک ہونا ضروری ہوتا ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر عورت کا نبی ہونا محال ہے، نیز انہی جسمانی موانع کے وجہ سے عورت کی عبادت ناقص ہوتی ہے، کیونکہ ماں ہونے کی حیثیت سے عورت کو بچے جننے اور ان کی تربیت کرنا پڑتی ہے، جبکہ نبی کی شخصیت ایک قابل تقلید مرشد، امام اور قائد کی ہوتی ہے، تاہم عورتوں کے مسائل کے بارے میں نبی کی ازواجِ مطہرات تعلیم وتبلیغ کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ کو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں تو ہم اپنی مرضی کے مطابق عبادت کیوں نہیں کر سکتے؟

اللہ تعالیٰ کی عبادت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی معرفت پر موقوف ہے۔ انسان اس کائنات کے حسین مناظر اور اس میں جاری وساری نظم ونسق کے دلائل دیکھتا ہے تو اس نظام سے اسے چلانے والے تک پہنچتا ہے۔ اس کائنات کو غور سے دیکھنے والے پر یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ اس میں کوئی بھی چیز بے فائدہ اور بغیر ترتیب کے نہیں پیدا کی گئی ہے، جس کے نتیجے میں وہ بھی اس نظام کے تحت زندگی گزارنے کو ضروری خیال کرتا ہے۔

اسی طرح اگر انسان کائنات کو حسن وجمال کے پہلو سے دیکھے تو اسے ایسے حیرت انگیز اور خارق العادت حسن وجمال کا مشاہدہ ہو گا کہ اس سے زیادہ حسین وجمیل منظر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انسان سے لے کر زمین وآسمان اور ستاروں کے محیر العقول اور دلفریب حسن وجمال کو دیکھ کر یہ ممکن نہیں کہ انسان اس کے پیچھے کائنات اور حسن وجمال کے خالق کو نہ دیکھ سکے۔ یہ غور وفکر انفس میں ہو یا آفاق میں(23) جب بھی انسان خوبصورت ترین شاہکاروں اور فن کے شاہپاروں سے بڑھ کر حسین صفاتِ الٰہیہ کو خوبصورت پتنگوں کی مانند چمکتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کا دل خوشی ومسرت سے اس بچے کی طرح سرشار ہو جاتا ہے، جو خوشی سے اچھلنا کودنا اور شور مچانا چاہتا ہے۔ انسان بھلائی اور حسن وجمال کا سرچشمہ بننے والی ان صفات پر حیرت واستعجاب کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور کائنات کے مالک کا تصور کر کے اس کی عظمت وجلال سے ہوش وحواس کھونے لگتا ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے کائنات کی ہر چیز پہلے کہیں اور تیار کی گئی ہے اور پھر حضرتِ انسان کے استعمال کے لیے پیش کی گئی ہے۔ بہت سی نعمتیں انسان کو محفوظ پیکنگ اور مختلف قسم کے پھلوں کی صورت میں پیش کی جاتی ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے ساری زمین ہر قسم کے کھانوں سے چنے ہوئے دستر خوان کا سماں پیش کر رہی ہو۔

جب انسان ان نعمتوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے تو ان نعمتوں کے حقیقی مالک کے وجود کو محسوس کرتا ہے اور اس احساس سے اسے خاص قسم کی لذت محسوس اور خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ اگر بچے کو اپنی ماں کی چھاتی سے دودھ پیتے ہوئے شعور ہوتا تو وہ یہ سمجھتا کہ اس قدر مفید غذا اس کے فائدے کے لیے کسی دوسرے عالم سے آرہی ہے اور واقعات کے ان تمام مظاہر کے پیچھے کوئی احسان کرنے اور رزق دینے والی کریم ذات موجود ہے اور یہ سوچ کر تعظیم سے اس کی گردن جھک جاتی۔

ہر انعام واحسان جہاں اس انعام واحسان کے مالک کا پتا دیتا ہے، وہیں اس کی عزت کرنے اور احترام بجالانے کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ ہمیں جہاں کہیں بھی کسی نعمت، جمال یا نظام کا مشاہدہ ہو، ہمیں اس نعمت، جمال یا نظام کے حقیقی مالک کے سامنے اظہارِ بندگی کرنا چاہیے، دوسرے لفظوں میں جب بھی اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے وجود کا احساس دلائیں ہمیں فوراً اس کی بندگی بجالانی چاہیے، اسی لیے معتزلہ اور کسی حد تک ماتریدیہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کسی بھی نبی کی بعثت نہ ہوئی ہوتی اور کوئی بھی مرشد انسانیت کی اللہ تعالیٰ کی طرف راہنمائی نہ کرتا تو بھی کائنات میں موجود نشانیاں اور دلائل انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہوتے اور انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے اور اس معرفت کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے کا پابند ہوتا۔ ماتریدیہ کے نقطہ نظر کی تائید میں مختلف مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، مثلاً اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے بعض معاصرین نے بتوں سے بھرے ہوئے کعبہ کے پاس پرورش پائی اور انہیں کسی نے بھی توحید کے حقائق کی تعلیم نہیں دی، لیکن اس کے باوجود ان کے احساسات اس بدو کے احساسات جیسے تھے، جس نے کہا تھا: ''جب مینگنی اونٹ پر اور نشاناتِ قدم چلنے والے پر دلالت کرتے ہیں تو گھاٹیوں والی زمین اور برجوں والا آسمان لطیف وخبیر ذات پر کیسے دلالت نہیں کر سکتا۔''

جب صحراء میں تا حد نگاہ پھیلی ہوئی ریت کے سوا کچھ نہ دیکھنے والے ایک بدو کا یہ تجزیہ ہے تو دوسرے انسان اس نتیجے پر کیوں نہیں پہنچ سکتے۔ رسول اللہ ﷺ انسانیت کی نجات کے لیے ایک عظیم لائحہ عمل لائے تھے۔ اگر یہ تعبیر درست ہوتی تو ہم کہہ دیتے کہ آپ ﷺ مافوق

الانسان ہستی تھے۔ آپ ﷺ نے نبوت سے پہلے کائنات کی حقیقت کو پالیا تھا اور اللہ تعالیٰ کے وجود کو محسوس کر کے غار حراء میں تلاش، غور و فکر اور عبادت کا سلسلہ شروع فرمادیا تھا۔

صحیح بخاری میں ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ غار حراء میں عبادت کیا کرتے تھے اور مکہ مکرمہ صرف توشہ لینے کے لیے آتے تھے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنے ادراک کے ذریعے بعض اشیاء کو دریافت کر کے کسی نہ کسی حد تک اللہ تعالیٰ کی بندگی بجالا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں زید بن عمرو کی بستر مرگ پر کہی گئی بات قابل توجہ ہے۔ زید بن عمرو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے چچا تھے۔ انہوں نے اپنی وفات سے کچھ دیر پہلے اپنے خاندان کے تمام افراد کو بلایا اور انہیں اپنے گرد جمع کر کے نبی منتظر کے اوصاف کے بارے میں جو کچھ وہ جانتے تھے، بتایا۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کو دیکھنا نصیب نہ ہوا، دوسرے لفظوں میں انہوں نے ساحل تک اپنا گھوڑا دوڑایا، لیکن وہ اسلام کے سفینے میں سوار نہ ہو سکے، لیکن انہیں رسول اللہ ﷺ کے زمانۂ ظہور کا پوری طرح احساس تھا اور ان کا انگ انگ "حقیقت احمدیہ" سے واقف تھا، تاہم اپنے احساس کو تعبیر کرنے کے لیے ان کے پاس الفاظ نہ تھے۔ وہ کہا کرتے تھے: "افق پر نور الٰہی کا سپیدہ طلوع ہو رہا ہے اور مجھے اس کے ظہور پذیر ہونے کا یقین ہے، گویا میں اس کے آثار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔" پھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر کہا کرتے تھے: "اے عظیم خالق! میں آپ کا کماحقہ ادراک نہ کر سکا۔ اگر میں آپ کا ادراک کر سکتا تو میں آپ کی کماحقہ عبادت کرتا اور آپ کی عظمت کے اعتراف کے طور پر قیامت تک سر بسجود رہتا۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ روشن ضمیر انسان بت پرستانہ معاشرے میں پیدا نہ ہوا ہوتا تو وہ اس کائنات اور اس کے نظام میں غور و فکر کے نتیجے میں خدا تعالیٰ کی بندگی کے فرائض بجالاتا۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتے ہی بندگی شروع ہو جاتی ہے، لہٰذا جب تک ہم پر انعامات کی اس قدر بارش کرنے والی ذات موجود ہے، اس وقت تک بندگی بھی موجود ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں بندگی کے اس احساس کو ودیعت کر دیا ہے، اسی احساس کے نتیجے میں زید بن عمرو نے کہا تھا: "... میں آپ کی عظمت کے اعتراف کے طور پر

قیامت تک سر بسجود رہتا۔ ''صرف آسمانی وحی ہی بندگی کا صحیح طریقہ بتا سکتی ہے اور اس کے نتیجے میں اسے خدائی احکام کے دائرے میں رکھتے ہوئے انحراف سے بچاتی ہے، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ بندے سے فرماتے ہیں: ''میں اللہ ہوں اور تو میرا بندہ ہے۔ تونے مجھے میرے انعامات کی وجہ سے پہچانا ہے اور میں تجھے اپنی یاد دلانے کے لیے آدابِ بندگی سکھاؤں گا۔ سب سے پہلے وضو کر اور پھر اپنے نفس کا مقابلہ کرنے کے لیے میرے سب سے بڑے ہونے اور دوسری ہر شے کے چھوٹے اور کمزور ہونے کا تذکرہ کر، اس کے بعد خضوع کی علامت کے طور پر اپنے ہاتھ اپنے سامنے باندھ کر حتی الامکان عبادت میں دھیان پیدا کرنے کی کوشش کر اور جس مقام کی طرف رسول اللہ ﷺ نے پرواز کی تھی اس مقام تک روحانی بلندی حاصل کرنے میں رغبت کا اظہار کر، اس کے بعد شکر بجالاتے ہوئے رکوع کر۔ جب بھی تو رکوع کے لیے جھکے گا نئی نئی چیزوں کو پائے گا، اس کے بعد تواضع کا اعلیٰ ترین مقام پانے کے لیے سجدے میں چلا جا، اس کے بعد کھڑا ہو جا، لیکن تیری حالت یہ ہو کہ دوبارہ سجدے میں جانے کے لیے تیرا دل بے چین ہو۔'' کیونکہ اس حالت میں دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ حدیث پاک میں ہے: ''بندے کو اپنے پروردگار کا سب سے زیادہ قرب سجدے کی حالت میں نصیب ہوتا ہے۔'' نیز ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَتَقَلُّبَکَ فِی السَّاجِدِیْنَ﴾ (الشعراء: ۲۱۹) ''اور نمازیوں کے ساتھ تمہارے رکوع اور سجود کو بھی دیکھتا ہے۔'' آپ اپنے آپ کو جس قدر سجدے کے ماحول اور تقاضوں سے ہم آہنگ کریں گے، آپ کو اسی قدر بلند معراج نصیب ہوگی، جو کہ نماز کا اصل مقصود ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عبادت کا حاصل اللہ پر ایمان لانا اور اس کی ذات کی معرفت حاصل کرنا اور پھر محبت اور تعظیم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ارشادات اور احکام کی روشنی میں اس معرفت کے تقاضوں پر عمل کرنا ہے۔

اوپر ذکر کردہ تفصیل سے اس موضوع کے ایک پہلو کی وضاحت ہو جاتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت ہم سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم ناسمجھی کا مظاہرہ کریں اور نہ ہی کوئی نامناسب کام کریں، بلکہ واضح آیات کی روشنی میں نبی اکرم ﷺ کے نورانی ارشادات کی پیروی کرتے ہوئے ہمہ وقت رضائے الٰہی کی جستجو میں رہیں۔

اس موضوع کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان کو زندگی کے تمام شعبوں میں خواہ ان کا تعلق تجارت کے ساتھ ہو یا علم وفن کے ساتھ، زراعت کے ساتھ ہو یا صنعت کے ساتھ، ہمیشہ کسی نہ کسی مربی سے بہت سے امور سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فرض کریں آپ میں سے ہر ایک کوئی مخصوص کاروبار کرتا ہے، مثلاً ایک شخص ٹیکسٹائل مل کا مالک ہے، دوسرا پلاسٹک تیار کرتا ہے اور تیسرا گفٹ شاپ چلاتا ہے۔ فرض کریں تجارت کے اصولوں سے واقف ایک تجربہ کار شخص ہماری مصلحت کی خاطر اور ہمیں نقصان سے بچانے کے لئے ہم سے تمام سرگرمیاں عمدگی سے انجام دینے کا مطالبہ کرتا ہے اور ہمیں اکھٹا کر کے ہم سے کہتا ہے: "چونکہ یہ کام ضروری ہے، اس لیے آپ اسے سرانجام دے سکتے ہیں، لیکن اسے عمدگی سے سرانجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ آپ محنت اور سرمائے کے عوامل کو بہتر انداز سے استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ میانہ روی اختیار کریں اور فضول خرچی سے بچیں، نیز فلاں فلاں تدابیر اختیار کریں"...

اگر ہم ذرا بھی انصاف سے کام لیں تو ہم اس شخص کی پندونصیحت کو غور سے سنیں گے اور اس کی ایک ایک بات کو سمجھ کر اپنے کاروبار کو اس کے مطابق ترتیب دیں گے، کیونکہ ان ہدایات سے اس کا کوئی مفاد وابستہ نہیں، بلکہ ان میں سراسر ہمارا فائدہ ہے، اسی طرح ہم طاعات وعبادات اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں ادا کرتے، بلکہ جس انداز اور شکل وصورت میں ہمارے خالق و معبود نے انہیں سرانجام دینے کا حکم دیا ہے، اس کے مطابق ان کی ادائیگی کرتے ہیں، کیونکہ خالق کے بتائے ہوئے ہر طریقے میں روح کی تقویت کا سامان ہے، جس کے نتیجے میں ہماری عبادات ایسی بابرکت بنتی ہیں، جیسے ایک خوشے سے سات خوشے پیدا ہوتے ہیں۔ نہ معلوم ہم "اللہ اکبر" کہتے ہوئے کسی ایسے بٹن کو دبا دیں، جس سے ہم پر رحمت الٰہیہ اور الہام کے دروازے کھل جائیں یا سورت فاتحہ پڑھتے ہوئے کسی خفیہ کوڈ والے تالے کی کوئی خفیہ چابی ہمارے ہاتھ لگ جائے۔ نہ جانے نماز کے ایک ایک رکن کی ادائیگی میں ہمارے سامنے کتنے خفیہ دروازے کھلتے ہوں گے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم سجدہ کرتے ہیں تو تمام راستے درست اور تمام دروازے کھل جاتے ہیں اور ہماری دعائیں مقام الوہیت کی طرف بلند ہوتی ہیں اور ہمیں معزز فرشتے گھیر

لیتے ہیں۔ بھلا ایسا ہونے کا کون انکار سکتا ہے؟ سچی خبر دینے والے نے اپنی بلیغ اور نورانی گفتگو میں ہمیں ایسا ہونے کی خبر دی ہے، لہٰذا عبادت کا افضل طریقہ وہی ہے جو ہمارے پروردگار نے ہمیں بتایا ہے، کیونکہ جس خدا نے انسانی مشین کو بنایا ہے وہ اس مشین کے طریقۂ استعمال سے زیادہ واقف ہے اور اس بارے میں زیادہ بہتر جانتا ہے کہ دنیوی اور اخروی معاملات میں اس سے بہتر سے بہتر نتائج کیسے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ جس ذات نے اس مشین کو بنایا ہے اس نے اس کے ساتھ ایک "ہدایات نامہ" بھی فراہم کیا ہے، لہٰذا اگر اس مشین کو دانش مندانہ اور درست انداز سے چلانا مقصود ہے تو اس "ہدایات نامے" کو بغور پڑھنا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ عبادت جیسے جی چاہے ادا نہیں کی جاسکتی، بلکہ اسے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور ارشادات کی روشنی میں ادا کرنا ضروری ہے اور یہی اس کی افضل ترین صورت ہے، جو امت محمدیہ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل واحسان ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے وہی دعا مانگتے ہیں جو رسول اکرم ﷺ نے مانگی تھی کہ ہمیں آنکھ جھپکنے کی مقدار بھی اپنے نفس کے حوالے نہ کیجئے۔

غیر مسلم ممالک میں پیدا ہونے والے لوگوں کے ساتھ قیامت کے دن کیا برتاؤ ہو گا؟

یہ سوال ماضی میں بھی اٹھایا گیا ہے اور اب بھی مسلسل کیا جا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوال محض بحث مباحثے کے لیے اٹھایا جاتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو اس لیے جنت میں جائیں گے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن عالم اسلام سے دور واقع علاقوں مثلاً پیرس، لندن اور ماسکو وغیرہ میں پیدا ہونے والے لوگ جنہیں وہ مواقع میسر نہیں جو ہمیں میسر ہیں اور ان تک وہ نور نہیں پہنچا جو ہم تک پہنچا، کیا جہنم میں جائیں گے؟ ایسے سوال کے دو پہلو ہیں:

اول: رحمت الٰہیہ سے زیادہ رحمت کا اظہار

دوم: اسلام پر مبہم انداز میں تنقید

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ معروف عقیدے کے برخلاف کوئی ایسا کلی قاعدہ یا اصول نہیں ہے، جس کے مطابق ایسے تمام لوگ جہنم میں جائیں گے، بلکہ اصل قاعدہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے نورِ ہدایت کی پیروی کرنے کی بجائے اس سے منہ پھیرا اور اس کی مخالفت کی ان کا ٹھکانہ جہنم اور ان کا انجام خسرانِ مبین ہے۔ ہم ہر چیز پر حاوی رحمت خداوندی سے امیدوار ہیں کہ وہ ہمیں کفر و الحاد کے اس دور میں آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلنے والوں میں شامل رکھے۔

قرآن کریم اور سنت نبویہ کے مضامین کی عقلی، منطقی اور فلسفیانہ انداز سے تشریح کرنے اور انہیں فکری اعتبار سے تقویت پہنچانے کے لیے اپنی کوشش صرف کرنے والے متکلمین نے اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، تاہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے کی فرصت نہ پانے والوں اور اسے سننے کے بعد عناد کی بنا پر رد کرنے والوں کا انجام ایک جیسا ہو گا یا ان دو گروہوں کے درمیان امتیاز برتا جائے گا؟

ذہن میں کچھ اور سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں: کیا جن اہم مسائل و مشکلات کا ہمیں سامنا ہے ان کے ہوتے ہوئے اس قسم کے سوالات لائقِ توجہ ہیں؟ کیا اس قسم کے سوالات کے جوابات دینے

میں ہمارا دنیوی و اخروی اعتبار سے کوئی حقیقی فائدہ ہے؟ بڑے بڑے ائمہ کرام نے اس قسم کے سوالات اور مسائل کے حل پیش کرنے کے لیے انتھک محنت کی۔ آئندہ سطور میں ہم سب سے پہلے اس متنازع موضوع سے متعلق علمائے عقائد کے نقطہ ہائے نظر پیش کریں گے۔

اہل سنت کے دو معتبر عقائدی مسالک میں سے ایک مسلک اشعری ہے، جس کے مطابق جس شخص نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں کوئی حقیقت سنی اور نہ ہی اس تک اس کی دعوت پہنچی اسے "اہل فترت" میں شمار کیا جائے گا، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہاں جب اور جیسے رہے وہ نجات پائے گا۔ اگر آپ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو دنیا کے کونے کونے تک نہیں پہنچائیں گے تو اشاعرہ کے نقطۂ نظر سے جن علاقوں تک رسول اللہ ﷺ کی دعوت نہیں پہنچے گی ان کے باشندے اہل نجات میں سے ہوں اور اللہ تعالیٰ انہیں کسی نہ کسی طرح بدلہ عطا فرما کر جنت میں داخل فرمائیں گے۔

دوسری طرف ماتریدیہ کا نقطہ نظر معتزلہ کے نقطۂ نظر سے قریب تر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنی فکر اور عقل کے ذریعے خدا تعالیٰ تک پہنچ گیا، قطع نظر اس کے کہ وہ اسے کس نام سے پکارتا ہے تو قیامت کے دن نجات پائے گا، لیکن اگر وہ اپنی عقل کے ذریعے خدا تک نہ پہنچا تو اس کی ہرگز نجات نہ ہوگی۔

اگرچہ یہ دونوں نقطہ ہائے نظر بالکل ایک جیسے نہیں ہیں، لیکن ان کے درمیان معمولی فرق پایا جاتا ہے، کیونکہ ماتریدیہ کہتے ہیں کہ انسان کوہ و دمن میں ہو یا صحراء و دشت میں غرض کہیں بھی ہو اسے اپنے ارد گرد خالق کائنات کی طرف اشارہ کرتی بہت سی نشانیاں اور دلیلیں ملیں گی، مثلاً شمس و قمر کا طلوع و غروب ہونا، ستاروں کا آسمان پر جگمگانا، اشیائے زینت سے مزین زمین، پہاڑوں اور ان کی ہیبت، میدان اور وادیاں اور ان میں بہتی نہریں، درختوں اور جڑی بوٹیوں کے مناظر اور پھولوں کی رعنائیاں... غرض یہ سب چیزیں انسان کو اپنی فصیح و بلیغ زبان میں خالق کائنات کا پتا بتاتی ہیں۔ جس انسان میں تھوڑا سا بھی شعور ہو وہ اس جمال کے تمام مظاہر کے پیچھے کسی خفیہ ہاتھ کو کام کرتے پائے گا، جس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ خالق کا وجود ناگزیر ہے۔ ایسا شخص نجات پائے گا، گو وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے انبیاء و رسل سے واقف نہ ہو۔

لہٰذا غیر مسلم ممالک میں رہنے والے لوگوں کے بارے میں ہمیں بلا تحقیق یہ نہیں کہنا چاہیے کہ کیونکہ وہ ایمان نہیں لائے، اس لیے وہ جہنم میں جائیں گے۔ یہ نہ صرف درست نہیں، بلکہ سرے سے جائز ہی نہیں ہے، کیونکہ بڑے بڑے ائمہ کرام کی آراء ہمیں اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ اس کا تقاضا کم از کم یہ ہے کہ ہم اس سلسلے میں خاموشی اور سکوت اختیار کریں۔ امام اشعری رحمہ اللہ اپنے نقطہ نظر کی تائید میں آیت مبارکہ ﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولاً﴾ (الاسراء: ۱۵) "اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔" اور اس جیسی دیگر آیات پیش کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے اللہ تعالیٰ کسی ایسی قوم کو عذاب نہیں دیتے جنہوں نے کسی نبی کو نہ دیکھا ہو، لہٰذا جن لوگوں نے کسی نبی کو دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں سنا انہیں عذاب نہیں دیا جائے گا۔

دوسری طرف امام ماتریدی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ عقل ایک اہم معیار ہے جو اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکتا ہے، لہٰذا انسان اپنی عقل پر اعتماد کرتے ہوئے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ چیز بری ہے اور یہ اچھی ہے... اگرچہ یہ گمان بھی غلط ہے کہ عقل ہر چیز کا ادراک کر سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اچھائیوں کا حکم دیا ہے اور برائیوں سے روکا ہے اور اس معاملے کو سہو و خطا کا احتمال رکھنے والی عقل پر نہیں چھوڑا، بلکہ اس معاملے کو وحی سے وابستہ کر کے اپنے انبیاء و رسل کے ذریعے اس کی خوب وضاحت فرمائی اور کسی بھی معاملے میں ابہام اور پیچیدگی نہیں رہنے دی۔

ماتریدیہ کے نقطہ نظر سے عقل زنا کی قباحت کا ادراک کر سکتی ہے، کیونکہ اس سے انساب غیر محفوظ اور خلط ملط ہو جاتے ہیں، نیز اگر عورت اپنی عفت کی حفاظت نہ کرے اور اس کے بچوں کا نسب معلوم نہ ہو تو یہ نہیں پتا چلے گا کہ کون کس کا وارث ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عقل کے ذریعے زنا کی قباحت معلوم ہو سکتی ہے، اسی طرح عقل کے ذریعے چوری کی برائی بھی جانی جا سکتی ہے، کیونکہ جس مال کو کسی شخص نے محنت و مشقت سے کمایا ہو، اسے اس کی اجازت کے بغیر لینا عقلاً برا ہے۔ عقل شراب اور نشہ آور اشیاء کی برائی کا ادراک بھی کر سکتی ہے، کیونکہ ان کے انسانی نسل پر نقصان دہ اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، نیز یہ مختلف قسم کی بیماریوں کا سبب بھی بنتی ہیں۔ اس سلسلے میں اور بھی بہت سے اشیاء کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

یہی بات اچھی باتوں کے بارے میں بھی درست ہے، چنانچہ عقل کے ذریعے عدل، انصاف قائم کرنے، دوسرے کے ساتھ احسان کرنے اوران کی مدد کرنے کی اچھائی کا ادراک کیا جاسکتاہے۔ قرآن کریم اور سنت نبویہ نے بھی ان کا حکم دیاہے اوران کی وضاحت کرکے ہمیں لغزشوں سے بچایاہے۔

یہی بات اللہ پر ایمان لانے پر بھی صادق آتی ہے کہ وہ اچھی چیز ہے، کیونکہ اس کے ذریعے انسان کو قلبی سکون نصیب ہوتاہے، جس کے نتیجے میں وہ پر سعادت زندگی گزارتاہے اور دنیامیں ہی آخرت کے مزوں کا کچھ نہ کچھ لطف اٹھاتاہے، اسی طرح عقل ودانش کے ذریعے ایمان تک بھی پہنچاجاسکتاہے، یہی وجہ ہے کہ صحراء میں رہنے والے ایک بدونے بھی اس بات کو محسوس کرلیاتھا، جب وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوااوراس سے پوچھا گیاکہ اس نے اپنے رب کو کیسے پہنچاناتواس نے جواب دیا: ”جب مینگنی اونٹ پر اور نشاناتِ قدم چلنے والے پر دلالت کرتے ہیں تو گھاٹیوں والی زمین اور برجوں والا آسمان لطیف وخبیر ذات پر کیسے دلالت نہیں کرسکتا۔“

اس سے ثابت ہوتاہے کہ ایک سادہ لوح بدواوراونٹوں کو چرانے والا شخص بھی اپنی عقل کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچاکہ تمام اشیاء کی مالک اور ہر چیز کا علم رکھنے والی کوئی ذات موجود ہے، لہذاایمان کے بارے میں عقل کی اہمیت کو بالکلیہ نظر انداز نہیں کیاجاسکتا۔

اسی بنیادپر ماتریدیہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی عقل کے ذریعے اپنے رب کو پاسکتاہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ فترت میں بہت سے لوگوں نے خداکے وجود کو محسوس کیاتھا، انہی لوگوں میں سے ایک ام المؤمنین حضرت خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہاکے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل بھی تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو اپنی اصلی صورت میں مشرق ومغرب میں پر پھیلائے دیکھاتو آپ ﷺ خوف زدہ ہوگئے اوراس بارے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو بتانے کے لیے دوڑے۔ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، جنہوں نے بتوں کی پوجاترک کردی تھی، کیونکہ انہیں احساس ہو گیاتھاکہ یہ نفع ونقصان نہیں پہنچاسکتے، اس طرح انہوں نے اپنی عقل کے ذریعے خداکو پالیاتھا۔

انہی لوگوں میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے چچا "زید" بھی تھے، جنہوں نے بتوں سے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ کہا کرتے تھے: "یہ سب باطل ہیں اور عبادت کے مستحق نہیں۔ ایک خالق موجود ہے، لیکن میں اس کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔" جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے اعزہ واقارب کو جن میں حضرت عمر بن خطاب اور ان کے بیٹے سعید بن زید بھی شامل تھے، جمع کر کے کہا: "میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا ایک دین ہے اور اس دین کے ظہور کا وقت قریب آچکا ہے۔" نبی اکرم ﷺ نے ابھی تک نبوت کا اعلان نہیں فرمایا تھا یا یہ آپ ﷺ کی نبوت کے ابتدائی ایام تھے، لیکن زید نے نئے نبی اور نئے دین کے ظہور کو پہلے ہی محسوس کر لیا تھا، اسی لیے وہ کہا کرتے تھے: "مجھے معلوم ہے کہ یہ دین ظاہر ہونا ہی چاہتا ہے، لہٰذا جب اس دین کا ظہور ہو اسے فوراً قبول کر لینا۔" وہ بتوں کے بارے میں کہا کرتے تھے: "جن بتوں کو انسانی ہاتھوں نے بنایا ہے وہ انسان کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے، بلکہ وہ خود ان کے محتاج ہیں، لہٰذا وہ کیسے دوسروں کی مدد کر سکتے ہیں؟"

جب اس قدر سادہ فکر کے لیے یہ ممکن ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً تمام انسانوں کے لیے زمین وآسمان کے خالق ومالک تک رسائی پانا ممکن ہے۔ زید اور ورقہ نے اپنے اعزہ واقارب کے دلوں میں ہدایت کا چھوٹا سا دریچہ کھول دیا تھا، یہی وجہ تھی کہ جب سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ نے دعوت کا آغاز فرمایا تو آپ ﷺ کو انہی میں سے بہترین حمایتی اور ایمان لانے والے میسر آئے اور عقل ودانش نے مزید کام وحی کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اسے لامحدود آفاق تک لے جائے۔
اب ہم اس سوال کی طرف دوبارہ آتے ہیں کہ کیا عالم اسلام سے باہر پیدا ہونے والا ہر شخص سیدھا جہنم میں جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس شخص نے قرآن کریم کو سنا اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو دیکھا، لیکن آپ ﷺ کی نبوت کی صحت کو پرکھنے کے لیے کسی قسم کی کوشش نہ کی تو وہ جہنم میں جائے گا، لیکن جس شخص کو یہ موقع میسر نہ آیا اور کفر کی تاریکی میں پروان چڑھا اور اسی پر عمر بھر قائم رہا اس کے بارے میں ہمیں امید ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت سے محروم نہ رہے گا، لہٰذا اسے ملامت کیا جائے گا اور نہ ہی اس سے کسی چیز کا مواخذہ ہوگا۔

چونکہ اس موضوع کا ایک اور پہلو بھی ہم سے متعلق ہے، اس لیے مجھے اس پر بھی گفتگو کرنے کی اجازت دیجئے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کے پیغام رسالت کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچا کر اسلام کی بہترین نمائندگی کی اور دلوں کو نورِ اسلام سے منور کیا۔ جب ہم ان کے حالات پڑھتے ہیں تو پیغام رسالت کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرتے ہوئے وہ جس بلند حوصلگی کا مظاہری کرتے تھے، وہ ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ اس دور میں انسانیت کے لاپروا اور غیر متعلق رہنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ کسی سے بھی نہ ڈرنے والے ان بہادروں نے ساری انسانیت کے دلوں کو جیتا اور اسلام کی دعوت اتنے جوش و خروش سے دی کہ اسے دنیا کے ہر انسان نے سنا۔

انہوں نے اسلام کو بہترین انداز میں پیش کیا اور سارے جہان کو اسلام کی روشنی سے روشن کر دیا حتیٰ کہ دنیا کا کوئی کونہ ایسا نہ رہا جہاں اسلام کی روشنی نہ پہنچی ہو۔ اس فریضے کی ادائیگی میں اس کی سرعت رفتار، اسلام کی نمائندگی کے اعلیٰ معیار اور خلیج سبت سے بحیرہ آرال اور اناطولیہ سے لے کر دیوارِ چین تک قرآن کے پیغام کو پہنچانے کو دیکھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اسلام کا پیغام چین تک پہنچ چکا تھا۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلم سپہ سالار عقبہ بن نافع برج ہرقل تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور تمام بربر علاقے یعنی مراکش، تیونس اور الجزائر اسلامی پرچم کے زیر نگیں آ چکے تھے۔ یہ سب کچھ تیس سال کی مدت میں ہوا۔ ان تیس سالوں میں مسلمانوں نے نورِ اسلام سے سارے عالم کو جگمگا دیا، کیونکہ وہ اسلام کی بہترین نمائندگی کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے تمام اقوام کے دل اس قدر جیت لیے تھے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو اپنے ہم مذہبوں پر ترجیح دیتے تھے اور جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیت المقدس اور حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ شام گئے تو وہاں کے باشندوں نے ان کا پُرجوش استقبال کیا حتیٰ کہ جب مسلمانوں کو دمشق سے پسپائی اختیار کرنا پڑی تو عیسائیوں اور ان کے پادریوں نے اپنے کلیساؤں میں جا کر مسلمانوں کی واپسی کی دعائیں کیں اور مسلمانوں سے کہا: ”ہم اللہ تعالیٰ سے آپ لوگوں کی واپسی کی دعا کرتے ہیں، ہم جزیہ ادا کر کے آپ لوگوں کے زیر سایہ رہنا پسند کرتے

ہیں۔ "مسلمان اقوام عالم میں محبت کا مظہر بن گئے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ لوگ فوج در فوج دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے تھے۔ ہر مسلمان حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نائب تھا، لہٰذا ایسی صورت میں عوام کی اکثریت کا اسلام کی طرف متوجہ نہ ہونا ناممکن تھا۔ یہ بہادرانِ قوم رات کو عبادت گزار ہوتے تو دن کو شہسوار ہوتے۔ انہوں نے سب سے پہلے لوگوں کے دلوں کو جیتا یہاں تک کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ مسلمان کچھ ہی عرصے میں ساری دنیا کو فتح کر لیں گے۔

آج ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ایک چھوٹے سے جزیرے(24) سے بھی اپنی بات نہیں منوا سکتے اور اپنے زیرِ نگیں علاقوں میں امن و امان قائم نہیں کر سکتے، لیکن قرونِ اولیٰ کے مسلمان امن پسندی اور حکمت و دانش کا نمونہ تھے۔ قلعوں اور شہروں کی چابیاں ان کے قدموں میں ڈال دی جاتیں اور انہیں سیادت و قیادت کی پیشکش کی جاتی تھی، جسے علامتی چابیوں کی سپردگی یا اعزازی شہریت دینے پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔

جب مسلمانوں نے موجودہ فلسطین اور شام کا علاقہ فتح کیا تو مسلمانوں کی عسکری قیادت نے بیت المقدس کی چابیوں کی سپردگی کا مطالبہ کیا، لیکن وہاں کے سب سے بڑے پادری نے یہ کہہ کر انکار کر دیا: "جو شخص یہ چابیاں وصول کرنے کا حق دار ہے، ہم اس کے اوصاف و اخلاق سے واقف ہیں، ہم اس کے سوا کسی اور کو یہ چابیاں نہیں دیں گے"...

چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنے خادم کے ہمراہ بیت المقدس کی طرف چل پڑے، کوئی نہیں جانتا تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ کیسے آئیں گے، لیکن آپ اسی انداز سے جا رہے تھے جس انداز کا اسقف کو علم تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے سفر کے لیے بیت المال سے ایک اونٹ خریدا۔ اس دور میں گاڑیاں تو ہوتی نہ تھیں، تاہم خلیفہ کے لیے سفر کے لیے کوئی اچھا گھوڑا لینا ممکن تھا، لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا، بلکہ سارے سفر میں اس اونٹ پر خادم کے ساتھ باری باری سفر کرنے کو ترجیح دی۔

جب وہ دونوں حضرات بیت المقدس کے قریب پہنچے تو اسلامی لشکر کے کمانڈروں کی خواہش تھی کہ نہر اردن عبور کرنے کے بعد سوار ہونے کی باری خلیفہ کی ہو، کیونکہ ان کے خیال

میں شان و شوکت اور زیب و زینت کے مظاہر دیکھنے کی عادی عوام اس منظر کو یقیناً معیوب سمجھے گی کہ خادم اونٹ پر سوار ہو، سربراہ مملکت اونٹ کی مہار پکڑے چلا آ رہا ہو اور نہر عبور کرنے کے بعد اس کے کپڑے گھٹنوں تک اٹھے ہوئے ہوں، لیکن حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی نظر میں ناانصافی معیوب بات تھی، اس لیے وہ غیر منصفانہ کام کرنے سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ تقدیر کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ دریا عبور کرنے کے وقت اونٹ کی مہار پکڑ کر چلنے کی باری حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حصے میں آئی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ اونٹ سے اترے، خادم سوار ہوا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اونٹ کی مہار پکڑے نہر عبور کرنے لگے۔ زین کی رگڑ کی وجہ سے آپ کے کپڑے کئی جگہ سے پھٹ چکے تھے۔ آپ بیٹھ کر انہیں پیوند لگانے لگے۔ آپ کے کپڑوں میں چودہ پیوند تھے۔ سب سے بڑے پادری نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر کہا: ''یہی وہ شخص ہے، جس کے اوصاف ہماری کتابوں میں مذکور ہیں۔ ہم شہر کی چابیاں صرف ایسے شخص کے سپرد کریں گے۔''

بیت المقدس کی چابیوں اور مسجد اقصیٰ کو مسلمانوں کے حوالے کرنا لوگوں کے فوج در فوج دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا ذریعہ بن گیا۔ اسلام کی عظیم شخصیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مناقب بیان کر کے میرا مقصود آپ حضرات کے جذبات ابھارنا نہیں ہے، بلکہ یہ سوال کرنا ہے کہ کیا آج اسلام کی نمائندگی اس کے شایاں کی جا رہی ہے۔ ابتدائی مسلمانوں نے پچیس تیس سال کے عرصے میں افریقہ، تاشقند، سمرقند اور بخارا کے علاقے فتح کر لیے، جس کے نتیجے میں دنیا کو بخاری، مسلم، ترمذی، ابن سینا، فارابی اور بیرونی جیسی ہستیاں ملیں، مسلمانوں کی حکومت قفقاز، عراق اور ایران تک پھیل گئی، ''لاالہ الا اللہ محمّد رسول اللہ'' کی صداؤں سے دنیا کا کونہ کونہ گونج اٹھا اور اسلام کا پیغام سب تک پہنچ گیا۔

لیکن آج دوسری اقوام اور ممالک تو درکنار ہم خود مسلمانوں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ جو لوگ ہماری بات سننے کے لیے تیار ہوتے ہیں ہم انہیں اسلام کی دعوت دے کر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہ ایمان نہیں لاتے، گویا ہماری آواز برف کی

دیوار سے ٹکرا کر پوری شدت سے واپس ہمارے منہ پر آ کر لگتی ہے۔ ہم اپنی بات کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں، لیکن ہم ان کے دلوں تک رسائی نہیں پاتے۔ ہم یہ بات اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کی ناشکری کے طور پر نہیں کہہ رہے ہم ایسا کہہ بھی نہیں سکتے۔ ہمارا مقصود صحابہ کرام اور اپنا موازنہ کر کے اپنے اور ان کے درمیان موجود وسیع فرق کی نشاندہی کرنا ہے۔

اطرافِ عالم کو فتح کر کے دنیا کے کونے کونے تک اسلام کا پیغام پہنچانے والے شاہینوں میں سے ایک شاہین عظیم سپہ سالار عقبہ بن نافع بھی تھے، جنہوں نے براعظم افریقہ کو قدموں تلے روند کر فتح کیا۔ ان کی مسلسل فتوحات نے مسلمانوں کے دلوں کو خوشی سے سرشار کر دیا تھا، تاہم وہ ایک سازش کا شکار ہو گئے اور اس وقت کے خلیفہ نے انہیں معزول کر کے قید میں ڈال دیا۔ وہ پانچ سال تک قید میں رہے اور اس دوران ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ انہیں اسلام کی اشاعت سے روک دیا گیا تھا۔ وہ پورے افریقہ میں اسلام کا پرچم لہرانا چاہتے تھے۔ جب یزید کو حکومت ملی تو اس نے انہیں قید سے رہا کر کے مراکش کا والی بنا دیا اور اس طرح اس نے گناہوں اور اسلام کو نقصان پہنچانے والے اقدامات سے اپنے سیاہ نامۂ اعمال میں ایک بہت بڑی نیکی بھی شامل کر لی۔ حضرت عقبہ نے فتوحات کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا یہاں تک کہ وہ بحر اٹلانٹک کے ساحل پر پہنچ گئے اور گھوڑے کو پانی میں داخل کر کے کہا: ''اے پروردگار! اگر یہ سمندر نہ ہوتا تو میں تیری راہ میں جہاد کرتے ہوئے ملک کے ملک فتح کرتا جاتا۔''(25) اگر کوئی شخص انہیں براعظم امریکا کے بارے میں بتاتا تو وہ اس تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے لیے وہاں پہنچنے کا راستہ پوچھتے۔

اُس دور کے مسلمان اسلام کا پیغام ہر کسی تک پہنچاتے تھے اور جن ممالک تک وہ اسلام کی دعوت نہ پہنچا سکے ان کے بارے میں ان کا ضمیر انہیں ملامت کرتا، لیکن ہم مسلم معاشرے میں اسلام کو صحیح طریقے سے پیش کر سکے اور نہ ہی اسلام کو برق رفتاری سے دنیا کے دوسرے حصوں تک پہنچا سکے، کیونکہ ہم اسلام کی خاطر اپنے ذاتی کام اور مشاغل کو نہ چھوڑ سکے۔ ہم اسلام کے لیے کام کرنے کو اپنی پہلی ترجیح اور اپنے دیگر امور کو دوسری، تیسری یا چوتھی ترجیح نہیں سمجھتے۔ اگرچہ ہم

مارک، ڈالر، شلنگ اور فرانک کمانے کے لیے غیر مسلم ممالک میں جاتے ہیں، لیکن خدا کے دین کی اشاعت کے لیے نہیں جاتے، اسی لیے ہم انہیں اسلام کے اعلیٰ حقائق سے آگاہ نہ کر سکے۔ اگر آج وہ اقوام کفر و گمراہی کی تاریکی میں زندگی بسر کر رہی ہیں تو اس میں ہماری سستی اور ناکامی کو بھی دخل ہے۔ قیامت کے دن جس طرح ان سے پوچھ گچھ ہو گی، اسی طرح ہم سے بھی سوال ہو گا۔

کل میں نے ایک لیکچر کی ویڈیو دیکھی۔ لیکچر جرمن زبان میں تھا۔ اگرچہ مجھے جرمن زبان نہیں آتی، لیکن جو منظر میرے سامنے تھا وہ بہت کچھ سمجھنے کے لیے کافی تھا۔ میں کچھ عرصہ پہلے برلن کے ایک قبرستان میں گیا... مجھے یوں لگا جیسے میری ٹانگوں نے میرا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا ہو۔ میں نے گڑگڑا کر خدا سے عرض کی: "اے ہمارے پروردگار! ہم پر رحم فرما۔ ہم آپ کے دین کو یہاں تک نہ پہنچا سکے۔" لیکن یہ ویڈیو کیسٹ دیکھ کر میرے جذبات تازہ ہو گئے... یہ جگہ ہالینڈ کا کوئی گرجا گھر تھا، لیکچر دینے والا مسلمان نوجوان تھا، پادری بیٹھ کر اس کی بات سن رہا تھا اور ہالینڈ کی باحجاب مسلمان خواتین بھی اس کی بات غور سے سن رہی تھیں اور سوالات پوچھ رہی تھیں، جن کے وہ جوابات دے رہا تھا۔ غیر مسلم خواتین بھی سوالات پوچھ رہی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ منظر دیکھ کر اپنے اندر پیدا ہونے والے جذبات کی تعبیر کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، تاہم ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس قسم کی سرگرمیاں بعض شوق سے کام کرنے والوں کی طرف سے سرانجام دی جا رہی ہیں جو بالکل ناکافی ہیں۔ یہ اسلامی خدمات کا حصہ ضرور ہیں، لیکن اسلامی خدمات کا مکمل نظام نہیں ہیں۔

ابھی تک ہم اسلامی اور ایمانی خدمات کے محل کی راہداریوں میں گھوم رہے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی خاص کام سرانجام دینے کا دعوی نہیں کر سکتے۔ آج بہت سے لوگوں کے گمراہی میں رہنے کا یہی سبب ہے۔ اگرچہ ہم خدمت دین کی خاطر ان ممالک میں بھی گئے ہیں، لیکن ہم وہاں بھی آپس کے اختلاف کو نہیں بھلا سکے اور اسلام کو اس انداز سے نہ پیش کر سکے، جس انداز سے اسے حضرت عمر، عقبہ بن نافع، ابو عبیدۃ، احنف بن قیس، مغیرۃ بن شعبہ اور قعقاع رضی اللہ عنہم ایسے پہلے مسلمانوں نے پیش کیا تھا۔ نہ جانے ان حضرات کی مروّت، بہادری، انصاف پسندی، انسانی ہمدردی،

ایمان اور عزم کو دیکھ دشمنوں کے دلوں کی کیا کیفیت ہوتی ہو گی! نہ جانے وہ کس قدر متاثر ہوئے ہوں گے اور ان بہادر ہستیوں کو دیکھ کر نہ جانے کتنی بار اسلام کی طرف مائل ہوئے ہوں گے!

جب ہم اس موضوع کو اس پہلو سے دیکھیں تو ہمیں پیرس، لندن اور نیو یارک میں رہنے والوں سے ہمدردی ہونے لگتی ہے، بلکہ افسوس سے اپنا سینہ پیٹنے کو جی چاہتا ہے، کیونکہ ہمیں جس طرح ان تک اسلام کی دعوت پہنچانی چاہیے تھی ہم نے نہیں پہنچائی۔ آئندہ سطور میں ایک حقیقی واقعہ بیان کرتا ہوں، جسے میں نے ایک مشہور واعظ شیخ نجم الدین نور سچان سے سنا ہے:

ہمارا ایک ہم وطن کسی یورپی ملک میں روز گار کے سلسلے میں گیا۔ وہاں اس نے ایک گھر میں رہائش اختیار کی اور اس کے گھر کے افراد سے اس کی واقفیت ہو گئی۔ وہ اکثر ان کے ساتھ بیٹھتا اور ان سے گفتگو کرتا۔ آہستہ آہستہ ان کی آپس میں دوستی ہو گئی، لیکن اس شخص نے اسلام کو پیش کرنے، اس کے بارے میں انہیں بتانے اور ان کے سوالات کے جوابات دینے میں کوتاہی نہ کی۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد گھر والے نے اسلام قبول کر لیا، تھوڑے ہی عرصے بعد اس کی بیوی نے بھی اسلام قبول کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھ لیا اور پھر ان کے بیٹے بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے، جس کے نتیجے میں خوش بختی اس گھر کا مقدر بن گئی اور وہ گھر جنت کا نمونہ پیش کرنے لگا۔

کچھ دن گزرنے کے بعد گھر والے نے اپنے مرشد و راہنما سے بڑی عجیب بات کہی: "بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ کو اپنے سینے سے لگا کر خوب بوسے دوں، لیکن کبھی خیال ہوتا ہے کہ تمہیں خوب ماروں، کیونکہ آپ ہمارے پاس آکر بطور مہمان ٹھہرے اور آپ کے ذریعے سے ہمیں رسول اللہ ﷺ، قرآن کریم اور ایمان باللہ کا علم ہوا اور آپ کی برکت سے ہمیں ایمان نصیب ہوا اور ہمارا گھر جنت کا نمونہ بن گیا۔ میرا باپ بہت اچھا اور پاک طینت انسان تھا، لیکن آپ کے آنے سے کچھ ہی عرصہ پہلے اس کا انتقال ہو گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ آپ ہمارے پاس اس کی وفات سے پہلے کیوں نہ آئے؟"

میں سمجھتا ہوں کہ اس فریاد میں سارے عیسائیوں اور یہودیوں کی فریاد شامل ہے۔ ہم ان تک جا کر انہیں اسلام کی دعوت نہ دے سکے، بلکہ ہم تو اپنے ہی ممالک میں اسلام کو صحیح طرح

سے پیش نہ کر سکے۔ ہم نے اپنی زندگی اسلام کے مطابق ڈھالی، نہ اس کی تعلیمات کی وضاحت کی اور نہ ہی ضرورت مندوں تک اسے پہنچایا۔

مجھے ایک اور بات کہنے کی اجازت دیجیے: جن لوگوں نے ہمیں اسلام سے دور کیا انہوں نے ہمیں مغربی زندگی کے معیار کے مطابق معیارِ زندگی فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن ڈیڑھ صدی گزرنے کے باوجود ہم اہل مغرب کے در کے بھکاری بنے ہوئے ہیں، کوئی تبدیلی واقع ہوئی اور نہ ہی کوئی ترقی ہوئی۔ مغرب آج بھی ہمیں چند ڈالروں کی خاطر اپنی چوکھٹ پر آئے ہوئے غلاموں کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ اب میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں۔

عیسائی اور یہودی اسلام لاتے ہیں اور نہ ہی ہمارے اعلیٰ اصولوں کو قبول کرتے ہیں۔ کیا ہم نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کی وجہ پر غور کیا ہے؟ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کے سامنے بہت ہی عمدہ اصول اور لائحہ عمل پیش کرے، بلکہ آسمان کے دروازے کھول کر آپ کو جنت تک پہنچانے والے راستے دکھادے، لیکن اگر وہ شخص آپ کے ہاں خادم کی حیثیت سے گھٹیاترین کام سرانجام دیتا ہے تو کیا آپ اس کے دین کو قبول کرلیں گے؟ آپ اپنے خادم کا پیروکار بننا ہرگز گوارا نہ کریں گے اور کبھی بھی اپنے در پر سوالی بن کر آنے والوں کی پیروی اختیار نہ کریں گے۔

عالم اسلام نے اپنی شیرازہ بندی کی، نہ اپنی خودی کو پہچانا اور نہ ہی اسلام کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالا، بلکہ آج بھی مغرب کی چوکھٹ پر سوالی بن کر کھڑا ہے، لہٰذا جب تک عالم اسلام یکے بعد دیگرے پڑنے والے تھپیڑوں سے مغلوب، مغرب کے در کا سوالی اور اسیر اور اس سے خائف رہے گا اس وقت تک مغرب کے ہماری بات پر کان دھرنے یا ہمارے پیغام کو سنجیدگی سے سننے کا کوئی امکان نہیں، لیکن اگر ہم اپنے اسلاف کی شخصیت اور عزت نفس کے معیار کے مطابق اپنے آپ کو بلند کرکے اسلام کو اس کے شایاں رفعت کے ساتھ پیش کریں اور مغرب کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے تو وہ ہماری بات کو غور سے سنے گا، اسے وزن دے گا اور اسے قبول کرے گا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اپنے ہاں کام کرنے والوں کی بات نہ سننے میں مغرب حق بجانب ہے، لیکن شاید انہیں اس بارے میں معذور سمجھا جاسکتا ہے۔ مغرب پر اسلام قبول نہ کرنے کی ذمہ داری ڈالنے کا کیا فائدہ جبکہ اسلام کو اس کے شایاں انداز سے پیش نہ کرنے کی زیادہ ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے؟

میرے خیال میں اس معاملے کو اس پہلو سے دیکھنا چاہیے اور ہمیں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ ذمہ داری ہم دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ ہماری رائے منصفانہ ہونی چاہیے، ہمیں ان لوگوں کی طرح نہیں سوچنا چاہیے، جو غیر متوازن رائے رکھتے ہیں اور غیر مسلم ممالک میں بسنے والے سارے انسانوں کو جہنم کا ایندھن سمجھتے ہیں، نیز ہمیں ان لوگوں جیسی سوچ بھی نہیں رکھنی چاہیے جو یہ توقع کیے بیٹھے ہیں کہ جیسے ہی وہ اسلام کو ناقص اور غیر مناسب انداز میں پیش کریں گے ہر کوئی اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ایں خیال است و محال است و جنون لیکن ہمارا ایمان ہے کہ عنقریب موجودہ بین الاقوامی توازن میں تبدیلی آئے گی اور ترکی، مصر اور ترکستان کے ممالک(26) کی نئی نسل اپنی ذات، خودی اور اصل شناخت کی طرف لوٹ کر اپنے عقیدے اور اصولوں کے مطابق جیئے گی۔ یہ پاکیزہ اور روشن نسل نئے بین الاقوامی توازن میں اپنا مقام حاصل کرے گی، تب مشرق و مغرب ہماری بات کو غور سے سنیں گے۔

یہ ناممکن نہیں ہے اور ایسا یقیناً ہو گا، بلکہ اس کا آغاز ہو چکا ہے۔ مغرب کے اہل فکر اسلام کی سحر انگیزی اور صدا بہار تر و تازگی کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ کسی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ بنے گا۔ مستقبل قریب میں بڑے پیمانے پر معاشرتی تبدیلی کا آنا بعید از قیاس نہیں ہے۔ مستقبل میں دنیا کے جغرافیائی نقشے میں بھی تبدیلیاں آئیں گی، لیکن یہ کارنامہ وہی لوگ سرانجام دے سکتے ہیں جنہوں نے اپنی خودی، شخصیت اور اصل شناخت کو پالیا ہے۔ یہ بات فراغت کے اوقات میسر آنے تک کام کو مؤخر کرنے والے بے بس اور ناکام لوگوں کے بس کی نہیں۔

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں جب لوگ قبروں سے سر اٹھا کر تمہیں دیکھیں گے اور کہیں گے: "انہی لوگوں کا ہمیں انتظار تھا۔" تب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہو گا اور تم سارے عالم کے ساتھ اپنے حساب و کتاب کے لیے اٹھ کھڑے ہو گے۔

کیا "عالم اَلَست" کے وجود پر کوئی دلیل موجود ہے؟

بعض مسائل کی عقلی توضیح مشکل ہوتی ہے، لیکن ان کے امکان اور محال نہ ہونے پر تحقیق ہو سکتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی بات فرمادیں تو اس کے بارے میں کسی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اِس سوال کے دو پہلو ہیں:

اول: کیا یہ مکالمہ پیش آیا ہے؟ نیز اس کی دلیل کیا ہے؟

دوم: کیا اہل ایمان کو یہ واقعہ یاد ہے؟

پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اور انسانی روحوں کے درمیان ہونے والا یہ مکالمہ یقیناً پیش آیا ہے؟ قرآنِ کریم میں اس موضوع سے متعلق دو آیات مبارکہ ہیں۔ ان میں سے ایک حسبِ ذیل ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِي آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُواْ بَلَى شَهِدْنَا أَن تَقُولُواْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ﴾ (الأعراف:١٧٢) "اور جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد نکالی تو ان سے خود ان کے مقابلے میں اقرار کرا لیا، یعنی ان سے پوچھا: "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟" وہ کہنے لگے: "کیوں نہیں۔ ہم گواہ ہیں کہ تو ہمارا پروردگار ہے۔" یہ اقرار اس لئے کرایا تھا کہ قیامت کے دن کہیں یوں نہ کہنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر ہی نہ تھی۔"

اس آیت مبارکہ میں اس مکالمے کا ذکر ہے، لیکن یہ عہد کب لیا گیا، اس کے بارے میں مفسرین اور محدثین کی مختلف آراء ہیں۔

مفسرین کے ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ یہ عہد عالم ذرات میں لیا گیا ہے، جب ہر چیز ذرات کی صورت میں تھی۔ اس رائے کے مطابق یہ عہد وپیمان بعد میں مرکب بننے والے

ان ذرات اوران کی ارواح سے لیا گیا تھا۔ بعض مفسرین کی رائے میں جب بچہ رحم مادر میں آتا ہے، اس وقت اس سے یہ عہد لیا جاتا ہے، جبکہ بعض محتاط مفسرین کی احادیث نبویہ کی روشنی میں یہ رائے ہے کہ یہ عہد و پیمان انسان سے نفخ روح کے وقت لیا جاتا ہے۔

دراصل اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے مختلف صورتوں میں ہم کلام ہوتے ہیں، مثلاً ہم ایک متعین انداز اور اسلوب میں گفتگو کرتے ہیں، لیکن ہمارے نفسی اور لفظی کلام کے اور بھی اسالیب ہیں، کیونکہ ہمارے اندرونی اور بیرونی جذبات ہیں۔ ہمارا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے، نیز جس طرح ہماری شخصیت کا حصہ عقل ہے، اسی طرح ایک پہلو روح بھی ہے، چنانچہ ہم اپنے دل کی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے گاہے بگاہے مختلف اسالیب اختیار کرتے رہتے ہیں۔

دل کے بات کرنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ وہ بولتا ہے، لیکن اس کی بات کوئی اور نہیں سن سکتا۔ جب ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ دل میں کیا سوچ رہے تھے تو ہم دل کی باتوں کو مربوط الفاظ میں ڈھال کر دوسروں کو بتاتے ہیں۔ اسے کلام نفسی کہتے ہیں۔

بعض اوقات ہم خواب میں گفتگو کرتے ہیں اور دوسروں کی گفتگو سنتے بھی ہیں، گو ہمارے پاس موجود لوگ انہیں نہیں سن سکتے، لیکن جب ہم بیدار ہوتے ہیں تو ہم نے خواب میں جو گفتگو کی یا سنی ہوتی ہے اس سے دوسروں کو آگاہ کرتے ہیں۔ یہ بھی گفتگو کا ایک انداز ہے۔ بعض لوگوں کو بیداری کی حالت میں عالم مثال کے مناظر اور شخصیات نظر آتی ہیں۔ مادہ پرست لوگ اسے تسلیم نہیں کرتے اور اسے اوہام و خیالات قرار دیتے ہیں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ جو کہتے ہیں کہتے رہیں۔ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اعزاز کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو عالم مثال اور عالم برزخ کے مناظر دکھائے جاتے تھے اور آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جو کچھ سنتے یا دیکھتے اسے لوگوں کے سامنے بیان فرمادیتے۔ گفتگو کا ایک انداز یہ بھی ہے۔

گفتگو کا ایک اسلوب اور انداز وحی بھی ہے۔ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس جب وحی آتی تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مکمل بیداری کی حالت میں اسے محسوس فرماتے، لیکن اس کے کچھ دوسرے پہلو بھی

ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی اور اسے سن یا سمجھ نہ سکتا تھا۔ اگر وحی کوئی مادی چیز ہوتی تو اسے دوسروں کے کان بھی سن سکتے، حالانکہ بسا اوقات رسول اللہ ﷺ پر ایسی حالت میں وحی اترتی کہ آپ ﷺ کسی زوجہ محترمہ کی گود میں یا کسی صحابی کے سینے پر سر مبارک رکھے ہوتے تھے یا آپ ﷺ کا گھٹنا کسی صحابی کے گھٹنے پر ہوتا تھا۔ آپ ﷺ وحی سنتے اور اسے وصول کرتے، لیکن آپ کے پاس موجود لوگوں کو وہ سنائی دیتی اور نہ ہی محسوس ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ وحی کو وصول کر کے زبانی یاد فرما لیتے اور پھر لوگوں کو اس سے آگاہ فرماتے۔ یہ گفتگو اور صوتیات کی ایک مستقل قسم ہے۔

ولی کے دل پر ایسے الہام ہوتا ہے، جیسے کوئی اس کے دل میں سرگوشی کر رہا ہو۔ یہ گفتگو کا ایک اور انداز ہے، جو خفیہ اشارات (Code words) میں گفتگو کرنے سے مماثلت رکھتا ہے۔ جیسے خفیہ اشارات (Code words) میں "دی ... دی ... دا ... دا ... دیت" کہا جاتا ہے تو ان اشارات کو سننے والا ان کا مفہوم سمجھ جاتا ہے، اسی طرح ولی کے دل پر کوئی بات القا ہوتی ہے تو وہ اس سے کوئی مفہوم اخذ کر لیتا ہے، مثلاً بسا اوقات کوئی ولی کہتا ہے: "فلاں بن فلاں شخص اب دروازے پر موجود ہے۔" اور جب لوگ دروازہ کھولتے ہیں تو اسے اپنے سامنے پاتے ہیں۔ یہ بھی گفتگو کا ایک انداز ہے۔

گفتگو کی ایک صورت ٹیلی پیتھی (Telepathy) ہے۔ دورِ حاضر کے سائنسدان مستقبل میں اس طریقے سے گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک صورت قلبی توجہ کے ذریعے دل ہی دل میں لوگوں کی باہمی گفتگو بھی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گفتگو اور ہم کلامی کے بے شمار انداز اور اسالیب پیدا کیے ہیں۔

اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ (الأعراف: ۱۷۲) "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟" لیکن اس کی کیفیت ہم جانتے ہیں اور نہ ہی جان سکتے ہیں۔ اگر یہ گفتگو اولیائے کرام کی طرف کئے جانے والے الہام کی صورت میں تھی تو

بغیر آواز کے ہو گی۔ اگر یہ الہام تھا تو وحی نہ تھی اور اگر وحی تھی تو الہام نہ تھا۔ اگر یہ روح سے گفتگو تھی تو جسم سے نہ تھی اور اگر جسم سے ہم کلامی تھی تو روح سے نہ تھی۔

یہ پہلو بہت اہم ہے، کیونکہ عالم مثال، عالم برزخ یا عالم ارواح میں دیکھی یا سنی ہوئی چیزوں کو اس عالم کے معیاروں پر پرکھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ صادق و امین حضرت محمد ﷺ نے ہمیں بتایا ہے کہ منکر اور نکیر قبر میں ہمارے پاس آکر ہم سے سوال و جواب کریں گے، لیکن یہ سوال و جواب کیسے ہو گا؟ کیا وہ روح کو مخاطب کریں گے یا جسم کو؟ کوئی بھی صورت ہو نتیجہ ایک ہی ہے کہ میت ان کی بات کو سنے گی، لیکن اس کے ارد گرد اور پاس موجود لوگوں کو کچھ سنائی نہیں دیتا حتی کہ اگر ٹیپ ریکارڈر اور مائیکروفون بھی قبر میں رکھ دیا جائے تب بھی کوئی چیز ریکارڈ نہ ہو گی، کیونکہ قبر کی گفتگو کے ابعاد اس دنیا کے ابعاد سے مختلف ہیں۔ آئن سٹائن وغیرہ نے اشیاء کے چوتھے اور پانچویں بعد کا ذکر کیا ہے۔ ابعاد کے اختلاف سے اشیاء کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ارشادِ خداوندی: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ روحوں سے خاص خطاب ہے، جسے سننے یا یاد رکھنے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے، گو بسا اوقات ہمارے وجدان پر اس کا پرتو پڑ جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں ہم اپنے وجدان پر پڑنے والے پرتو کے ذریعے اس گفتگو کو محسوس کر سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ میں اس موضوع پر گفتگو کر رہا تھا تو ایک شخص نے مجھ سے کہا: "مجھے تو اس گفتگو کا احساس یا شعور نہیں ہے۔" میں نے اس سے کہا: "لیکن مجھے اس کا شعور ہے۔ اگر تمہیں اس کا شعور نہیں ہے تو یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ مجھے اس کا احساس و شعور ہے۔" اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ میرے پاس اس کی کیا دلیل ہے؟ تو میں اس کا یہ جواب دوں گا کہ جب میں محدود اور فانی ہونے کے باوجود اپنے دل میں ہمیشہ رہنے کی خواہش محسوس کرتا ہوں تو مجھے خدا کی اس آواز کا احساس ہوتا ہے۔ محدود کے لیے لامحدود کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ میں بھی چونکہ محدود ہوں، اس لیے میں اللہ تعالیٰ کی پوری معرفت حاصل نہیں کر سکتا، لہٰذا جب میں

اپنے دل میں لامحدود ذات اور ہمیشگی کی طرف میلان پاتا ہوں تو مجھے اس ہم کلامی کے پیش آنے کا احساس ہوتا ہے، ورنہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس محدود دنیا کی ایک حقیر سی مخلوق ہونے کی حیثیت سے میں اپنی چند روزہ زندگی گزارنے کے بعد موت کی آغوش میں چلا جاتا اور میری عمر کی طرح میری سوچیں اور آرزوئیں بھی محدود ہوتیں، لیکن مجھے ہمیشہ رہنے کی فکر رہتی ہے، میرے دل میں ہمیشہ جینے کی خواہش پروان چڑھتی ہے، جنت اور جمالِ خداوندی کے دیدار کا شوق مجھے بے چین کیے رکھتا ہے اور ساری دنیا کی بادشاہت بھی میری خواہشات کی تسکین نہیں کر پاتی۔ اپنی یہ کیفیت دیکھ کر میں کہتا ہوں کہ میں نے اس مکالمے کو محسوس کیا تھا۔

وجدان کی حقیقت کچھ بھی ہو وہ ہر لحظہ خدا کا مشتاق رہتا اور اس کے گن گاتا ہے۔ وجدان کبھی غلط بیانی نہیں کرتا۔ جب تک اسے اس کا مطلوب حاصل اور اس کی خواہش پوری نہ ہو گی اس وقت تک اسے راحت ملے گی اور نہ ہی وہ خوشی اور اطمینان حاصل کر پائے گا۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ (الرعد:۲۸) "سن رکھو! کہ اللہ کی یاد سے ہی دل آرام پاتے ہیں۔" چونکہ دل لطائف ربانیہ میں سے ایک لطیفہ ہے، اس لیے اسے صرف اسی صورت میں سکون حاصل ہو گا جب وجدان مقام اطمینان کو پالے گا۔

یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ برگساں وغیرہ جیسے بہت سے فلاسفہ تمام عقلی اور نقلی دلائل کو چھوڑ کر صرف وجدان کو اللہ تعالیٰ کے وجود کی دلیل قرار دیتے ہیں، حتیٰ کہ جرمن فلسفی کانٹ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی عظمت و جلال کے شایانِ شان طریقے سے جاننے کے لیے میں نے اپنی تمام معلومات کو ایک طرف رکھ دیا۔ برگساں نے اس راستے میں ذکاوتِ حس کو اپنا راہنما بنایا۔ وجدان اور ضمیر کا وجود اس کے نزدیک واحد دلیل ہے۔ خدا کے انکار سے ضمیر اور وجدان کو ایذا پہنچتی ہے اور ایمان باللہ سے انہیں مسرّت اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

جب انسان اپنے وجدان کی آواز پر کان لگاتا ہے اور اس کی گہرائی میں جھانکتا ہے تو ایک ازلی اور ابدی معبود پر ایمان لانے کے خواہش شدت سے محسوس کرتا ہے۔ یہ کیفیت اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ کے جواب (بَلٰی) کی دلیل ہے۔ اگر انسان اپنے وجدان کی

گہرائیوں سے آنے والی آواز پر کان لگائے تو اس آواز کو سن سکتا ہے، لیکن اگر اس نے اس آواز کو اپنی عقل یا جسم میں تلاش کیا تو اسے ناکامی کا سامنا ہو گا، کیونکہ یہ آواز ہر شخص کے ضمیر میں پنہاں ہے اور اسے صرف ضمیر کی آواز کے ذریعے ہی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ انبیاء، اولیاء اور اصفیاء یہ بات سمجھتے تھے اور انہوں نے اس کی اچھی طرح وضاحت کی ہے۔ ان کے لیے اس میں کوئی ابہام نہ تھا۔

اگر اس حقیقت کو ہم عقلی طور پر ثابت کرنا چاہیں تو یہ ممکن نہیں، کیونکہ عقل صرف صنوبر یا اورینٹل پلین (Oriental Plane) جیسی مخصوص چیزوں کے وجود کو ثابت کر سکتی ہے، لیکن جو شخص اپنے وجدان کی آواز پر کان لگا کر اپنے باطن میں جھانکے گا وہ اس آواز کو سنے گا اور اس حقیقت کو پا لے گا۔

قرآن کریم کے تیئس سال میں نازل ہونے میں کیا حکمت ہے؟

اگر قرآنِ کریم تیئس برس کی بجائے یک بارگی نازل ہوتا تو اعتراض کرنے والے کہتے: "قرآن یک بارگی کیوں نازل ہوا؟ آہستہ آہستہ کیوں نہیں نازل ہوا؟"

ایسے مسائل میں یہ ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نازل فرمایا ہے وہ حق ہے، بصورت دیگر ہر معاملے میں سوالات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا، مثلاً نمازِ ظہر کی رکعات کی مجموعی تعداد دس کیوں ہے؟(27) نمازِ جمعہ جمعہ کے دن ہی کیوں ادا کی جاتی ہے؟ زکوۃ کی مقدار چالیسویں حصے کی بجائے اکتالیسواں حصہ کیوں نہیں؟ ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ ان میں سے ہر معاملے میں اسرارِ بندگی پوشیدہ ہیں۔

اگرچہ نماز کی اپنی حکمتیں ہیں اور انسان کے دن میں پانچ مرتبہ اپنے پروردگار کے دربار میں حاضر ہونے کے بہت سے فوائد ہیں، لیکن جہاں تک رکعات کی تعداد کا معاملہ ہے تو ان کی تعداد اللہ تعالیٰ نے ہی مقرر فرمائی ہے، مثلاً وتر اور نمازِ مغرب کی تین رکعات اور عصر کی چار رکعات کا تعین من جانب اللہ ہے، لیکن اگر یہ معاملہ ہم پر چھوڑ دیا جاتا اور ہم سے کہا جاتا کہ تم روزانہ پانچ دفعہ نماز کی ادائیگی کے پابند ہو، تاہم نماز کی ادائیگی کا طریق کار تم نے خود طے کرنا ہے تو ہمارے درمیان اس بارے میں اختلاف رائے پیدا ہوتا۔ ہر ایک مختلف تعداد طے کرتا اور اپنے حالات و مشغولیات کے مطابق نمازوں کو ترتیب دیتا۔ عقل کے ذریعے تعداد کا تعین وحی کے ذریعے اس کے تعین سے مختلف ہوتا ہے۔ وحی علم الٰہی کی روشنی میں انسان کی روحانی زندگی کے لیے پر حکمت اور ممتاز لائحہ عمل طے کرتی ہے، لہٰذا نماز کی حکمتوں کے بارے میں تو تحقیق کی جاسکتی ہے، لیکن رکعات کی تعداد کے بارے میں سوال نہیں کیا جاسکتا۔

قرآن کریم کے تیئس سال کے عرصے میں نازل ہونے میں ایسی ہی حکمتیں پائی جاتی ہیں۔ قرآن کریم کا نزول انسانی ترقی اور عروج کے ابتدائی دور میں ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین اور کامل ترین نبی حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی۔ متمدن اقوام

کی تعلیم و تربیت کر کے انہیں ترقی کے اعلیٰ ترین مراتب تک پہنچانا آپ ﷺ کے صحابہ کرام کے فرائض منصبی میں شامل تھا، لیکن دورِ جاہلیت میں بری عادات اور اخلاق کے ان کے مزاج پر اس قدر گہرے اثرات تھے کہ وہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف ان کی بری عادات اور اخلاق کو ایک ایک کر کے ختم کرنا تھا، بلکہ اس کے بعد ان میں عمدہ اخلاق اور پسندیدہ عادات بھی پیدا کرنی تھیں۔ اگر قرآن کریم ایک ہی دفعہ میں نازل ہو جاتا اور ان سے ان تمام امور کا بیک وقت مطالبہ کرتا تو وہ عاجز آ کر اس مطالبے کو پورا نہ کر پاتے، مزید بر آں ایسا کرنا قوانین فطرت اور انسانی تکمیل پذیری کے اصولوں کے بھی خلاف ہوتا۔

اس بارے میں ہم اپنی حالیہ زندگی سے بھی مثالیں پیش کر سکتے ہیں، مثلاً جن لوگوں کو تمباکو نوشی، شراب پینے، سڑکوں پر مٹر گشت کرنے یا ہوٹلوں میں فضول بیٹھنے کی عادت ہوتی ہے اگر آپ ان میں سے کسی سے کہیں کہ اگر تم آئندہ ہوٹل پر گئے تو تمہیں جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے تو وہ پھر بھی کوئی عذر تلاش کر کے ہوٹل جا پہنچے گا اور اگر وہ کسی دن نہ جا سکا تو گھر پر اس کا سارا وقت افسوس اور حسرت کرتے ہوئے گزرے گا حتیٰ کہ آخر کار عادت سے مجبور ہو کر ہوٹل کی طرف چل پڑے گا۔ یہ ایک معمولی سے عادت ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے لیے اسے چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اسی طرح تمباکو نوشی کے عادی شخص کو لے لیجئے۔ اگر آپ اس سے کہیں: ”برائے مہربانی تمباکو نوشی ترک کر دیجئے، کیونکہ یہ نہ صرف آپ کی صحت کے لیے نقصان دہ ہے، بلکہ بتدریج خودکشی کرنے کے مترادف ہے۔“ تو اسے آپ کی یہ بات یوں لگے گی جیسے آپ نے اس کے سینے میں خنجر کے پے درپے وار کر دیئے ہوں، بلکہ اگر آپ کسی ڈاکٹر کی زبانی اسے بتائیں گے کہ تمباکو نوشی میں کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ اس میں فلاں فلاں نقصان ہے تب بھی اسے تمباکو نوشی ترک کرنے میں شدید تردد ہو گا، حتیٰ کہ بہت سے ڈاکٹر حضرات تمباکو نوشی کے نقصانات سے آگاہ ہونے کے باوجود اسے نہیں چھوڑتے۔

شراب خور کو لے لیجئے۔ اس کی تو دنیا ہی کوئی اور ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت نشے میں مدہوش رہتا ہے، بلکہ اگر وہ ایک درجہ مزید نیچے آ جائے تو انسانیت کے دائرے سے ہی نکل جائے، لیکن

اس کے باوجود اگر آپ اسے ایک دم شراب نوشی ترک کرنے کا کہیں گے تو آپ کا یہ کہنا اس سے اپنی عادت اور نفسیات تبدیل کرنے کے مطالبے کے مترادف ہو گا۔

اگر آپ ان ہزاروں انسانوں کا تصور کریں گے جن کے رگ و ریشے میں بری عادت و اخلاق سرایت کر کے ان کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھیں تو آپ کو قرآنِ کریم کے بتدریج نزول کی ضرورت کا احساس ہو گا۔

قرآن کریم نے پہلے ان کی روحوں کو بری عادات واخلاق کی نجاست سے پاک کیا اور پھر ان کے دلوں کو اعلیٰ اخلاق سے مزین کیا اور مختصر سے عرصے میں کامیابی سے ہزاروں نفوس کی اصلاح کی۔ ہمارے خیال میں تیئس سال میں قرآن کریم کے نزول کو تیز رفتار نزول سمجھا جانا چاہیے۔ بدیع الزمان سعید نورسی کہتے ہیں: "اگر دورِ حاضر کے تمام فلسفی جزیرۂ عرب جا کر اپنی تمام کوششیں صرف کر ڈالیں تو کیا وہ سو سالوں میں بھی وہ کامیابی حاصل کر سکتے ہیں، جو رسول اللہ ﷺ نے ایک سال میں حاصل کی تھی؟" یہ ہمارا چیلنج ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ شراب نوشی کے سبب ہر سال سینکڑوں گھر اجڑتے ہیں، گرین کریسنٹ سوسائٹیز(28) ہر سال اس موضوع پر متعدد سیمینارز منعقد کراتی ہیں اور اس موضوع کو مڈل اور ہائی اسکولوں کے نصاب میں شامل کیا جا چکا ہے، لیکن اس کے باوجود نشے کے عادی کتنے لوگوں نے نشے کو چھوڑا ہے اور اس سے نجات پائی ہے؟ کیا یونیورسٹیاں اپنے تمام پروفیسرز کی خدمات حاصل کر کے نشے کے بیس عادی لوگوں کو بھی اس آفت سے نجات دلا سکتی ہیں۔ اگر انہیں اتنی بھی کامیابی نصیب ہو جاتی تو ہم اسے ان کی بہت بڑی کامیابی تصور کرتے اور انہیں رسول اللہ ﷺ کی کامیابیوں کے پہلو میں جلی حروف سے لکھتے، لیکن یہ بہت دور کی سوچ ہے۔ یہ کارنامہ صرف ایک بار سرانجام دیا گیا ہے اور دوست و دشمن سب جانتے ہیں کہ اسے دوبارہ سرانجام دینا ناممکن ہے۔

تیئس سال انتہائی مختصر مدت ہے، لہٰذا قرآن کریم نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے، وہ ایک معجزہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تیئس سال کی مدت میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں وہ انسانیت ہزاروں سال میں حاصل کر سکی اور نہ ہی کبھی حاصل کر سکے گی۔

قرآن کریم نے جہاں لوگوں کی سینکڑوں بری عادات واخلاق کا ازالہ کیا، وہیں انہیں کوئی تکلیف یا ایذاء دیئے بغیر اعلیٰ اوصاف واخلاق سے مزین بھی کیا۔ قرآن نے مختلف مراحل میں بہت سے مسائل کا عملی حل پیش کیا، جن میں سے بعض مراحل کے لیے آج تیئس سال سے کئی گنا زیادہ عرصہ درکار ہے۔

اس دور کے انسان کے لیے اوامر ونواہی کی ایک بڑی تعداد کو قابل قبول بنانے نیز برائیوں کے بتدریج خاتمے اور شخصیت کی بتدریج تعمیر کے لیے تیئس سال کی یہ مدت ناگزیر تھی، مثلاً اس مدت کے دوران شراب کو تین چار مراحل میں حرام قرار دیا گیا۔ بچیوں کو زندہ درگور کرنے کی ممانعت دو مراحل میں ہوئی۔ اس دور کے انسان میں اجتماعی شعور کو بیدار کر کے قبائلی زندگی کی تنظیم نو اور وحدت کا بندوبست کیا گیا، دوسرے لفظوں میں ان میں معاشرہ تشکیل دینے کی صلاحیت پیدا کی گئی۔ یہ اہداف بری عادات و اخلاق کا خاتمہ کر کے اور انتہائی مشکل اقدامات اٹھا کر ان کی جگہ اعلیٰ اخلاق پیدا کر کے حاصل کئے گئے۔ درحقیقت ان کاموں کے لیے اس سے کہیں زیادہ مدت درکار تھی۔

دورِ حاضر میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سال ہم مخصوص حالات کے پیش نظر معاشرتی اورانتظامی لحاظ سے ایک مخصوص پالیسی وضع کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ آئندہ سالوں میں پیش آنے والے حالات کی تبدیلی کا جائزہ بھی لیتے ہیں اور پھر ان متوقع تبدیلیوں کے پیش نظر اپنی پالیسیوں میں ردوبدل کرتے ہیں۔ اس طرح دراصل ہم حالات و واقعات کی نبض ٹٹول کر اس کے مطابق منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ عہدِ نبوی میں بھی اسی قسم کی صورتحال کا سامنا تھا۔

مسلمان ایک قد آور درخت کی مانند آہستہ آہستہ نشوونما پاتے اوراپنے آپ کو نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق ڈھالتے۔ ہر روز قافلۂ اسلام میں نئے نئے افراد شامل ہوتے اور انفرادیت کے عادی انسان میں اجتماعی شعور پیدا کرنے کے لیے ہر روز ایک نئے شعور اور فکر کی

ضرورت پیش آتی، لیکن یہ سب کچھ بتدریج، مسلسل اور منظم انداز میں ہوتا، اسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ زمانی اعتبار سے مختصر ہونے کے باوجود یہ مراحل اسلام کے ابدی حقائق اور خصوصیات کی عکاسی کرتے ہیں۔ اگر یہ تبدیلیاں تیئس سال کے دورانیے میں پیش نہ آتیں، بلکہ انہیں آنِ واحد میں یک بارگی اپنانے کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ غیر متمدن معاشرہ اس بوجھ کو برداشت نہ کر سکتا۔ ہم اس صورتحال کو سورج کی شعاعوں سے انسانی جسم میں ہونے والے تغیرات سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص سرد علاقے میں چلا جائے تو اس کی جلد میں معمولی تبدیلیاں رونما ہوں گی، لیکن وہ یک بارگی بیس جسی تغیرات (Mutations) کی بقدر تبدیلی برداشت نہ کر سکے گا، بلکہ فوراً مر جائے گا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک مخصوص فضائی دباؤ میں رہنے والے شخص کو ایک دم بیس ہزار فٹ کی بلندی پر لے جایا جائے۔ اچانک اس قدر بلندی پر جانے سے اس کی موت واقع ہو جائے گی حتی کہ ہوائی جہاز بھی جب اس قدر بلندی پر جاتے ہیں تو آکسیجن ماسک وغیرہ جیسی ضروری تدابیر اختیار کرتے ہیں۔

جس طرح یک بارگی بیس ہزار فٹ کی بلندی پر جانا انسانی موت کا باعث بن جاتا ہے، اسی طرح اگر قرآن کریم کے یک بارگی نازل ہونے کی صورت میں زندگی، فرد اور خاندان کے بارے میں غیر متمدن تصورات کے حامل معاشرے سے قرآن کریم کے تمام احکامات پر بغیر کسی کمی بیشی کے عمل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تو کوئی بھی شخص اسے پورا نہ کر سکتا، کیونکہ یہ معاشرے کو یک بارگی بیس ہزار فٹ کی ناقابل تحمل بلندی تک اٹھانے کے مترادف ہوتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا تیئس سال کے دوران بتدریج نازل ہونا انسانی طبیعت اور فطرت کے عین مطابق ہے۔

چونکہ انسان کو کائنات سے جدا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کائنات میں ہونے والے ارتقا کو نظر انداز کر کے انسان سے برتاؤ کیا جا سکتا ہے، اس لیے ہمیں اس کے ساتھ قوانین فطرت کے مطابق برتاؤ کرنا چاہیے۔ جس طرح کائنات میں بتدریج نمو ہوتا ہے اور قوانین فطرت بھی

بتدریج کام کرتے ہیں، اسی طرح انسانی نمو، ارتقا اور تکمیل پذیری بھی بتدریج ہوتی ہے۔ ترقی کی بنیاد اور اعلیٰ اصولوں کے مجموعے کی حیثیت رکھنے والے قرآن کے تیئس سال کے عرصے میں بتدریج نازل ہونے کے پیچھے بھی یہی حکمت کار فرما تھی۔

نزول وحی کے دورانیے کا تیئس سال پر محیط ہونا بھی حکمت پر مبنی تھا، ورنہ یہ مدت چوبیس یا پچیس سال بھی ہو سکتی تھی۔ قدرت الٰہیہ کا تقاضا یہ تھا کہ سید الانبیاء ﷺ کی عمر مبارک تریسٹھ سال ہو، جن میں سے تیئس سال زمانہ نبوت پر محیط ہیں۔ آپ ﷺ کی عمر مبارک چونسٹھ سال بھی ہو سکتی تھی، لیکن اس صورت میں عہد نبوت چوبیس برس کا ہو جاتا۔ ہم آپ ﷺ کی عمر اور نبوت کی مدت کو اسی حکمت الٰہیہ کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ واللہ اعلم

کیا اماں حواء حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہوئیں؟

انسان کسی ارتقا کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کی تخلیق ایک مستقل نوع کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ اس کا ظہور دوسری انواع کے ارتقا کے نتیجے میں ہوا، نہ اس کی خصوصیات ارتقائی مراحل کا نتیجہ ہیں اور نہ ہی وہ خود فطری انتخاب کا نتیجہ ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی حیثیت سے اس کی تخلیق فرمائی ہے۔ انسانی تخلیق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق کی مانند معجزہ ہے، جس کی اسباب کی روشنی میں کوئی توجیہہ پیش کرنا ممکن نہیں، ابھی تک علمائے طبیعیات اور ماہرین ارتقا زندگی کے ظہور پذیر ہونے کی کیفیت کی مثبت اور صحیح انداز سے وضاحت نہیں کر سکے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو نظریات پیش کیے ہیں ان کی بنیادیں کھوکھلی اور کمزور ہیں۔ وہ کسی صحیح سائنسی بنیاد پر قائم نہیں۔ کڑے تنقیدی جائزوں کے نتیجے میں ان کی بے مائیگی واضح ہو چکی ہے۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کی طرف مراجعت کر سکتے ہیں۔

جب ہم اسباب کے دائرے میں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو ہم "علت و معلول"، "سبب اور مسبب" اور "علت کی مناسبت" کی روشنی میں اس کا جائزہ لیتے ہیں، مثلاً ہم کہتے ہیں کہ مشیت خداوندی کے بعد ایک چھوٹے سے بیج سے ایک قد آور درخت کے نشوونما پانے کے لیے مخصوص شرائط مثلاً مناسب آب و ہوا اور اچھی زمین کے ساتھ ساتھ بیج میں عناصرِ حیات کا پایا جانا ضروری ہے۔ جب یہ تمام اسباب جمع ہو جاتے ہیں تو "علت تامہ" وجود میں آتی ہے، جو معلول کے ظہور پذیر ہونے کا باعث بنتی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ اسباب اذنِ خداوندی سے بیج سے درخت اور انڈے سے چوزے کے پیدا ہونے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

پہلے انسان کی تخلیق ایک معجزہ ہے۔ سبب اور مسبب کے پہلو سے ہم اس موضوع کا درج ذیل طریقے سے تجزیہ کر سکتے ہیں:

فرض کریں ہم ایک جانور سے دوسرا جانور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہم نے پرندے اور مرغی نیز گھوڑی اور دراز گوش میں جنسی ملاپ کرایا۔ پہلی صورت میں کوئی نتیجہ

بر آمد نہ ہوا، جبکہ دوسری صورت میں خچر کی صورت میں ایک ایسا بانجھ جانور حاصل ہوا جو اپنی نسل کو جاری رکھنے کی صلاحیت سے محروم ہے،اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ علت ناقص تھی، دوسرے لفظوں میں "علت کی مناسبت" کے اصول کے تحت نتیجے تک پہنچنے میں کہیں کوتاہی ہوئی ہے، لیکن دوسری طرف مرد اور عورت کے جنسی ملاپ کے نتیجے میں ایک کامل انسان وجود میں آتا ہے، کیونکہ عورت کے رحم میں مرد کے "سپرم" کے عورت کے "بیضہ" کے ساتھ ملاپ کے وقت تمام اسباب مکمل طور پر موجود ہوتے ہیں اور جنین اذنِ خداوندی اور مشیت الٰہیہ سے نشوونما پاتے ہوئے مختلف مراحل سے گزرتا ہے اور بلا آخر ماں کے پیٹ سے اس عالم رنگ و بو میں آجاتا ہے، دوسرے لفظوں میں تمام اسباب کے بیک وقت پائے جانے کی وجہ سے ہمیں حسبِ توقع نتائج حاصل ہو جاتے ہیں، گو اللہ تعالیٰ اس نظام کو تبدیل کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں اور بچے کو کسی دوسرے طریقے سے بھی پیدا فرما سکتے ہیں۔(29)

یہ بات تو اسباب کی حد تک تھی، لیکن جب کوئی واقعہ سبب و مسبب اور علت و معلول کے دائرے سے باہر پیش آئے تو اسے ارتقا اور فطری انتخاب کی روشنی میں سمجھنے کی بجائے اسی صورت میں قبول کرنا چاہیے، جس صورت میں اس کے وقوع پذیر ہونے کی اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں اطلاع دی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بتاتے ہیں کہ زیر غور موضوع سے متعلق بعض معجزات بھی رونما ہوئے ہیں، جن کی کوئی عقلی یا سائنسی توجیہہ پیش کرنے سے ہم قاصر ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بغیر ماں باپ کے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے معجزانہ طور پر پیدا فرمایا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو کسی بھی جاندار کو بغیر باپ یا بغیر ماں یا بغیر ماں باپ کے پیدا فرما سکتے ہیں، ایسے مواقع پر اسباب کی کڑیاں نہیں ملائی جا سکتیں۔ قرآن کریم چیلنج کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ﴾ (العنکبوت: ۲۰) "کہہ دو کہ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ اس نے کس طرح خلقت کو پہلی دفعہ پیدا کیا ہے۔" کیونکہ عدم سے تخلیق کرنے کی کوئی سائنسی توجیہہ ممکن نہیں۔

اسی سے ملتی جلتی صورتِ حال حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت حواء علیہا السلام کی تخلیق کی ہے، جو ایک مستقل معجزہ ہے، کیونکہ اس صورتِ حال کی اسباب کے دائرے میں توجیہہ ممکن نہیں ہے، تاہم کسی چیز کو محض ناقابل توجیہہ ہونے کی بنیاد پر رد نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کی بھی یہی صورتحال ہے: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ (آلِ عمران:۵۹) "عیسیٰ کا حال اللہ کے نزدیک آدم کا سا ہے کہ اس نے پہلے مٹی سے ان کو بنایا پھر فرمایا باشعور انسان ہو جا تو وہ ویسے ہی ہو گئے۔" انسانیت تخلیق کے آغاز کی حقیقت کو فراموش کر چکی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت نے اس بھولی ہوئی حقیقت کو پھر سے انسانیت کے ذہن نشین کرایا۔

اب ہم حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش کے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ میرے خیال میں اس موضوع سے متعلق اور بھی سوالات ذہنوں میں جنم لیتے ہیں، مثلاً حضرت حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی سب سے چھوٹی پسلی سے کیوں پیدا کیا گیا؟ پھر پسلی کا ہی انتخاب کیوں ہوا؟ نیز انہیں حضرت آدم علیہ السلام سے ہی کیوں پیدا کیا گیا؟

تاہم سب سے پہلے میں آپ کی توجہ ایک اہم پہلو کی طرف مبذول کرانا مناسب خیال کرتا ہوں، وہ یہ کہ انسان کے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے پر اس کثرت سے مضبوط دلائل موجود ہیں کہ انہیں رد کرنا ممکن نہیں۔ یہ حقیقت اللہ تعالیٰ کے وجود کی بھی کھلی دلیل ہے اور کائنات میں جاری قوانین، نظم و نسق اور اصول و مبادی اس حقیقت پر شاہد ہیں، نیز انسان کی حقیقت، اس کی باطنی کیفیات، دل اور ابھی تک پردۂ خفا میں موجود دیگر لطائف بھی وجودِ باری تعالیٰ کی طرف مشیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے وجود پر ہزاروں مضبوط دلائل موجود ہیں۔ فلاسفہ، مفکرین اور علمائے کرام میں سے جس نے بھی ان دلائل کا سہارا لیا ہے، وہ سلامتی کے ساحل پر جا پہنچا۔ اگر آپ کے پاس ایسے ایک ہزار دلائل موجود ہوں تو آپ کا موقف کس قدر مضبوط ہو گا۔

آج بعض منکرینِ خدا اور بے دین لوگ ان تمام دلائل سے صرفِ نظر کر کے حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش کو انکارِ خدا اور بے دینی کے جواز کی

دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ایک عظیم مرشد(30) ایسے لوگوں کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "اے دوست! دراصل تمہارے دل میں اندھاپن ہے، جو آفتابِ حقیقت کے مشاہدے میں رکاوٹ ہے۔" مشاہدے اور تجربے سے ثابت ہے کہ اگر اس قسم کے اندھے پن میں مبتلا لوگ کسی ماہر تعمیرات کے بنائے ہوئے عالیشان محل کو دیکھیں اور اس محل کے وجود پر بے شمار دلائل موجود ہوں، لیکن اگر انہیں اس محل میں کوئی ایک چھوٹا سا پتھر بھی غیر متوازن صورت میں پڑا ہوا ملے تو وہ سرے سے محل کے وجود کا ہی انکار کر دیتے ہیں۔اس سے ان کی جہالت، حماقت اور تخریبی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔" یہ اندھی تقلید، بغیر دلیل کے رائے قائم کرنے اور عقل و دانش کے فقدان کے سوا کچھ نہیں۔انفس و آفاق میں وجودِ باری تعالیٰ پر ہزاروں دلائل کے ہوتے ہوئے اس قسم کی یک طرفہ سوچ رکھنا کیا واضح غلطی نہیں ہے؟"

پسلی سے پیدائش کا تذکرہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مسند احمد بن حنبل کی روایات میں موجود ہے۔ کتبِ حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے حضرت حواء علیہا السلام کی پیدائش کے تذکرے کے علاوہ سورتِ نساء میں مذکور ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُواْ رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (النساء:۱) "اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک شخص سے پیدا کیا یعنی اول اس سے اس کا جوڑا بنایا۔"

اس آیت مبارکہ میں ضمیر "ھاء" آدم کی بجائے "النفس" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ایک اور آیت مبارکہ میں بھی یہ بات واضح طور پر دکھائی دے رہی ہے: ﴿خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (الزمر:٦) "اس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا پھر اس سے اس کا جوڑا بنایا۔"

یہ تعبیر قابل غور ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کی ذات کی بجائے ان کی ماہیت سے پیدا کیا ہے۔یہ بہت باریک نکتہ ہے۔نفسِ آدم ماہیت آدم سے مختلف چیز ہے، مثلاً انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی لمبائی، وزن اور خدوخال ایسے ایسے ہیں، نیز اس کی ایک ماہیت، ظاہری عالم، باطنی عالم، فکر اور اللہ

تعالیٰ سے قرب یا بُعد ہے۔ جب انسان کو ذات کی حیثیت سے زیر بحث لایا گیا ہے تو اسے ماہیت کی حیثیت سے بھی زیر بحث لایا جانا چاہیے، کیونکہ پہلی حیثیت تو محض اس کی ظاہری ہیئت سے عبارت ہے۔ اس اعتبار سے ان کی ذات اور نفس ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور ان کا جسم ان سے مختلف اور دوسری چیز ہے۔ قرآنِ کریم حضرت حواء علیہا السلام کی تخلیق کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان کی تخلیق آدم کے نفس سے ہوئی ہے نہ کہ آدم سے۔

چونکہ اس سلسلے میں وارد احادیث تواتر سے ثابت نہیں، بلکہ اخبارِ احاد ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ان کے مفہوم کا تعین قرآنی آیات کی روشنی میں کیا جائے۔ آیات و احادیث کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں یہ ایک اہم اصول ہے۔ چونکہ زیر بحث آیت مبارکہ متواتر بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام بھی ہے، اس لیے حدیث نبوی کے مبہم پہلوؤں کی وضاحت کے لیے آیت مبارکہ کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، نیز اس حدیث کے سیاق و سباق اور پس منظر سے واقفیت بھی ناگزیر ہے۔

ارشاد نبوی ہے: ”جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ اپنے پڑوسی کو ایذاء نہ پہنچائے، عورتوں کے بارے میں بھلائی کی نصیحت کو قبول کرو۔ وہ پسلی سے پیدا ہوئی ہیں۔ پسلی کا سب سے ٹیڑھا حصہ اس کا اوپر والا حصہ ہوتا ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنے لگو گے تو اسے توڑ بیٹھو گے اور اگر اسے یوں ہی چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ عورتوں کے بارے میں خیر خواہی کی نصیحت کو قبول کرو۔“ (31) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا مقصد عورتوں کی تربیت اور گھر کے نظم و نسق کے بارے میں بتانا ہے، لہٰذا اگر آپ جلدی میں عورت کی اصلاح کی کوشش کریں گے تو آپ اسے توڑ بیٹھیں گے اور اگر آپ نے اس کی اصلاح کو نظر انداز کر دیا تو وہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ایک بہت اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ یہ کہ عورتوں میں مردوں کی بہ نسبت کج روی کے پیدا ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، نیز نازک مزاج ہونے کی وجہ سے ان میں شکستگی کا امکان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ درحقیقت حدیث شریف کا اصل مقصد حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے حضرت حواء علیہا

السلام کی تخلیق کی وضاحت کرنا نہیں ہے، بلکہ اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ اگر عورت کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اس میں کج روی باقی رہتی ہے اور اگر اسے جلد بازی میں سیدھا کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ شکستگی کی صورت میں نکلتا ہے۔

مفہوم کی اس تعبیر میں حکمت پوشیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حدیث پاک میں "من ضلع" کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ عربی زبان میں "من" کا لفظ کبھی تو تبعیض یعنی جزئیت پر دلالت کرنے کے لیے آتا ہے اور کبھی "بیان" یعنی جنس کی وضاحت کے لیے آتا ہے، لہٰذا چونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس موضوع پر کوئی واضح موقف اختیار نہیں فرمایا، اس لیے اس تعبیر کی مختلف توجیہات ہو سکتی ہیں۔

ذخیرۂ احادیث میں اس کی اور بھی بہت سے مثالیں ملتی ہیں، مثلاً ارشادِ نبوی ہے: "لا تصلوا فی مبارک الابل،فانها من الشياطين"(32) "اونٹوں کے باڑے میں نماز مت پڑھو، کیونکہ وہ شیاطین میں سے ہے۔" جب رسول اللہ ﷺ انسانوں کی طرح جانوروں کے لیے بھی شیاطین کا ہونا بتاتے ہیں تو اس سے رسول اللہ ﷺ کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ جانور بعض اوقات شیطانی کام کرتے ہیں، یعنی ہمیں شیطانی تصرف سے آگاہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ جب ہم کسی بے حس اور موٹی عقل کے انسان کے بارے میں کہتے ہیں: "هذا الرجل مخلوق من خطب" (یہ شخص لکڑی کا بنا ہوا ہے۔) تو ہمارا مقصود یہ بتانا نہیں ہوتا کہ وہ واقعی لکڑی کا بنا ہوا ہے، بلکہ ہم مجازاً اس کی بے حسی، شعور کی کمی اور جذبات کی پژمردگی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص شیطان ہے تو ہم اس طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو بہکاتا، گمراہ کرتا اور گناہوں کے راستے پر ڈالتا ہے۔

اب ہم آیت مبارکہ کی روشنی میں اس حدیث نبوی پر غور کرتے ہیں۔ عورت کے آدم کی پسلی سے جنم لینے کا مطلب یہ ہے کہ عورت آدم کا جوڑ اور اس کی ہم جنس ہے اور دونوں کے موروثی خواص ایک جیسے ہیں۔ اگر مرد اور عورت کی جنس ایک نہ ہوتی تو ان کے درمیان توالد و تناسل کا سلسلہ نہ چل سکتا، کیونکہ آیت مبارکہ میں آگے چل کر ہے: ﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيراً

وَنِسَاء﴾(النساء:۱)"پھر ان دونوں سے کثرت سے مرد و عورت پیدا کر کے روئے زمین پر پھیلا دیئے۔"یعنی اگر دونوں کی جنس مختلف ہوتی تو ان کے درمیان توالد و تناسل کا سلسلہ جاری نہ ہوتا، اس لئے دونوں کا ہم جنس ہونا ناگزیر تھا۔ حدیث میں مذکور لفظ "ضلع" میں کج روی کی بہ نسبت کج روی کی طرف میلان اور سہولت سے کج روی کے پیدا ہونے کا مفہوم زیادہ پایا جاتا ہے۔

عورت کے مرد کی بہ نسبت کج روی کی طرف زیادہ مائل ہونے کی تعبیر کو رسول اللہ ﷺ نے بڑے اہتمام سے اختیار فرمایا ہے۔ اس معاملے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، کیونکہ عملی صورت حال اس پر شاہد ہے۔ غافل اور گمراہ لوگ دوسروں کو بہکانے کے لیے عورتوں کو آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بیسویں صدی میں تو عورت کو اس قدر استعمال کیا گیا ہے کہ پہلے کبھی بھی اسے اس قدر استعمال نہیں کیا گیا۔ اشتہارات کو مؤثر بنانے کے لیے اکثر اشتہارات میں عورت کا استعمال اور اسے آلہ کار بنانا حدیث شریف میں وارد عورت کے ضعف کی وجہ سے ہی ہے اور اس کی دلیل بھی ہے۔ بھلا گاڑیوں کے ماڈلوں، باتھ ٹب اور حمام کے سامان، کٹے ہوئے گوشت اور ہام برگر کی تشہیر میں عورت کی تصویروں کے استعمال کا کیا جواز پیش کیا جا سکتا ہے؟ عورت اور ان اشیاء کے درمیان آخر کیا تعلق ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بتایا ہے کہ عورت مرد کے سب سے ٹیڑھے حصے سے پیدا ہوئی ہے۔ عورت کا دور حاضر میں گمراہ لوگوں کے ہاتھوں میں آلہ کار بننا اس بات کی تائید ہے۔ عورت نوع انسانی کے سب سے زیادہ ٹیڑھے پہلوؤں کی علامت بن چکی ہے۔ بلاشبہ اس بات کی وضاحت کے لیے اس سے بہتر تعبیر اختیار نہیں کی جا سکتی تھی۔

آیئے اس موضوع کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھتے ہیں۔ تورات کے سفر تکوین میں واضح طور پر مذکور ہے کہ حضرت حواء علیہا السلام کو حضرت آدم علیہ السلام کے پہلو سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ایک معجزہ تھی اور جب حضرت آدم علیہ السلام ابھی آب و گل کی درمیانی کیفیت میں تھے، اس وقت اماں حواء کی

تخلیق کے لیے ان کے جسم کے کسی حصے سے کچھ اجزاء لینے میں کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حضرت حواء علیہا السلام دونوں پہلی تخلیق کا معجزانہ مظہر تھے۔

اس پہلی تخلیق کے بارے میں سائنس کسی قسم کی معلومات فراہم نہیں کر سکتی۔ وہ اس کی حقیقت تک رسائی پانے سے عاجز ہے، کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کی ہر بات کو تسلیم کرتے ہوئے اس تخلیق کو ایک معجزہ مانتے ہیں، لیکن ہم اسے بغیر دلیل کے تسلیم نہیں کرتے، بلکہ ایٹم سے لے کر پوری کائنات تک ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کے ارادے، حکم اور علم کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس پر ایمان رکھتے ہیں، دوسرے لفظوں میں ہم اس بات کو دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

کیا روحوں کے غیر متغیر ہونے سے ان کا غیر حادث ہونا لازم نہیں آتا؟

اس سوال کا تعلق علم الکلام کے مشکل ترین مباحث سے ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ چونکہ کائنات ہر لمحہ تغیر پذیر ہے، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ وہ حادث ہے، یعنی عدم سے وجود میں آئی ہے اور عدم کی طرف ہی محو سفر ہے۔ وہ مسلسل حرکت میں ہے اور تحلیل ہو رہی ہے۔ دوسری طرف اس تغیر پذیر کائنات کو وجود بخشنے اور اس کا نظام چلانے والی ذات ہر قسم کے تغیر و تبدل سے پاک ہے، گویا ہر تغیر پذیر چیز تغیر و تبدل سے پاک ذات کی طرف مشیر ہے اور وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذاتِ واجب الوجود ہے، جو تمام کونی اور بشری عوارض سے ماورا ہے۔ خدائی صفات کے تذکرے کے ضمن میں اوپر ذکر کردہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ تغیر و تبدل سے پاک ہیں۔ وہ کھانے پینے کے محتاج نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے اور اپنے وجود کے لیے کسی کے محتاج نہیں، لیکن ایک پہلو سے روح بھی بسیط ہے، یعنی وہ مادے سے مرکب نہیں، قرآنی اصطلاح میں اس کا تعلق عالم خلق کی بجائے عالم امر سے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذرات کی ترکیب کے نتیجے میں وجود میں نہیں آئی، بلکہ اس کا تعلق ملائکہ کرام کی طرح کے ان باشعور نورانی قوانین سے ہے، جو امر خداوندی سے وجود میں آتے ہیں، دوسرے لفظوں میں روح نیوکلیس اور الیکٹرانز میں موجود قانونِ کشش اور بیج میں موجود قانونِ نمو کی طرح کا ایک قانون ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے قوانین میں زندگی اور شعور نہیں ہوتا اور اس میں شعور ہے۔

روح بسیط اس لیے ہے کہ یہ مادے سے مرکب ہوتی ہے اور نہ ہی اینات (Ions) کی صورت میں تحلیل ہوتی ہے، بلکہ اس کا وجود ہر دم برقرار رہتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ نعوذ باللہ وہ اس پہلو سے اللہ تعالیٰ کے مشابہ ہیں، یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ تغیر سے پاک ہیں، اسی طرح ان کی روح میں بھی تغیر نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ آخر خدا اور روح میں کیا فرق ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تغیر و تبدل اور الوان و اشکال سے منزہ و مبریٰ ذات ہیں، جبکہ روح کو اللہ تعالیٰ نے بسیط بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ خالق اور روح مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ خود سے قائم اور موجود بذاتہ ہیں، جبکہ روح سمیت ساری مخلوقات کی بقا اللہ تعالیٰ کی محتاج ہے۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے دستِ استعانت پھیلائے کھڑی ہے اور اللہ تعالیٰ "ایاک نستعین" کے صدقے ساری مخلوق کی اعانت و مدد فرماتے ہیں۔ دوسری مخلوقات کی طرح روح بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے دست حاجت پھیلائے ہوئے ہے۔ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کے سہارے کھڑا ہے۔ جب تک اسے یہ سہارا ملا رہے گا اس کا وجود برقرار رہے گا، بصورت دیگر فنا اس کا مقدر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے روح کو ایک ایسے ذی شعور قانون کے طور پر پیدا فرمایا ہے، جو اس کی قدرت و ارادے کا محتاج ہے۔ اس کے وجود کو صرف اسی صورت میں استمرار و دوام حاصل رہے گا۔

بات سمجھانے کے لیے ہم یہ مثال دے سکتے ہیں کہ سورج میں روشنی، کرنیں اور رنگ ہیں، یہی صورتِ حال چاند کی بھی ہے، لیکن اگر بالفرض سورج فنا ہو جائے تو چاند میں کسی قسم کی روشنی اور چمک باقی نہ رہے گی، اس سے ثابت ہوا کہ چاند کی روشنی سورج میں موجود اصل روشنی کا پرتو اور جھلک ہے۔ سورج کے فنا ہونے کی صورت میں چاند کی ضیا پاشی برقرار نہیں رہ سکتی، کیا ایسی صورت میں چاند اور سورج کو ایک ہی پلڑے میں رکھا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ قرآن کریم چاند کو "منیر" (الفرقان:۱) اور اس کی روشنی کو نور جبکہ سورج کو ﴿سراج وہاج﴾ (النبأ: ۱۳) "روشن چراغ" قرار دیتا ہے۔ اگرچہ یہ مثال اور تشبیہ مقام الوہیت کی عظمت کے شایاں نہیں، لیکن اس بات کو سمجھانے کے لیے ایک مادی تشبیہ کی ضرورت تھی۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ روحوں کے ساتھ ساتھ جسموں کو بھی بقا اور خلود عطا فرمائیں گے۔ اللہ بھی باقی ہیں اور وہ بھی باقی رہیں گے، لیکن ان کی بقا اللہ تعالیٰ کی مشیت کی مرہونِ منت ہوگی۔ اگر اللہ چاہیں گے تو سب کو فنا فرما دیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کا وجود قائم بذاتہ ہے۔ ہر چیز فنا ہو سکتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس تمام عوارض سے پاک ہیں۔

کیا آیت مبارکہ ﴿وَاللّٰہُ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ﴾ (البقرۃ: ۲۱۳)"اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھادیتا ہے۔" سے اللہ تعالیٰ کا اپنے بعض بندوں کی طرفداری کرنا لازم نہیں آتا؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کی طرفداری کریں تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے پوچھے کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہیں، وہ انسانوں سمیت ہر چیز میں تصرف کرتے ہیں، لیکن کسی کو بھی کوئی دعوی یا اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے مالک ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرتے ہیں، لہٰذا جب سوال حق سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے متعلق ہو تو انتہائی ادب واحترام سے سوال کرنا چاہیے۔ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے قبضہ وتصرف میں ہے اور وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اس انداز سے سوال کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی شان میں بے ادبی کا پہلو پایا جاتا ہے۔

تاہم یوں سوال کیا جاسکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی مجھے ہدایت یا گمراہی کے راستے پر ڈالتے ہیں تو پھر کس بنیاد پر یا کس حکمت کے تحت مجھ سے مواخذہ فرمائیں گے؟ یہ درست ہے کہ وہ حاکم مطلق ہیں، لیکن آخر اس میں کیا حکمت پنہاں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں گمراہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے مختلف مقامات پر اس حقیقت کو بار بار بیان فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگرچہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، لیکن ان کا سبب بندے کا اقدام ہوتا ہے، البتہ بندے کا اقدام اس قدر ضعیف ہوتا ہے کہ اسے نظر انداز کر کے ہر چیز کا سبب خالق کائنات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ہم مختلف کام کرتے ہیں، مثلاً مشروبات پیتے اور کھانا کھاتے ہیں، جس کے نتیجے میں پروٹینز، وٹامنز اور مختلف عناصر ہمارے جسم میں داخل ہو کر اپنے اپنے مقامات پر پہنچتے ہیں اور مختلف فرائض سرانجام دے کر ہم پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہ تمام

سرگرمیاں ایسی حساس بنیادوں پر استوار ہوتی ہیں کہ صرف منہ میں نوالہ ڈال کر انہیں پورا نہیں کیا جاسکتا اور اگر بالفرض ایسا کیا بھی جاسکتا تو منہ میں محض نوالہ ڈالنے کے لیے بھی ہاتھ کی توانائی اور دماغ کی قوتِ ادراک درکار ہوتی ہے اور یہ تمام نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہیں۔

انسان جونہی اپنے منہ میں نوالہ ڈالتا ہے اللہ تعالی لعاب پیدا کرنے والے غدودوں کو فعال کر دیتے ہیں، جس سے منہ میں لعاب پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی دماغ کو سگنل دے دیا جاتا ہے، جو معدے کو خفیہ طریقے سے پیغام بھیجتا ہے کہ وہ تیار ہو جائے اور ضروری مواد کو جدا کر دے، کیونکہ فلاں قسم کا کھانا اس میں پہنچنے والا ہے۔ یہ پیغام ملتے ہی معدہ اپنی تمام غدودوں کے ہمراہ یہ خدمات سر انجام دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اگر انسانی عقل، انسانی جسم کے فرائض کے صرف اسی مرحلے پر غور وفکر کرے تو اس کے بہت ہی کم حصے کو سمجھ پائے۔

بسا اوقات انسان غلطی سے کوئی سخت چیز کھالیتا ہے۔ معدہ اپنے فرائض سر انجام دیتے ہوئے نشاستہ اور گلوکوز وغیرہ جن چیزوں کو پگھلا سکتا ہے انہیں پگھلا دیتا ہے، لیکن کام یہیں پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ جب کھانا آنتوں کی طرف جارہا ہوتا ہے تو انہیں ایک پیغام بھیجا جاتا ہے کہ کھانے کی بعض سخت اقسام تمہاری طرف آرہی ہیں، جنہیں تیزابیت کی مدد کے بغیر ہضم نہیں کیا جا سکتا۔ اس مرحلے میں بھی انسانی عمل کا کوئی دخل نہیں ہوتا، چنانچہ سیلی لوزی (Cellulose) مواد آنتوں کی طرف بھیجا جاتا ہے اور وہ اپنا کام شروع کر دیتی ہیں، لیکن اگر اس مواد میں کوئی ایسی چیز ہو جسے انزیم (Enzyme) نہ ہونے کی وجہ سے تحلیل نہ کیا جاسکتا ہو، مثلاً سیب کے چھلکے وغیرہ تو اسے جسم سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یہ تمام امور انتہائی احتیاط سے اور معدے میں قابل ہضم یا ناقابل ہضم چیزوں کے بارے میں خفیہ پیغامات کے تبادلے کے نتیجے میں سر انجام پاتے ہیں۔ اس کے بعد جگر کا کام شروع ہوتا ہے جو اپنے ذمہ عائد سینکڑوں فرائض سر انجام دیتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ جب نوالہ انسان کے جسم میں جاتا ہے تو اسے جسم کے لیے مفید بنانے کے لیے ہزاروں سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں، جن میں سے کسی بھی سرگرمی میں انسانی عمل دخل نہیں

ہو تا، لیکن اگر کوئی ناشکر گزار انسان اس کے باوجود یہ کہے: "میں نے نوالہ نگل کر اپنے جسم میں فولاد اور کاربن کے اجزاء محفوظ کئے اور میں نے خود اپنے جسم کے ہر خلیے کو اس کی ضرورت کی اشیاء فراہم کیں، مثلاً جسے وٹامنز کی ضرورت تھی اس کی طرف وٹامنز بھیجے، جسے پروٹینز کی ضرورت تھی اس کی طرف پروٹینز بھیجے۔ میں نے خود جسم کا درجہ حرارت معلوم کر کے ہر چیز کا انتظام کیا اور اسے اپنے اپنے کام میں لگایا۔" تو کیا اس کی یہ بات اللہ تعالیٰ کے افعال اور اقدامات میں شرکت کا دعوی کر کے "شرک" کے مترادف نہ ہو گی؟ حالانکہ ایسے مواقع پر یوں سوچنا اور کہنا چاہیے تھا: "ایک غیبی ہاتھ نے ان تمام پراسرار کاموں کو انتہائی احتیاط سے سرانجام دیا ہے۔ میں جو نہی اپنے منہ میں نوالہ ڈالتا ہوں عجیب و غریب سرگرمیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، لہذا اس نوالے کو ہضم کرنے میں میرا کوئی کردار نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہضم اور اس کے بعد کی تمام سرگرمیاں سرانجام دی ہیں۔" ہم یہ بات کہہ کر انسانی عمل کو اللہ کی طرف منسوب نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے کام کو ہی اس کی طرف منسوب کرتے ہیں، کیونکہ اس بارے میں انسانی کردار اتنا معمولی ہے کہ اسے اس کی طرف منسوب کرنا مناسب نہیں۔

ہدایت انتہائی اہم معاملہ ہے۔ اس کے حصول میں انسانی ارادے اور کسب کا بہت کم عمل دخل ہے، تاہم اس کے لیے اہلیت اور استحقاق کا اظہار ضروری ہے، مثلاً بسا اوقات میں پورے شرحِ صدر سے اپنے تمام احساسات و جذبات کو سامعین کی طرف منتقل کرنا چاہتا ہوں، لیکن ﴿وَمَا تَشَاؤُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ﴾ (الانسان: ۳۰) "اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر جو اللہ کو منظور ہو۔" کا اظہار ہوتا ہے اور میں حسبِ امکان بہت کم بات منتقل کر پاتا ہوں۔ بسا اوقات میں پورے اخلاص کے ساتھ خدائی احکام اور قرآنی معارف کا ابلاغ کرنا چاہتا ہوں، لیکن اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں۔ بعض اوقات میں اتنے خشوع کے ساتھ نماز پڑھنا چاہتا ہوں کہ جس میں میں وجد و کیف میں آکر انفس و آفاق سے بیگانہ ہو جاؤں، لیکن مجھے اس میں محض ہزارویں حصے کی بقدر کامیابی ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر میں مخلص ہوں تو میرے اختیار میں سوائے رغبت کے اظہار کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ خالق کے ہاتھ میں ہے۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے نفوس کے حوالہ نہ کیجیے، ورنہ ہم برباد ہو جائیں گے۔

اگر ہم ذرا سا بھی غور کریں تو ہمیں محسوس ہو گا کہ ایمانی لذت و ذوق، جنت کا شوق، رضا بالقضاء اور اللہ کی محبت سب اللہ کی دین ہیں، جسے اللہ تعالیٰ انسان کے دل میں ودیعت کرتے ہیں۔ انسان تو صرف اقدام کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سعد الدین تفتازانی لکھتے ہیں: ''ایمان ایک شمع ہے، جسے اللہ تعالیٰ اُس انسان کی روح میں روشن کرتے ہیں، جو اسے حاصل کرنے کے لیے اپنے جزئی ارادے کو استعمال کرتا ہے۔'' (ہمارے دلوں میں اس شمع کو روشن کرنے والے پر ہماری جان فدا ہوا۔) آپ اس اہم ترین معاملے میں سوائے اپنے جزئی ارادے کے اور کچھ نہیں کر سکتے، گویا آپ صرف ایک بٹن دباتے ہیں، جس کے نتیجے میں آپ کی پوری زندگی پر نور ہو جاتی ہے۔ یہ ہزاروں بلبوں پر مشتمل فانوس کے بٹن کو دبانے کی طرح ہے، دوسرے لفظوں میں ایمان کی طرف اس قدر معمولی انسانی ارادے اور اقدام کے نتیجے میں ایمان کی شمع روشن ہو جاتی ہے۔

کھانے کے ایک نوالے والی اوپر ذکر کردہ مثال اس معاملے کی بہترین مثال ہے: ﴿وَمَا تَشَاؤُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللّٰهُ﴾ (الانسان: ۳۰) ''اور تم کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر جو اللہ کو منظور ہو۔'' ﴿يُضِلُّ اللّٰهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ (المدثر: ۱۳) ''اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ رہنے دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔'' خدا کے ارادے پر کوئی ارادہ غالب نہیں آسکتا۔ وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔

حاصل یہ کہ ہدایت کا زیادہ تر مدار مشیت ایزدی پر ہے اور اس میں ہمارا عمل دخل اس قدر کم ہے کہ اسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے، لہذا اس معاملے کو انسان کی طرف منسوب کرنا ایک نامقبول جسارت تصور ہو گی۔

ایک حدیث کا مفہوم ہے: "تھوڑی دیر کا غور و فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔" غور و فکر کا کیا طریق کار اور اصول و ضوابط ہیں؟ کیا اس کا کوئی خاص ورد یا ذکر ہے؟ سب سے زیادہ کن آیات میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے؟ کیا خاموش دعا غور و فکر کے قائم مقام ہو سکتی ہے؟

میرے خیال میں جب سوال پوچھا گیا ہے تو اس کا جواب بھی دیا جانا چاہیے۔ اگرچہ جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ کچھ دیر کا غور و فکر ایک سال کی نفلی عبادت سے بہتر ہے، ایک ضعیف روایت ہے، لیکن قرآنِ کریم کی بہت سی آیات مبارکہ سے اس بات کی تائید ہوتی ہے: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُوْلِي الألْبَابِ﴾ (آل عمرآن: ۱۹۰) "بیشک آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔"

بلاشبہ جس حیرت انگیز نظام کے تحت شمس و قمر کی حرکت اور ان کا طلوع و غروب ہوتا ہے، اس میں عقل والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔ اس آیت مبارکہ میں غور و فکر کرنے کی کھلے لفظوں میں دعوت دی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "وہ شخص برباد ہو جائے، جس نے یہ آیت تلاوت کی، لیکن اس پر غور و فکر نہ کیا۔"(33)

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب اس آیت کا نزول ہوا یا جب آپ ﷺ نے اس کی تلاوت فرمائی تو آپ ﷺ رو پڑے۔ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت مبارکہ نمازِ تہجد میں تلاوت فرمائی اور اس قدر روئے کہ آپ ﷺ کی داڑھی مبارک تر ہو گئی۔ یہ اور اس قسم کی دیگر آیات غور و فکر کی راہ میں راہنما کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں اسلامی نقطۂ نظر سے غور و فکر کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کے بارے میں مخصوص اشارات پائے جاتے ہیں۔

لیکن سب سے پہلے تفکر کا مفہوم معلوم ہونا چاہیے۔ تفکر کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد پہلے سے معلوم حقائق پر ہو، کیونکہ جاہل اور اندھے کا تفکر بے فائدہ ہے۔ ایسے تفکر سے کچھ عرصے

کے بعد اکتاہٹ کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، لہٰذا انسان نے جس موضوع پر غور و فکر کرنا ہے، اس کے بارے میں اسے اچھی خاصی معلومات ہونی چاہئیں اور غور و فکر کے لیے منتخب موضوعات اس کے ذہن نشین ہونے چاہئیں، تاکہ اس کا تفکر منظم اور اصول وضوابط کے مطابق ہو۔

اگر کسی انسان کو چاند اور ستاروں کی نقل و حرکت اور انسان کے ساتھ ان کے تعلق کے بارے میں کسی قدر علم ہو اور انسانی ترکیب کا حصہ بننے والے ذرات کی حیرت انگیز سرگرمیوں اور ان کی نقل و حرکت سے بھی اسے کچھ نہ کچھ واقفیت ہو تو ایسا انسان اگر ان موضوعات پر غور و فکر کرے تو اس کی اس سرگرمی کو تفکر کے دائرے میں لایا جاسکتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص شمس و قمر کی نقل و حرکت کا جذباتی یا شاعرانہ انداز میں تذکرہ کرے تو ایسے شخص کو غور و فکر کرنے والا شخص قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ اسے ہم خیال آفریں شخص کہیں گے، اسی طرح ہر چیز کا سبب فطرت کو قرار دینے والے بعض علمائے طبیعیات کے غور و فکر کو بھی تفکر نہیں کہا جاتا۔ دور جمہوریت میں شہرت پانے والے بہت سے لوگوں میں سے گنتی کے چند لوگوں کو ہی مفکر کہا جا سکتا ہے، لیکن ان چند لوگوں کے خلاف محاذِ جنگ کھول کر کے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ معاشرے کو ان سے واقف ہونے دیا گیا ہے اور نہ ہی انہیں شہرت پانے دی گئی ہے۔ اس دور میں بہت کم لوگوں نے کائنات اور اشیاء کی حقیقت جاننے کی کوشش کی ہے، لیکن وہ کبھی بھی اشیاء کے حقائق دریافت نہ کر سکے۔ یہ درست ہے کہ جب انسان شعرائے فطرت کے کلام میں پانی اور بارش کے قطروں کے گرنے، درختوں کے پتوں کے ٹکرانے اور پرندوں کے چہچہانے کی منظر کشی سنتا ہے تو اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرتا ہے، لیکن چونکہ وہ آخرت کے احساس سے محروم، ماضی کے دشمن اور حاضر سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے، بلکہ صرف اسی ظاہری جہاں کے گرداب میں پھنسے رہتے ہیں اور اس عالم کے پردوں سے پرے نہیں دیکھ پاتے۔ ان کی حالت ایک چپو والی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھے اس مسافر جیسی ہوتی ہے، جو انتہائی وسیع سمندر میں اپنے ہی گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے تفکر کا ہر پہلو بند گلی کی مانند ہوتا ہے۔ ان کا تفکر اس بندش و رکاوٹ کے نتیجے میں بالآخر مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کے تفکر کا کوئی فائدہ نہیں۔

غور و فکر کرنے کے لیے پہلے کچھ بنیادی باتوں اور حقیقی صورتحال کا علم ہونا، ذات کے حسبِ حال مجتہدانہ انداز میں فکری تراکیب وجود میں لانا، فکری ذخیرہ، خوفِ خدا اور تلاشِ حق کی خاطر مشقتیں برداشت کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ جو شخص اس طریقے کے مطابق مسلسل غور و فکر کر سکتا ہے وہ نئی اشیاء اور آفاق دریافت کر سکتا ہے اور جب وہ ان نئے آفاق کو ایک دوسری فکری مہم کی بنیاد بناتا ہے تو نئے اور زیادہ گہرے فکری نتائج تک پہنچ سکتا ہے اور اپنے ایک یا دو بعد والے فکر کو تین یا اس سے بھی زیادہ ابعاد والے فکر میں تبدیل کر سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں وقت کے ساتھ ساتھ اسے پر لگ جاتے ہیں، جن کی مدد سے وہ فکری جہاں میں پرواز کرتا ہوا انسانِ کامل کے مقام تک جا پہنچتا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تفکر میں سب سے بنیادی چیز اپنے آپ کو کتابِ فطرت کو پڑھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کا عادی بنانا ہے۔ اس کے بعد دل اور سینے کو خدائی الہامات کے لیے اور عقل کو فطری شریعت کے اصول و مبادی کے لیے وا کرنا اور کائنات پر قرآن کی روشنی میں غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ قرآن کو کائنات کی کتاب بھی کہا جاتا ہے۔ تفکر کے لیے ان شرائط کا لحاظ کرنا ضروری ہے، ورنہ اشیاء کو سطحی نظر سے دیکھنا اور یہ جاننا کہ فلاں ستارہ زہرہ ہے، سورج فلاں وقت غروب ہوگا اور مریخ فلاں مقام پر موجود ہوگا وغیرہ وغیرہ قسم کی بے مقصد اور بے تکی معلومات تفکر کہلا سکتی ہیں اور نہ ہی ان سے کوئی نتیجہ یا مقصد حاصل ہو سکتا ہے، بلکہ اس قسم کی کاوشوں پر ثواب ملنا بھی مشکوک ہے۔

تھوڑی دیر کے غور و فکر کے ایک سال کی نفلی عبادت کے برابر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان تھوڑی دیر کے صحیح اور مثمر تفکر کے ذریعے اپنے ایمان کی بنیادوں کو غذا اور تقویت پہنچا سکتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کے نفس میں معرفت کے انوارات اور اس کے دل میں محبت الٰہیہ کی تجلیات پیدا ہوتی ہیں اور وہ روحانی ذوق و شوق سے سرشار ہو کر اس کی فضاؤں میں محوِ پرواز ہو جاتا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو اس انداز سے غور و فکر کرتا ہے، وہ ایسے مقام تک پہنچ سکتا ہے، جہاں تک اس قسم کے تفکر سے محروم شخص ایک ہزار ماہ میں بھی نہیں پہنچ سکتا، دوسرے لفظوں میں اس قسم کے تفکر سے بہرہ مند شخص بہت زیادہ اجر و ثواب کما لیتا ہے، لیکن جو شخص اس شعور اور جذبے سے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، وہ سو سال تک اپنا رخ مشرق و مغرب کی طرف

پھیرے رکھے، ایک قدم بھی پیش رفت نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی یہ جدوجہد تھوڑی سی دیر کے تفکر کے برابر ہو سکتی ہے، تاہم اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ایسے شخص کی سو سالہ عبادت اکارت گئی۔ اللہ تعالیٰ ایک رکعت بلکہ ایک سجدے کے ثواب کو بھی ضائع نہیں فرماتے: ﴿فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ O وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ﴾ (الزلزال:۸-۷)"تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا۔"یعنی ہر شخص کو اس کے اعمال کا صلہ ملے گا،لہذا ایسا شخص عبادت کی اپنی ذمہ داری ادا کر کے اپنے پروردگار کے ساتھ ایک خاص قسم کا تعلق قائم کرنے میں یقیناً کامیاب ہوا ہے، لیکن اسے وہ مقام حاصل نہ ہو سکا، جو تفکر سے حاصل ہو تا ہے۔ ایسا تفکر یقیناً سو سال کی عبادت کے برابر ہو سکتا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو تا ہے کہ کیا کوئی ایسا ورد یا ذکر ہے، جو تفکر کی بنیاد اور ذریعہ بن سکتا ہے؟ کیا کوئی خاص ورد یا ذکر انسان کے تفکر کی توسیع میں معاون بن سکتا ہے؟ کتابِ فطرت کے مطالعے کی طرح اس کا تعلق بھی اس بات سے ہے کہ انسان اس ورد یا ذکر کو کس قدر شعور، فہم اور دھیان سے پڑھتا ہے۔ شعور اور دھیان سے کی جانے والی دعا اور وجد و کیف سے معمور مناجات انسانی باطن کے زنگ آلود تالوں کو کھولنے کے لیے کارگر ثابت ہوتی ہیں، تاہم میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس مقصد کے لیے کون سے اور کیسے ورد یا ذکر کا انتخاب کیا جائے، کیونکہ اس کا تعلق لوگوں کی صلاحیت و قابلیت اور ان کے ایمانی درجات اور عقیدت سے ہے، اس لیے "وردِ جوشن"، "اورادِ قدسیہ"، ماثورات اور شیخ شاذلی، شیخ عبد القادر جیلانی، شیخ احمد رفاعی اور شیخ احمد بدوی کے اوراد میں سے جو شخص جو چاہے پڑھے۔ ان عظیم ہستیوں کے اوراد پڑھتے ہوئے انسان انہیں اپنے پاس محسوس کرتا ہے اور اسے اپنے دل پر طاری ذوق و شوق کے جذبات کی لذت سے سیری نہیں ہوتی۔ کتنی ہی بار میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش سارے لوگ ان اوراد کو پڑھ کر ان سے استفادہ کرتے، تاکہ ان کے دلوں کی تجدید ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق مضبوط ہو تا۔

اس بارے میں ایک اور سوال بھی پیدا ہو تا ہے، وہ یہ کہ اگر تفکر کی دعوت دینے والی آیات خاموشی سے پڑھی جائیں تو کیا وہ تفکر کے قائم مقام ہو سکتی ہیں؟

اگر انسان بغیر سمجھے کچھ پڑھتا اور دہراتا رہے تو وہ اس کے ساتھ یکسانیت پیدا کر سکتا ہے اور نہ ہی اس میں گہرائی سے غور و فکر کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اگرچہ اسے ثواب ملے گا، لیکن تفکر کے تقاضے پورے نہ ہوں گے۔ تفکر فکر سے ماخوذ ہے، یعنی اس میں واقعات کو آپس میں ملا کر ان میں خاص ربط پیدا کیا جاتا ہے، اگرچہ سبب اور مسبب یا علت و معلول کے درمیان تعلق قائم کرنا اور بندے اور خالق کے تعلق کو مضبوط کرنا تفکر کی ایک قسم ہے، لیکن جو اوراد اس مقدس تعلق کے حصول کا ذریعہ نہ بنیں وہ کتنی ہی عظیم ہستیوں سے منسوب کیوں نہ ہوں، تفکر نہیں کہلا سکتے، گو ثواب ان پر بھی ملے گا۔ ان میں تفکر کا پہلو اسی قدر پایا جائے گا، جس قدر وہ روح اور دل میں تر و تازگی پیدا کرنے اور اللہ تعالیٰ سے ہمارے تعلق کو گہرا اور مضبوط بنانے میں کردار ادا کریں گے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے توفیق کے طلب گار ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کے دور میں تفکر جنس نایاب بن چکی ہے، بلکہ اگر ہم یہ کہیں کہ آج کا انسان اس معاملے میں شدید کوتاہی کا مرتکب ہو رہا ہے تو شاید مبالغہ نہ ہو گا۔

ایک حدیث نبوی میں ہے: "جو شخص میری امت کے فساد کے وقت میری سنت پر عمل کرے گا اسے سو شہیدوں کا ثواب ملے گا۔" (34) سنت نبویہ سیکھنے کا کیا طریق کار ہے اور دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق سنت پر عملدرآمد کی کیا صورت ممکن ہے؟

بہت سی کتابوں میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سنت حق تک رسائی کا واحد ذریعہ ہے۔ سنت نے اس راستے کی وضاحت کر کے انسانیت کو اس پر چلنے کی دعوت دی ہے۔ اگر سارے اولیائے کرام اور عظیم دماغ مل کر بھی کوئی راستہ یا اصولی مباحث وضع کریں تو ایسا طریق کار اور دساتیر سنت نبویہ کے ایک معمولی سے مسئلے کے مقابلے میں بجلی کی ایک کوند کی حیثیت بھی نہیں رکھتے، یہی وجہ ہے کہ آج تک ہزاروں شیوخ اور حق کے ترجمان بار بار واشگاف الفاظ میں بتاتے رہے ہیں کہ سنت کا راستہ عین دین کا راستہ ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی زیر نگرانی اس کی ہدایات کے مطابق ہمیں زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا اور فرائض وواجبات اور سنتوں سے لے کر مستحبات ومباحات اور ان کے آداب کی وضاحت فرمائی۔ فرائض کے ذریعے انسان کو اللہ تعالیٰ کا قرب نصیب ہوتا ہے اور نوافل کے ذریعے تو اس قدر قربِ خداوندی حاصل ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی آنکھ، کان اور ہاتھ بن جاتے ہیں کہ جن سے وہ دیکھتا، سنتا اور چیزوں کو پکڑتا ہے۔ ایک حدیث قدسی میں آیا ہے: "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، جو میرے کسی ولی کو ایذا دیتا ہے، وہ میرے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ میرے بندے کو فرائض کی ادائیگی سے میرا جو قرب حاصل ہوتا ہے وہ اسے کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں اور جب میں اسے محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کی آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں، دل اور زبان بن جاتا ہوں کہ جن سے وہ دیکھتا، سنتا، پکڑتا، چلتا، سوچتا اور بولتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے دعا مانگتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے تو میں اسے وہ چیز عطا کرتا ہوں۔ اسے موت دینے میں مجھے جتنا تردد ہوتا ہے اتنا تردد مجھے کسی اور بات

میں نہیں ہوتا، کیونکہ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے، لیکن میں اس کی طبیعت پر ناگوار گزرنے والا کام کرنے والا ہوں۔"(35)

اس حدیث قدسی سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اشیاء کی اصل صورت اور حقیقت دکھاتے اور اسے معاملات کا درست تجزیہ کرنے کی توفیق دیتے ہیں، چنانچہ جب وہ ہدایت دیکھتا ہے تو اس کی طرف لپکتا ہے اور گمراہی دیکھتا ہے تو اس سے دور بھاگتا ہے۔ جب وہ حق بات سنتا ہے تو اسے قبول کرتا ہے اور اس سے اسے روحانی ترقی نصیب ہوتی ہے۔ جب وہ بات کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے حق بات کہنے کی توفیق عطا فرماتے ہیں اور جب کوئی کام کرنے لگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے مفید اور بھلائی کے کام کرواتے ہیں، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ ہمیشہ جنت کی طرف لے جانے والے راستوں کی طرف اس کی راہنمائی فرماتے ہیں اور اسے کبھی بھی اس کے نفس کے حوالے نہیں کرتے۔ چونکہ وہ اپنے ہر عمل کے ذریعے رضائے الٰہی کا طالب ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ بھی اسے ہمیشہ اپنی رضا کے دائرے میں محو گردش رکھتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ اور ان کے بعد آنے والی تمام اہم ہستیوں کی خصوصی نگرانی فرمائی، ان کے سامنے اپنی خوشنودی کے راستے سے ہٹانے والے تمام راستے مسدود فرمائے اور صرف سنت کے راستے کو ان کے سامنے کھلا رکھا۔

آج راہِ سنت کے سوا کوئی راستہ بھی یقینی طور پر منزل تک پہنچانے کی ضمانت فراہم نہیں کر سکتا، لہذا یہ بالکل فطری بات ہے کہ فساد کے دور میں سنت یعنی فرائض و واجبات اور سنن کی وضاحت کرنے والے راستے کا احیاء کرنے اور انسان کو از سرِ نو اس راستے پر گامزن کر کے اسے ے محفوظ و مامون بنانے والے عمل کو ایسی مبارک خدمات اور کاوشوں کا درجہ دیا جائے کہ جن کے کرنے والے شہداء کا مقام پاتے ہیں، بلکہ ان میں سے بعض کو روزانہ کئی کئی شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر جو لوگ ارکانِ ایمان کا احیاء کرنے کی کوشش کر ں سے بھی زیاد . اب دیا جاتا ہے۔

سنت نبویہ کے بعض مسائل ایسے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی احیاء کرنے پر سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے غیبت کی بعض اقسام بدکاری اور قتل سے بھی زیادہ شدید ہوتی ہیں، کیونکہ جو غیبت معاشرے میں برائی کے بیج بو کر انتشار اور بدامنی کا باعث بنتی ہے وہ عام غیبت سے زیادہ سخت ہوتی ہے اور اس کا گناہ انفرادی گناہ سے زیادہ ہوتا ہے، لہذا جن مسائل میں امت فساد کی راہ پر چل پڑی ہو اور اس کے نتیجے میں اسلامی نظام کے سارے کل پرزے بے کار ہو گئے ہوں ان میں سے کسی بھی دینی مسئلے کا فساد کے غلبے کے اِس دور میں احیاء کرنے پر صرف سو کا نہیں بلکہ ہزار شہیدوں کا ثواب بھی مل سکتا ہے۔

نیز مبارک ایام اور لمحات میں اس قسم کے اعمال سر انجام دے کر اس سے بھی زیادہ ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں اپنے فضل و احسان سے زیادہ نوازتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اس راستے پر مسلسل چلتے رہنے کو ہمارا مقدر بنا دے اور ہمیں اخلاص کے ساتھ خدمت دین کی توفیق عطا فرمائے۔

ہم یقیناً بہت خوش نصیب ہیں۔ جب لوگ ہماری خدمات کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں: "ہمارے کندھوں پر ڈالی گئی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے۔" افراتفری کے اِس دور میں ہمیں بہت ہی مقدس اور گرانقدر ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اتنے بہت سے اداروں، گروہوں اور جماعتوں کے ذریعے اس دین کے احیاء کی دنیا میں کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ ایک دوسرے پہلو سے دیکھیں تو یہ دراصل رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری کا تسلسل اور آپ ﷺ کی دعوت کی پیروی ہے، نیز فخر کائنات حضرت محمد ﷺ کا تواضع اختیار کرتے ہوئے اپنے بعض معاصر شاگردوں کو خواب میں جلوہ نمائی کرانا اور دینی اور قرآنی خدمات سر انجام دینے والے بعض اداروں کو دیکھنے کے لیے تشریف لانا محض سنت نبویہ اور اس کی خدمت کی برکت ہے۔ اسے کسی فرد کی ذاتی خصوصیت پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔

بعض افراد، جماعتوں اور اداروں کا "کسی کام کا سبب بننے والا اسے کرنے والے کی طرح ہوتا ہے۔" کے ضابطے کے تحت اِس ثواب کے وافر حصے کا مستحق ٹھہرنا بھی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے

فضل کا ایک دوسرا رخ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت سے یہی امید رکھنی چاہیے، لیکن اگر دینی اور قرآنی خدمات کو اس قدر اونچے معیار تک لے جانے والوں نے اخلاص اور جذبے کے اِس معیار کو برقرار نہ رکھا تو یہ امانت ان سے لے کر کسی اور کو دے دی جائے گی اور انہیں ٹھکرا دیا جائے گا۔ چونکہ ہمیں لطف خداوندی کا احساس ہے اور ہم اس کی قدر کرتے ہیں، اس لیے ہمیں امید ہے کہ اگر ہم نے خدمت دین کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے لطف خداوندی سے بھرپور استفادہ کیا تو ہم اس امتحان میں سرخرو ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی مزید مہربانیوں اور عنایتوں کے مستحق ٹھہریں گے۔

عثمانیوں کے بارے میں آپ کی کیارائے ہے؟ترکوں نے اسلام کیوں قبول کیا؟

گزشتہ چند سالوں سے عثمانیوں پر عجیب وغریب اور ناقابل تصور الزامات لگائے اور افتراءات باندھے جارہے ہیں۔ دولت عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام علامہ مصطفی صبری آفندی اپنی کتاب "موقف العقل" میں اس اہم موضوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "انسانی تاریخ میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری، جسے اپنے آباءواجداد سے ہماری قوم کی بہ نسبت زیادہ عداوت ہو۔"

ہر قوم کے لوگ خواہ وہ سائنس دان ہوں، ماہرین عمرانیات ہوں، اولیائے کرام ہوں یا ادباء ہوں اپنے اسلاف کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں، مثلاً بطلیموس نے جغرافیہ اور کوسموگرافی (36)(Cosmography) کے موضوع پر کتابیں لکھیں، اس کے بعد کوپرنیکس نے بطلیموس کی بعض تحریروں کا غلط ہونا ثابت کیا، لیکن اس کے باوجود اس نے ادب کا خاص خیال رکھا۔ وہ لکھتا ہے": اے بطلیموس! تمہاری روح خوش وخرم رہے! اگرچہ تمہاری تحریروں میں بعض باتیں غلط بھی ہیں، لیکن تمہارے سامنے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا، کیونکہ تمہارے دور تک علوم و فنون نے اسی قدر ترقی کی تھی اور تمہارے لیے اس حد سے آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔"

کوپرنیکس کے بعد گلیلیو اور پھر آئن اسٹائن آیا۔ آئن اسٹائن نے کوپرنیکس اور گلیلیو کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کرنے کے باوجود ان کی تعریف وتوصیف کی اور انہیں علم فلکیات کے بانیوں میں شمار کیا۔

صفر کا ہندسہ ہندوستان سے اناطولیہ منتقل ہوا اور یہاں سے مسلمانوں کے ذریعے یورپ پہنچا، جہاں اس وقت تک رومن اعداد مروج تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے ہاں مروجہ اعداد کے ذریعے علم ہندسہ اور علم ریاضی کے مباحث کو حل کرنا ممکن نہ تھا۔ جونہی صفر کا عدد یورپ پہنچا وہاں رائج اعداد میں جان پڑ گئی۔ اگرچہ اکثر اہل یورپ مسلمان سائنسدانوں کے کارناموں کے اعتراف میں قدرے بخل سے کام لیتے ہیں، تاہم انہوں نے صفر اور ریاضیات کے ضمن میں نئے متعارف ہونے والے اصول ومبادی کی قدر ومنزلت کا اندازہ لگا کر ان سے خوب استفادہ

کیا۔ اگر صفر نہ ہوتا تو یورپ کوئی سائنسی عقدہ حل کر سکتا اور نہ ہی خلا کی تسخیر کے لیے نکلتا۔ اگرچہ انہیں دی جانے والی چیز "صفر" تھی، لیکن اس کے نتائج بہت اہمیت کے حامل تھے۔ امت مسلم میں بھی اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً امام غزالی اس دنیا میں آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ۱۰۵۸ ہجری میں آئے، لیکن وہ اپنے دور کی ثقافت اور علوم پر سبقت لے گئے اور فلکیات، طب اور ہندسہ کے علوم میں بہت سے اہم اضافے کیے حتیٰ کہ گِب ان کے بارے میں لکھتا ہے: "انسانی تاریخ میں مجھے ان جیسا کوئی ایسا شخص نہیں ملا، جس نے اپنے دور کے علوم کو سمیٹ کر انہیں آئندہ آنے والی نسلوں تک پہنچایا ہو۔" گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ غزالی جیسی کسی اور شخصیت سے ناواقف ہے۔

اگر ہم امام فخر الدین رازی کی کتابوں کو جمع کر کے ایک دوسرے پر رکھنا شروع کریں تو وہ ہماری قامت کی اونچائی سے بلند تر ہو جائیں گی۔ ان کی صرف تفسیری تحریریں چھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں۔ لوگوں نے ان کے ہاتھ سے لکھے گئے صفحات کو شمار کیا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں بشمول ایام طفولت کے روزانہ پندرہ سے بیس صفحات لکھے ہیں۔ شاید آپ کو یہ معمولی سی بات لگے، لیکن اگر آپ ایک صفحہ لکھنے بیٹھیں گے تو آپ کو پتا چلے گا کہ ایک صفحہ لکھنے میں آپ کے تیس سے چالیس منٹ صرف ہوئے ہیں، خصوصاً اگر موضوع سنجیدہ اور علمی ہو اور بحث و تحقیق کا متقاضی ہو تو اس میں اور بھی زیادہ وقت لگے گا۔

یہ لوگ اپنے زمانے کے علوم و ثقافت سے سینکڑوں سال آگے نکل گئے تھے اور ان کی نظریں نہ صرف آفاق پر مرکوز تھیں، بلکہ وہ آفاق سے بھی پرے جھانکتے تھے، لیکن ان کے بعد آنے والے کا اہل ان کی چھوڑی ہوئی عظیم میراث پر ہی جیتے رہے اور کسی نئی چیز کا اضافہ نہ کر سکے۔

مثلاً بنو موسیٰ نے بغداد میں اپنے وقت کی سب سے بڑی رصد گاہ بنائی۔ جب ان کے معاصر اہل مغرب یہ سمجھتے تھے کہ شیاطین چاند اور ستاروں سے خبریں لاتے ہیں وہ علم فلکیات میں نئی نئی دریافتیں کر رہے تھے۔ جب مسلمان اندلس گئے تو انہوں نے وہاں سائنس کے میدان میں بہت سے اضافے کیے، لیکن بعد کے ادوار میں یورپ نے ہمارے خلاف صلیبی جنگوں کا آغاز کر کے ہمیں

ایسا مصروف کیا کہ ہمیں غور و فکر اور ترقی کرنے کی فرصت ہی نہ مل سکی اور مغرب سے مرعوب لوگ سمجھنے لگے کہ ہر (نئی) چیز مغرب نے ہمیں دی ہے، جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنی بنیادوں، تہذیب، ماضی اور کتاب سے رشتہ توڑ کر اس سے دوری اختیار کر لی۔

ہر تہذیب اپنے سے پہلی تہذیب کی مرہونِ منت ہوتی ہے، کیونکہ وہ اس سے استفادہ کرتی ہے، نیز وہ اپنے بعد آنے والی تہذیب کو بہت کچھ دے کر جاتی ہے۔ تہذیبوں کا پے در پے آنا کسی عمارت کے تعمیری مراحل کے مشابہ ہے۔ پہلے آپ آتے ہیں اور اس میں ایک اینٹ لگاتے ہیں آپ کے بعد کوئی اور آئے گا اور ایک اینٹ کا اضافہ کرے گا۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور عمارت بلند ہوتی رہے گی۔ سائنس اور فلسفے نے کوپرنیکس سے لے کر گلیلیو، نیوٹن اور آئن اسٹائن تک اسی انداز سے ترقی کی ہے۔

اس طویل تمہید کے بعد اب میں عثمانیوں سے عداوت کے موضوع پر گفتگو کرنا چاہوں گا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ عثمانیوں نے مسجدوں کے میناروں کی بجائے کارخانوں کی چمنیاں کیوں نہیں بنائیں؟

اس احمقانہ سوال پر ہنسی روکے نہیں رکتی، کیونکہ کارخانوں کی چمنیاں تو اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ اس دور میں جامع مسجدوں اور میناروں کی تعمیر ہی سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے انہوں نے یہی چیزیں تعمیر کیں۔ نیز اپنے پرائے سب اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ اگر انکشاری(37) اُس قوت کو جو امت نے انہیں دی تھی، اسی امت کے خلاف استعمال نہ کرتے تو ہم کبھی بھی مغرب سے پیچھے نہ رہتے، بلکہ آج بھی ہم ایسی ہی صورتحال سے دوچار ہیں۔(38) عثمانی اپنے دور کے عظیم لوگ تھے۔ انہوں نے بین الاقوامی توازن کی حفاظت کی اور عالمی امن قائم کیا۔ اگر کوئی اس حقیقت کا انکار کرنا چاہے تو بھلے کرے، لیکن مغرب کے منصف مزاج لوگ اب اِس حقیقت کا اعتراف کرنے لگے ہیں۔

عثمانیوں سے عداوت اہل مغرب کے ہماری اور ہمارے ہاں مغرب کی اندھی تقلید کرنے والوں کی غفلت سے فائدہ اٹھانے کا نتیجہ ہے، مثلاً ایک دور میں فرانسیسیوں نے سلطان عبد الحمید

ثانی کو" Le sultan ruj "(خونی بادشاہ) کا لقب دیا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی ہمارے صحافیوں نے بھی اس لقب کو اپنے اخبارات میں جلی حروف کے ساتھ شائع کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے آباءواجداد کے بارے میں تمام ناپسندیدہ القاب مغرب سے درآمد کردہ ہیں، یہی وجہ ہے ہمارے عظیم ہیروں کے لئے استعمال ہونے والے کسی بھی برے لقب کا ہماری زبان سے تعلق نہیں، بلکہ سب کی کڑیاں یورپ سے جاملتی ہیں۔ کاش! امت مسلمہ اپنے اسلاف کی اتنی قدر تو کرتی جتنی قدر اہل یورپ اپنے اسلاف کی کرتے ہیں۔ یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ عثمانیوں نے اسلام کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا، کیونکہ عثمانیوں نے اپنے عروج وزوال کے ہر دور میں اسلام کے دامن کو تھامے رکھا۔

نہ صرف عثمانی بلکہ الپ ارسلان کے چچا طغرل بیگ بھی عباسی خلیفہ قائم باللہ کے دربار میں انتہائی ادب کے ساتھ حاضر ہوتے تھے، حالانکہ اس وقت خلیفہ بہت کمزور ہو چکے تھے اور ان کے لئے خلافت کی نمائندگی اور اس کا دفاع کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ طغرل بیگ کو ایسے خلیفہ کا اس قدر ادب و احترام کرنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن وہ انہیں نبی اکرم ﷺ کا خلیفہ سمجھ کر ان کا احترام کرتے اور ان سے کہتے کہ وہ ان کی پناہ میں آکر اسلام اور نبوت کے دفاع سے متعلق ہر حکم کے منتظر ہیں، بلکہ انہوں نے عملی طور پر اپنے تمام وسائل اور صلاحیتیں خلیفہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔

کہنے کو قائم باللہ خلیفہ تھے، لیکن خلافت کی حفاظت کی ذمہ داری طغرل بیگ سرانجام دے رہے تھے۔ اس دور میں ترکوں کے ایک ہزار خاندان دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے اور ان کی قیادت طغرل بیگ کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے یہ معلومات مشہور مؤرخ اسماعیل جامی دانشمند کے الفاظ کے تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ نقل کی ہیں۔ اسلام کے بارے میں ہماری قوم کے طرز عمل کے اظہار کے سلسلے میں ان معلومات کی بڑی اہمیت ہے۔ میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ طغرل بیگ کے اس طرز عمل کا اسلام کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ ایسے عمدہ طرز عمل کا تعلق استحصال کے ساتھ جوڑنا ترک قوم کی عظمت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

یہی جذبہ دولت عثمانیہ کی تاسیس میں کار فرما تھا۔ جب غازی ارطغرل نے سارے اناطولیہ کو اپنے زیر نگین کر کے "سوکت" کے قریب سکونت اختیار کی تو وہ اسلام کے علمبردار تھے۔ وہ خلیفہ کا انتہائی ادب و احترام کرتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ جب انہوں نے "سوکت" کے قریب "قای بویو" کو پائے تخت بنایا تو اس وقت اناطولیہ میں متعدد ریاستیں تھیں، جو ہمیشہ آپس میں برسرپیکار رہتیں، لیکن ارطغرل اور ان کے بعد غازی عثمان نے ان سے الجھنے کے بجائے اپنی سوچ اور جدوجہد کو ہمیشہ بازنطینیوں پر مرکوز رکھا۔

یہ حکمت عملی جہاں مسلمانوں کی توجہ کو اپنے اصل مقصد پر مرکوز رکھنے کی ضامن تھی، وہیں اس کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں سے ترکوں کا خوف اور ان کے بارے میں شکوک و شبہات بھی زائل ہوئے۔ غازی عثمان سب سے پہلے مسلمانوں کو یکجا کرنے کی کوشش کر سکتے تھے، لیکن وہ ہر اقدام اپنے والد اور اپنے خسر شیخ ادب عالی کی وصیت کی روشنی میں اپنی خداداد دانائی اور حکمت سے کرتے، اسی لیے وہ کہا کرتے تھے: "جب مسلمانوں کو یقین ہو جائے گا کہ اب ان کے پاس کفر کے سوا کوئی متبادل نہیں رہا تو وہ میرے ساتھ آملیں گے، جس کے نتیجے میں ہمیں کفار و فجار پر غلبہ حاصل ہو سکتا ہے۔"

یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنا اصل ہدف بازنطینیوں کو قرار دیا۔ انہوں نے کبھی مسلمانوں کو چھیڑا اور نہ ہی ان کے داخلی جھگڑوں میں مداخلت کی۔ وہ کہا کرتے تھے: "میرا ہدف بازنطینی ہیں اور ہم جلد یا بدیر قسطنطنیہ کو فتح کر لیں گے۔" اسلامی جذبے سے سرشار ایسے انسان کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کا اسلامی جذبہ جیوپولیٹیکل (39)(Geopolitical) ضرورت تھی ناواقفیت یا بدنیتی پر مبنی ہے۔ دولت عثمانیہ خدائی فضل کا ایک ایسا مظہر تھا جو کسی اور خاندان کے حصے میں نہ آیا۔ اس نے چھ صدیوں تک پورے اخلاص کے ساتھ قرآن کا علم اٹھائے رکھا۔ اس خاندان نے سب سے زیادہ عرصے تک حکمرانی کی، بلکہ اگر ڈیڑھ صدی قبل اندورنی غدار اس کی پیٹھ میں چھرا نہ گھونپتے تو شاید دنیا کے کئی اور ممالک بھی اس کے زیر نگیں آچکے ہوتے۔ عثمانیوں نے اپنے زوال کے بدترین ادوار میں بھی دین کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ فرانسیسی

ادیب والٹیر نے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ایک گستاخانہ ڈرامہ لکھا۔ حکومت فرانس اس دور میں اس ڈرامے کو اسٹیج پر دکھانا چاہتی تھی، جب ترکی کو "مردِ بیمار" کہا جاتا تھا، لیکن جب سلطان عبد الحمید جس پر "Le Sultan Ruj" (خونی بادشاہ) ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے کو اپنے سردار اور نورِ چشم کی شخصیت پر اس حملے کی اطلاع ملی تو اس زخمی شیر نے حکومت فرانس کو ٹیلی گرام بھیجوایا کہ اگر تم نے میرے اور تمام مسلمانوں کے رسول ﷺ کی شخصیت کو نشانہ بنانے والے ڈرامے کو اسٹیج پر دکھایا تو میں تمام عربوں اور مسلمانوں کو تمہارے خلاف کھڑا کر دوں گا۔

کاش! آج بھی عالم اسلام ایسے جذبے اور احساس سے سرشار ہوتا۔ اس ٹیلی گرام سے فرانس میں خوف کی لہر دوڑ گئی اور حکومت فرانس اس ڈرامے کو اسٹیج پر دکھانے کی ہمت نہ کر سکی، اس کے بعد برطانیہ نے بھی اس ڈرامے کو اسٹیج پر دکھانا چاہا تو اس زخمی شیر نے اسے بھی ایک دھمکی آمیز ٹیلی گرام بھیجوایا، جس کی وجہ سے حکومت برطانیہ بھی اپنے ارادے سے باز رہی۔ ہمارے اسلاف اس قدر عظیم لوگ تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی داڑھی مبارک پر مٹی کا ایک ذرہ بھی پڑنے پر کانپ اٹھنے والی دولت کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو دبانا ضروری ہے۔ صحابہ کرام کے عہد کے بعد دولت عثمانیہ اسلامی تاریخ کا سنہری ترین دور ہے۔ وہ چھ صدیوں تک رسول اللہ ﷺ اور قرآن کا علم اٹھائے کفار سے برسرپیکار رہی۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں۔

کیا مسلمانوں میں مختلف مکاتب فکر پائے جاتے ہیں؟ کیا صحابہ کرام میں بھی اس قسم کے اختلافات پائے جاتے تھے؟ مسلمانوں کی وحدت کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟

"المشرب" "الشرب" سے موخوذ عربی لفظ ہے۔ عام لوگوں میں متداول معنی کے لحاظ سے یہ ایک ہی حقیقت کے فرعی مسائل کے فہم میں لوگوں کے اختلاف سے عبارت ہے، لہذا اہم اسلام، ایمان اور قرآن کی دعوت دینے والے وسائل اور ذرائع کو اختلافِ مشارب سے تعبیر کر سکتے ہیں، کیونکہ ہدف ایک ہی ہوتا ہے، لیکن اس تک پہنچانے کے راستے مختلف ہوتے ہیں، لہذا مشرق و مغرب میں جو بھی شخص دین اور ایمان کی خدمت میں مصروف ہو، خواہ اس کا مشرب کچھ بھی ہو، دوسرے مسلمانوں پر اس کی اعانت واجب ہے۔ مسلمانوں کے مسالک و مشارب میں اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن اہم بات یہ ہے کہ سب کا مقصد اور منزل ایک ہی ہے۔

مختلف مسالک کے ظہور پذیر ہونے کے متعدد اسباب ہیں۔ ماحول اور تعلیم و تربیت کے انسان پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، نیز اسمائے حسنی کی تجلی کی کیفیت کے اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، لہذا مختلف مشارب کا ظہور پذیر ہونا بالکل فطری بات ہے۔ یہ پہلے بھی ظہور پذیر ہوئے ہیں اور آئندہ بھی وجود میں آتے رہیں گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا مشرب ایک تھا اور نہ ہی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا مشرب ایک جیسا تھا، بلکہ ان کے درمیان زمین و آسمان کا فرق تھا، حالانکہ وہ سب ایک ہی نبوی مدرسہ کے فضلاء تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اعلیٰ درجے کے منتظم اور حکمران تھے، جبکہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ انفرادیت پسند انسان تھے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس نبوی دور میں دین کی وحدت اور گروہوں کی شیرازہ بندی ہوئی، اس میں بھی ذوق اور مشرب کا اختلاف ختم ہوا اور نہ ہی اسے ختم کرنے کی کوشش کی گئی، بلکہ مختلف مشارب کو متحد کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے، کیونکہ جن لوگوں کی طبائع میں

اختلاف ہو وہ ایک طریقے سے نہیں سوچ سکتے، بلکہ وحدت پیدا کرنے کے لیے طاقت کے استعمال کے نتیجے میں بہت سی مشکلات، مصائب اور پیچیدگیاں پیدا ہونے کا قوی امکان ہوتا ہے۔ مختلف ممالک کے درمیان اتحاد کے علمبردار انسانی فطرت کے اس باریک پہلو کو سمجھ سکے اور نہ ہی انسانی طبیعت کا ادراک کر سکے، بلکہ انہوں نے انسانی صلاحیتوں کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مختلف صلاحیتیں کام شروع کریں اور خدائی حکمتوں کے تقاضوں کے مطابق ظہور پذیر ہوں تو مختلف مسالک و مشارب کا وجود میں آنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ ان صلاحیتوں کا فقہ کے میدان میں حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، اوزاعی، ثوری اور زہری فقہ وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہونا امر لابدی تھا، اسی طرح عہدِ نبوی سے لے کر آج تک انسانی قلب، شعور اور وجدان کو مخاطب کر کے دینی اور شرعی خدمات سرانجام دینے اور قلب و روح کی تربیت و تزکیہ کر کے انہیں اعلیٰ مقامات پر پہنچانے کو اپنا مقصد و منزل قرار دینے والے صوفیائے کرام کے سلاسل کا وجود میں آنا بھی ناگزیر تھا۔

سفیان ثوری اور ابراہیم بن ادہم ابتدائی صوفیاء میں سے تھے۔ ان کے بعد بایزید بسطامی آئے، پھر جنید بغدادی آئے اور پھر شیخ عبدالقادر جیلانی آئے، جنہوں نے تصوف کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ وہ بہت عظیم ہستی تھے۔ ان کے بعد شیخ شاہ نقشبندی آئے۔ ان میں سے ہر ایک شخصیت ایک منفرد ذوق اور مشرب کی نمائندہ تھی، لیکن اس کے باوجود وہ ایک ہی رنگ کی مختلف کرنیں تھیں اور ان سب نے رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی حقیقت کے احیاء کی کوشش کی۔

اگر آپ شیخ محی الدین ابن عربی کے مسلک کا امام احمد سرہندی المعروف امام ربانی کے مسلک سے موازنہ کریں گے تو آپ کو دونوں کے درمیان واضح فرق نظر آئے گا۔ عظیم ولی امام ربانی صحابہ کرام کے مسلک کے نمائندہ اور مشربِ فاروقی کے روحِ رواں سمجھے جاتے ہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انہوں نے شریعت محمدیہ کے ظاہر و باطن، ان کے درمیان موجود وحدت و تناسب اور ''حقیقت احمدیہ'' کو سب سے بہتر انداز میں سمجھا ہے۔ چار سو سال بیت جانے کے باوجود ہم آج بھی اپنے دلوں میں ان کی جلائی ہوئی شمع کی روشنی محسوس کرتے ہیں۔

اس عظیم انسان نے متعدد مقامات پر شیخ محی الدین ابن عربی کی گرفت کی اور فتوحاتِ مکیہ کے مقابلے میں فتوحاتِ مدنیہ پیش کی۔ انہوں نے سنت اور صحابہ کرام کے طریقے کو ترجیح دی۔ اہل السنت و الجماعت کا بھی یہی طریقہ ہے، اسی لیے وہ حقیقت احمدیہ کے نمائندہ سمجھے جاتے ہیں۔ در حقیقت اس معاملے کا تعلق بھی ذوق اور مشرب کے ساتھ ہے۔

یہ درست ہے کہ ابن عربی "وحدت الوجود" کے قائل تھے، لیکن ان کی مراد "اللہ کے سوا کسی موجود کا کوئی وجود نہیں" کی بجائے "اللہ کے سوا کوئی چیز حقیقی اور قائم بذاتہ نہیں" تھی، دوسرے لفظوں میں وہ ایک لطیف پیرائے میں وحدت الشہود کی طرف ہی اشارہ کر رہے تھے۔ میں نے ان طویل اور پُرپیچ راستوں پر چلنے کے بعد مختلف ذوقوں اور مشارب کے اتحاد کے ناممکن ہونے کی آپ کے سامنے وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔

میری رائے میں مسالک و مشارب کا اختلاف صبح قیامت تک رہے گا اور کوئی بھی اسے ختم نہیں کر سکتا، تاہم مسالک اور طریقِ کار کے اختلاف کے باوجود ہدف اور منزل ایک ہو سکتی ہے، دوسرے لفظوں میں تعبیر کے اختلاف کے باوجود اس میں مضمر حقیقت ایک ہو سکتی ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

عبارا تناشتی وحسنک واحد
وکل الی ذلک الجمال یشیر

"ہماری تعبیریں مختلف ہیں، لیکن آپ کا حسن ایک ہی ہے اور ان سب سے اسی حسن کی طرف اشارہ ہے۔"

الفاظ، تعبیریں اور سیاق و سباق مختلف ہے، لیکن ان میں بیان کردہ حسن و جمال ایک ہی ہے۔ اگر دلوں میں رضائے الٰہی اور شریعت احمدیہ کو بنیادی حیثیت حاصل ہو تو اختلافات کے باوجود ہر لمحہ اتفاق اور افہام و تفہیم کا امکان روشن رہتا ہے۔ ہمیں ایسے امور پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

یہ اتفاق و اتحاد اور یکجہتی جس طرح جذباتی سطح پر ممکن ہے، اسی طرح فکر و دانش کے پلیٹ فارم پر بھی ممکن ہے، جہاں تک جذبات کی سطح کا تعلق ہے تو اس مقصد کے حصول کے لیے

بعض اوقات مختلف اسلامی جماعتوں کو اکھٹا کر کے ان میں کسی نہ کسی صورت میں اتحاد قائم کرنا، گو وہ دکھاوے کے لئے ہی ہو، کافی ہوتا ہے، لیکن چونکہ انسان کی حالت ایک جیسی نہیں رہتی، بلکہ وہ فکری اور روحانی لحاظ سے مسلسل ارتقاپذیر رہتا ہے، اس لیے بعض اوقات کچے دھاگے کی مانند کمزور جذباتی وحدت کافی نہیں ہوتی، اس لیے جب بھی ایسے کمزور تعلق کا ناکافی ہونا واضح ہو تو تمام جماعتوں پر ضروری ہو گا کہ وہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر فکر و دانش کی سطح پر بھی وحدت سازی کی کوشش کریں۔ حق کو باطل کے چنگل سے آزاد کرانے، فساق و کفار کی مسلط کردہ ذلت سے چھٹکارہ پانے، امت محمدیہ کو اس کے شایاں مقام تک پہنچانے اور معجزانہ بیان کے حامل قرآن کے حقائق کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لیے فکر و دانش کی سطح پر اتفاق و اتحاد ناگزیر ہے۔

مزید وضاحت کے لیے ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔ بیس تیس سال پہلے الحادی اور اشتراکی رجحانات کے رد عمل میں ہمارے ہاں ایک جذباتی اتفاق و اتحاد وجود میں آیا۔ ایک طرف اللہ، اس کے رسول اور قرآن کریم کے منکرین تھے اور دوسری طرف اشتراکیت کے تمام مخالفین متحد تھے۔ یہ اتحاد آزاد ممالک کے اشتراکیت کے خلاف متحد ہونے کے مماثل تھا، چنانچہ اشتراکیت کے مقابلے میں ایمانی اساسات کے لیے جدوجہد کرنے والے مسلمان اور قوم پرستی کے علمبردار متحد ہو گئے۔

اسی طرح سیاسی سطح پر بھی مختلف افکار کے حامل اشتراکیت کے مخالفین اس کے خلاف ایک چھتری تلے جمع ہو گئے۔ اس دور میں اشتراکیت کے خلاف متحد لوگوں میں جہاں سبیل الرشاد، بویوک دوغو(40) اور حُرّ آدم(41) وغیرہ جیسے اسلامی رسائل پڑھنے والے ہوتے، وہیں "اورکون" اور "ملی یول" (42) جیسے قوم پرستی کے علمبردار رسائل کو پڑھنے والے بھی ملتے۔ بعض کے دل آلتائی(43) اور سجان کے پہاڑوں(44) میں اٹکے ہوئے تھے اور بعض کے دل غارِ حراء، غارِ ثور اور مکہ و مدینہ سے وابستہ تھے۔ بعض جذبے اور جوش و خروش سے بات کرتے اور بعض عقل و دانش کی زبان میں گفتگو کرتے۔ ایسے جذباتی ماحول میں بہت سے لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ کچھ بھی ہو جائے، ہمیں ملحدین و منکرین کے خلاف اپنے اتحاد کو برقرار رکھنا چاہیے۔

تاہم چونکہ اس وقت کا اتفاق صرف جذبات پر قائم تھا، اس لیے ایک وقت آیا جب اخوت کا یہ مفہوم ناکافی ثابت ہونے لگا، تب مسلمان فکری اور جذباتی سطح پر آگے بڑھے اور غور و فکر اور بحث و تحقیق کے ذریعے اکثر غیر اسلامی افکار سے آگاہ ہو گئے، جس کے نتیجے میں مشترکہ سوچ، عمل اور دفاع نے انہیں متحد کر دیا اور وہ کافی عرصہ تک ایک ہی پرچم تلے جمع رہے۔

جس طرح اللہ اور اس کے رسول کے منکرین اور ملحدین ایک چھتری تلے جمع ہو گئے تھے، اسی طرح یہ مسلمان بھی اپنے حلیفوں کے ساتھ جذباتی سطح پر ایک پرچم تلے جمع ہو گئے تھے، جس کے نتیجے میں انہیں سیاہ و سفید اور کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے اور دیکھنے سمجھنے کا کافی موقع ملا۔ ان کے دل و دماغ پر مدینہ منورہ اور رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے حقائق کے خیالات چھائے ہوئے تھے، لیکن دوسرے لوگوں کے خیالات و افکار بالکل مختلف تھے، جس کے نتیجے میں اس اتحاد کے حصے بخرے ہونے لگے، کیونکہ احساسات اور جذبات کا اختلاف کھل کر سامنے آچکا تھا۔

اس کے بعد سے یہ بات سامنے آئی کہ اتحاد کے لیے صرف جذباتی تعلقات کافی نہیں، لہذا ہر فریق نے نئی حکمت عملی اپنائی اور ان کے راستے جدا ہو گئے۔ اتحاد و اتفاق کو فکر و دانش کی بنیادوں کی ضرورت تھی۔ ہمیں ترکی اور دیگر اسلامی ممالک میں ایک نئی اسلامی بیداری نظر آرہی ہے۔ ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ مستقبل کے لیے جس قدر تیاری کر سکتا ہے کرے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ متعینہ بنیادوں پر تعلقات استوار کرنے کی ضرورت کو بھی پیش نظر رکھے۔

سب سے پہلے ضروری ہے کہ کوئی بھی دوسروں کو اپنے مشرب و مسلک میں داخل کرنے اور انہیں اپنے فکر کے مطابق سوچنے پر مجبور کرنے کی کوشش نہ کرے، کیونکہ راہِ حق میں پیش کی جانے والی ہر خدمت قابل تحسین ہے۔ جس طرح مختلف پیشوں اور فنون سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے کی مہارتوں سے استفادہ اور ایک دوسرے کی کاوشوں کے ثمرات کا باہمی تبادلہ کر کے مشترکہ ہدف کے حصول کے لیے ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں، اسی طرح مختلف مسالک و مشارب سے تعلق رکھنے والے افراد کو بھی اجتماعی سوچ اور رواداری کا مظاہرہ

کرتے ہوئے مشترکہ اہداف کے حصول کے لیے مخصوص طریق کار اختیار کرنے پر اصرار کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے، لہذا جو شخص بھی اس سلسلے میں خدمات سرانجام دیتا ہے وہ لائق تعریف ہے اور ہر اس شخص کا ساتھ دینا چاہیے، جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے، اس کی راہ میں سعی و کاوش کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی تعظیم بجالانے والے ہر شخص کو اپنا بھائی سمجھتا ہے۔

اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے لیے تر نوالہ بننے اور الحاد کی کھائی میں گرنے سے بچنے کے لیے ہمیں متحد ہونا ہوگا، گو یہ اتحاد صرف ظاہری ہی کیوں نہ ہو۔ انگریزوں نے اپنے مستقبل کو بچانے کے لیے "اینگلو سیکسن اور گول "(Goul) میں اتحاد قائم کیا، اگرچہ یہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتی ہیں، لیکن آج تک ان کا کوئی باہمی اختلاف دنیا کے سامنے نہیں آیا، کیونکہ انہوں نے مل بیٹھ کر گفت وشنید کے ذریعے اپنے اتفاقی اور اختلافی نقاط کا تعین کیا اور انگلینڈ کے مستقبل کی خاطر ان میں سے ہر ایک نے اپنے بعض مفادات کی قربانی دی۔

اس وقت دعوتی نقطۂ نظر سے ہمارے پیش نظر صرف یہ بات ہے کہ مسلک و مشرب کے اختلاف کے باوجود ہم سب ایک رب پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارا رسول، ہماری کتاب، ہمارا قبلہ اور ہمارا راستہ ایک ہے، لہذا ہم محض جذباتی بنیادوں کی بجائے ان درست اور دانش مندانہ بنیادوں پر اپنی وحدت کو استوار کرسکتے ہیں۔ یہ مضبوط اور مشترکہ بنیادیں ہماری وحدت کی ضامن و متقاضی ہیں اور اس سے متصادم کوئی بھی خیال نفسِ امارہ کا وسوسہ ہے۔

ہم نے ایک نفیس خزینے کو ایک مخصوص مقام تک پہنچانے کا عزم کر رکھا ہے۔ اگر ہم نے ایک دوسرے سے الجھنا ہی ہے تو ہمیں یہ ناپسندیدہ کام اس خزینے اور امانت کو ان کے حقداروں تک پہنچانے کے بعد ہی کرنا چاہیے۔ ہمیں سب سے پہلے اس محترم امت کے حاضر و مستقبل کی فکر کرنی چاہیے اور ملحد وفاسق لوگوں کو اسے لوٹنے کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہیے۔

اس سلسلے کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی دوسروں کو اپنا طریق کار اپنانے پر مجبور نہ کرے، بلکہ ہم ہر کسی کو اس کے پسندیدہ اور اس کی نظر میں زیادہ مناسب طریق کار کو اپنانے

دیں، کیونکہ عام طور پر لوگوں کے لیے اپنے افکار میں تبدیلی لانا مشکل ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات تو ایسا کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ طاقت کا استعمال درست نہیں، بلکہ یہ مشکلات اور نہ ختم ہونے والے اختلافات کے پیدا ہونے کا باعث بنتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ہمیں رواداری، نرمی اور اچھے انداز سے افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ جو لوگ حکمت اور موعظہ حسنہ کا طریق کار اختیار کرتے ہیں، وہ مستقبل میں پیش آنے والے بڑے بڑے مسائل کا حل نکال لیتے ہیں۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ چونکہ مختلف مسالک و مشارب متحد نہیں ہو سکتے، اس لیے ایمانی اور قرآنی خدمات پیش کرنے والا در حقیقت جلیل القدر خدمات سرانجام دیتا ہے، مثلاً بہت سے اچھے ادیب ہماری معاشرتی زندگی کے مسائل پر بڑی گہری نظر رکھتے اور ان کے حل پیش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو ان کی ضرورت ہے، لہٰذا ہمیں انہیں معاشرتی اور معاشی مسائل کے حل پیش کرنے دینے چاہئیں اور خود بھی ہم سے جو بن سکے کرنا چاہیے۔ جس طرح عباسی دور میں توفیق و تطبیق کی مہم چلی تھی، اسی طرح کی تحریک اس دور میں بھی چلانے کی ضرورت ہے، تاہم نئے حل پیش کرنے اور کسی چیز کو لینے یا چھوڑنے کے سلسلے میں اہل السنت والجماعت کے معیاروں کو پیش نظر رکھ کر ایک نئے دور کا آغاز کرنے یا کم از کم اس تک پہنچنے کے لیے بنیادیں رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

فرض کریں ایک گروہ ایسا ہے، جس پر اہل السنت والجماعت کے نقطہ نظر سے تنفید کی جاسکتی ہے، لیکن کسی خاص پہلو سے اس سے استفادہ بھی ممکن ہے تو اس سے استفادہ کرنا چاہیے، بلکہ اپنی عزتِ نفس کا خیال رکھتے ہوئے اور اہل مغرب کی اسلام دشمنی سے چوکنا رہتے ہوئے ان کے مثبت پہلوؤں سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ در حقیقت ہر باطل مذہب میں کچھ نہ کچھ حق موجود ہوتا ہے اور اسی پر اس کے وجود کا مدار ہوتا ہے، لہٰذا حق کے اس حصے سے نہ صرف استفادہ کرنا ممکن ہے، بلکہ ضروری ہے۔

میں اس کی وضاحت ایک مثال سے کرنا چاہوں گا۔ معتزلہ اور جبریہ اہل السنت والجماعت سے خارج دو متعارض مکاتب فکر ہیں۔ معتزلہ کی رائے کے مطابق بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے۔ جبریہ کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے خالق ہیں اور انسان کی حیثیت صرف ایک

مشین کی سی ہے۔ انسانی ارادے اور اللہ تعالیٰ کے خلقِ افعال کے بارے میں دونوں مکاتب فکر کا نقطہ نظر بالکل متضاد ہے۔ معتزلہ کے نزدیک انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ دورِ حاضر کے عقلی فلسفے (Rationalism) کے علمبردار بھی اسی انداز سے سوچتے ہیں۔ جبریہ کا نقطہ نظر اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے نزدیک انسان کو کسی قسم کی آزادی، ارادہ اور اختیار حاصل نہیں، بلکہ اس کی حالت ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے اس شخص کی مانند ہے، جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے:

اَلقاہ فی الیم مکتوفاً و قال لہ:

ایّاک ایّاک اَن تبتلّ بالماء

"اس نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے دریا میں ڈال دیا اور کہا: خبردار! پانی سے گیلے نہ ہونا"

اہل السنت والجماعت نے ان دونوں مکاتب فکر میں جزوی طور پر پائے جانے والے حق کے عناصر کو لے کر ان کے امتزاج سے ایک نئی چیز وجود میں لائی اور معتزلہ سے کہا: "انسان ارادے کا مالک ہے، کیونکہ یہ بات قرآنِ کریم کی متعدد آیات سے ثابت ہے۔ انسان اپنے ارادے سے نیک اعمال سرانجام دیتا ہے، جس کے نتیجے میں جنت کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾ (النجم:۳۹) "اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے، جس کے لئے وہ محنت کرتا ہے۔" لیکن یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مشیت خداوندی کو اس معاملے میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَمَا تَشَاؤُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (التکویر:۲۹) "اور تم لوگ کچھ بھی نہیں چاہ سکتے مگر وہی جو اللہ رب العالمین چاہے۔" نیز انسانی ارادے کا دائرہ بعض اوقات اس قدر تنگ ہوتا ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے، لیکن ایک شرط کی حیثیت سے ارادہ ہمیشہ موجود رہتا ہے اور اسی کی بنیاد پر گناہ و ثواب اور سزا و مکافات کا فیصلہ ہوتا ہے۔

حاصل یہ کہ اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام میں سے ہر ایک میں تھوڑا بہت حق موجود ہے۔ اشتراکیت اسی تھوڑے سے حق سے ناجائز طور پر فائدہ اٹھاتی ہے۔ وہ عوامی ملکیت اور فقراء

کے حقوق کی حفاظت کے دعوے سے غلط فائدہ اٹھا کر منافقت کا ثبوت دیتی ہے۔ دوسری طرف اسلام کے تمام ادارے اور اصول و مبادی حق اور انصاف کے آئینہ دار ہیں۔ اسلام اتفاق و اتحاد کے ضامن اصولوں کے مجموعے سے عبارت ہے۔

جب ہم مسالک کی بات کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ہر مسلک میں حق کا کوئی نہ کوئی پہلو پایا جاتا ہے۔ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف ذوق اور مشرب کے لوگ پیدا فرمائے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ انسانی فطرت کو تبدیل کرنے اور مختلف ندیوں کے پانی کو ایک ہی ندی میں جمع کرنے کی کوشش غلطی اور خام خیالی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے قرآن و ایمان کے انوارات کو پھیلانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنی توانائیوں کو دوسروں کے ساتھ جھگڑنے میں خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم کسی سے اتفاق نہ کر سکیں تو کم از کم ہمیں اختلاف کی آگ بھڑکانے سے تو گریز کرنا چاہیے۔ ہمیں نہ صرف مسلمانوں کے ساتھ جھگڑنے، ان پر تنقید کرنے اور ان کی عیب جوئی سے مکمل طور پر اجتناب کرنا چاہیے، بلکہ ہمیں ہر اچھا کام کرنے والے کی تحسین کرنے اور ہر کلمہ گو سے تعاون کرنے کی تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ اگر ہم یہ اقدامات اٹھانے میں کامیاب ہو جائیں تو ہم اذنِ خداوندی سے مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد اور تعاونِ باہمی کی فضا قائم کرنے کی امید رکھ سکتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اسلام عقل و دانش سے ہم آہنگ مذہب ہے، لیکن اس کی بنیاد تسلیم و اطاعت کی متقاضی نصوص پر ہے۔ کیا یہ دونوں باتیں بیک وقت درست ہو سکتی ہیں؟

یہ بات درست ہے کہ اسلام عقل و دانش سے ہم آہنگ بھی ہے اور وہ تسلیم و اطاعت کا تقاضا بھی کرتا ہے، لیکن عقل و دانش اور تسلیم و اطاعت میں تضاد نہیں، کیونکہ بعض باتیں عقل و دانش کے مطابق ہوتی ہیں اور تسلیم کا تقاضا بھی کرتی ہیں، نیز کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اگر کوئی بات تسلیم کا تقاضا کرے تو وہ لازماً غیر منطقی بھی ہو گی۔ عقل اس قسم کے دعوے کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ ذیل میں ہم عقل و دانش کی روشنی میں اس موضوع کی وضاحت کریں گے۔

اسلام نے کائنات پر بحث کرنے والی اپنی کتاب میں ایمان کے ضروری مسائل کو چھیڑا ہے اور منطقی اور عقلی انداز میں ان کی وضاحت کی ہے۔ اس انداز میں اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور ربوبیت کو ثابت کرنے کے بعد اس کے لازمی نتیجے نبوت پر بھی مؤثر دلائل کے ساتھ بحث کی ہے، کیونکہ اس الوہیت اور ربوبیت کی وضاحت اور دعوت و تبلیغ کے لیے انبیائے کرام کی بعثت ناگزیر ہے۔ اسلام نے مضبوط عقلی اور منطقی دلائل کے ذریعے اس بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کی ہے۔ موت کے بعد ابدی زندگی گزارنے کے لیے انسانوں کا دوبارہ اٹھایا جانا بھی ضروری ہے، ورنہ ان میں ودیعت دوام کی طبعی محبت بے معنی ہو جائے گی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ بے فائدہ کام کرنے سے منزہ ہیں، اس لیے انسان کی ایسی ابدی زندگی کی طرف راہنمائی ناگزیر ہے۔ جس ذات نے کائنات کو پہلی دفعہ وجود بخشا وہی ذات اسے دوبارہ پیدا کرے گی۔

قرآن کلام الٰہی ہے۔ جن و انس مل کر اس کی سورتوں کے مشابہ ایک سورت بھی پیش نہیں کر سکتے۔ جس طرح قرآنِ کریم کلام الٰہی ہے، اسی طرح تورات، زبور اور انجیل وغیرہ جیسے پہلے صحیفے بھی اپنی اُس اصلی اور پاک صورت میں، جس کی قرآنِ کریم نے تصدیق کی ہے، خدا کا کلام ہیں۔

جن موضوعات پر ہم پہلے سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں ہم انہیں یہاں نہیں چھیڑیں گے۔ یہاں ہم نے ان کا ذکر صرف تمہید کے طور پر کیا ہے۔ تمام عقائد کو عقلی اور منطقی دلائل

سے ثابت کرنے کے بعد ہم آخر کار ایک ایسے مقام پر پہنچتے ہیں، جہاں منطق کی بیساکھیوں کی مدد سے چلنا ممکن نہیں، کیونکہ انسان کے دل اور وجدان میں محسوس ہونے والے حقائق اس قدر قوی تر ہوتے ہیں کہ ان کے مقابلے میں تمام دلائل بودے نظر آتے ہیں، تاہم اس کا تعلق انسان کی شخصیت کے ساتھ ہے اور یہ بالکل طبعی بات ہے، چنانچہ امام ربانی جیسی عظیم شخصیات نے "سیر من اللہ" کی تکمیل کے بعد بھی لکھا ہے کہ انسان کو دلائل کی ضرورت رہتی ہے، تاہم اس کا تعلق عظیم ہستیوں سے ہے۔ ہمارے جیسے لوگوں پر یہ بات صادق نہیں آتی۔

اللہ تعالیٰ کے تمام افعال اور اقدامات حکمت و دانش پر مبنی ہوتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہیں۔ ان سے کسی بے فائدہ کام کا صدور ممکن نہیں۔ مشاہدہ ہے کہ طبیعیات، کیمیاء، فلکیات اور فلکیاتی طبیعیات کے میدان میں کام کرنے والے سائنسدان ان علوم کے قوانین کی روشنی میں ثابت شدہ اصول و مبادی تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ماہر سے ماہر شخص کی کارکردگی اللہ تعالیٰ کی کاریگری کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں عقلی اور منطقی حکمتیں ہوتی ہیں۔

انفس اور آفاق میں بکھری اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ایمان باللہ کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ ہم آغاز میں عقل و منطق کو اور انتہا میں اطاعت و تسلیم کو پاتے ہیں۔ جب ہم اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتے ہیں تو اس کی باتوں کی پیروی بھی ہم پر ضروری ہے، جس کے نتیجے میں خود بخود عبادات مثلاً صوم و صلاۃ، حج اور زکوٰۃ کے مسائل کی ضرورت پیش آتی ہے۔

ان عبادات کی ادائیگی اطاعت و تسلیم کا ایک مظہر ہے، لیکن ہم ان مسائل کی عقلی اور منطقی توجیہہ اور ان میں موجود حکمتیں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ نمازوں کے اوقات میں یقیناً بہت سی حکمتیں مضمر ہیں، اسی طرح نماز کی حرکات و سکنات بھی بے معنی نہیں ہیں، بلکہ ان کے خاص مقاصد ہیں۔ وضو کے دوران مخصوص اعضاء کو دھونے میں بھی فوائد اور حکمتیں ہیں۔ معاشرتی زندگی کی تشکیل میں باجماعت نماز کا اہم کردار ہے، اسی طرح مالدار اور غریب طبقے کے درمیان توازن قائم کرنے میں بہت سی حکمتوں کے حامل نظام زکوٰۃ کا اہم کردار ہے۔ روزے کے صحت سے متعلق فوائد

تو بے شمار ہیں۔ اسلام کے تعزیراتی قوانین میں بھی بہت سی حکمتیں کار فرما ہیں۔ ہم ان پر عقل، منطق کی روشنی میں غور و فکر کریں تو ہمیں اطاعت و تسلیم تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔

حج کی مثال ملاحظہ فرمایئے: ہم نے پہلے ارشاد خداوندی: ﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ (آل عمران: ۹۷) "اور لوگوں پر اللہ کا حق یعنی فرض ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے۔" کی وجہ سے حج کو ایک فریضے کی حیثیت سے قبول کیا، لہٰذا بیت اللہ تک سفر کی استطاعت رکھنے والے ہر مرد و زن پر حج فرض ہے۔ اس فریضے کی ابتدا اطاعت و تسلیم سے ہوتی ہے، اسی لیے ہم حج کے لیے جاتے ہوئے "لبیک اللھم لبیک" کہتے ہیں، اس کے بعد ہم حج کی وجہ سے عالم اسلام کو حاصل ہونے والے فوائد پر غور و فکر کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ہر لحاظ سے مسلمانوں کا ایک عالمی اجتماع ہے، جو مختصر ترین وقت میں مسلمانوں کو ایک جسم کی مانند بنانے کے لیے راہ ہموار کرتا ہے، نیز اگر معاشرتی انصاف کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو امیر و غریب اور علماء اور عوام کا ایک جیسی حالت میں ایک پلیٹ فارم پر ایک ہی مقصد یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہارِ بندگی کے لیے جمع ہونا ہمارے اس یقین کو تقویت پہنچاتا ہے کہ اسلام ایک عالمی مذہب ہے۔

لہٰذا ہم عقل و منطق سے آغاز کرکے اطاعت و تسلیم تک پہنچیں یا اطاعت و تسلیم سے آغاز کرکے عقل و منطق تک رسائی حاصل کریں، اس سے نتیجے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسلام ایک پہلو سے عقلی اور منطقی ہے اور ایک دوسرے پہلو سے اطاعت و تسلیم سے عبارت ہے۔ ایک خاص مسئلے میں عقل و منطق سے آغاز ہوتا ہے اور اطاعت و تسلیم تک پہنچنا مقصود ہوتا ہے اور کسی دوسرے مسئلے میں عقل و منطق تک رسائی کے لیے اطاعت و تسلیم سے آغاز کیا جاتا ہے۔ جس خدائی نظام کے تحت کائنات کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے موجود ہے، یہ اس کی لازمی خصوصیت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب انسان مظاہر فطرت کو نہ سمجھ سکا تو اس نے مذہب کا سہارا لیا۔ کیا تہذیبی ترقی کے نتیجے میں مذہب کی ضرورت ختم ہو سکتی ہے؟

مذہب سے عداوت رکھنے والے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ انسان نے احساسِ بے مائیگی کی وجہ سے یا اپنی احسان مندی کے اظہار کے لیے مذہبی تصورات کو خود تخلیق کیا ہے۔ ان کی باتوں کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"کائنات میں پیش آنے والے بہت سے واقعات کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں اور ہم طبیعیات اور کیمیاء کے قوانین کی روشنی میں ان کی کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکتے۔ انسان نے اس معمے کو حل کرنے کے لیے اسے خالق کی طرف منسوب کر دیا، اسی طرح انسان بعض مفید حیوانات کو بھی مقدس سمجھنے لگا اور بعد میں انہیں معبود کا درجہ دے دیا۔ دریائے گنگا اور گائے کا ہندوؤں کے ہاں اور دریائے نیل کا مصریوں کے ہاں مقدس سمجھا جانا ان کی نفع رسانی پر مبنی ہے۔

خوف کے بارے میں انسان کا طرز عمل بھی اس سے مختلف نہیں رہا۔ بعض اشیاء سے شدید خوف نے ان سے حفاظت کی غرض سے انسان کو ان کی تقدیس پر مجبور کیا۔ بعض مذاہب میں خیر اور شر کے لیے علیحدہ علیحدہ معبود ہیں، گویا محبت اور خوف کو ان معبودوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ جنت اور دوزخ کا تصور بھی یہیں سے نکلا ہے۔ مذہب دراصل غم دور کرنے اور تسلی اور دلاسے کا ذریعہ ہے۔ یہ مذہبی لوگوں کی ایجاد اور عوام کی افیون ہے، جس کا وہ نشہ کرتے ہیں... "کیا مذہب واقعی مشکل امور کی توجیہہ کرنے، غم دور کرنے، پناہ لینے اور تسلی دینے کے لیے ایجاد کیا گیا ہے؟

ہرگز نہیں، ان کا یہ دعویٰ سراسر غلط ہے۔ "دین" عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے بہت سے معانی ہیں، جن میں سے بعض معانی اطاعت، بدلہ اور راستہ ہیں۔ یہ مفاہیم دین کی تعریف میں شامل ہیں۔ وہ راستہ ہے، اس میں اطاعت خداوندی ہے، نیز اس میں اطاعت کرنے والے کو انعام اور نافرمانی کرنے والے کو سزا دی جائے گی۔

دین کی شرعی تعریف حسب ذیل ہے: "یہ ایک ایسا خدائی نظام ہے، جس کے تحت عقل والے اپنے محدود اختیار کو استعمال کر کے خیر بذاتہ کو حاصل کرتے ہیں۔" (45) دین اہل خرد کو

مخاطب کرتا ہے۔ انسان اپنے اختیار سے اطاعت بجا لاتا ہے۔ دین ارادے کو مفلوج نہیں کرتا، بلکہ اسے اس کا صحیح مقام عطا کرتا ہے۔ دین کا راستہ سراسر بھلائی کا راستہ ہے۔ یہ محض انسانوں کی بتائی ہوئی بھلائی نہیں، بلکہ حقیقی بھلائی ہے۔

دین سب سے پہلے عقائد کے بارے میں راہنمائی فراہم کرتا ہے، بعض اوقات انسان اپنی عقل کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ اس کائنات کو کسی نے پیدا کیا ہے، لیکن صحیح اور یقینی ایمان اُس صدائے نبوت کو سننے کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے، جو اللہ کی یاد دلانے والی اُس آواز کو سننے کے لیے مستعد اور تیار انسان کے وجدان سے ٹکراتی ہے، نیز جب کوئی نبی آتا ہے تو وہ اپنی نبوت کے دلائل سے لیس ہو کر آتا ہے، خصوصاً اگر اس نبی کو قیامت تک معجزانہ اوصاف کی حامل کتاب اور دیگر بہت سے معجزات دے کر بھیجا گیا ہو تو کیا کسی ادنی سے شک و شبے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ ایسی نبوت کی برکت سے انسان کو پتا چلتا ہے کہ آخرت، تقدیر اور دیگر ضروری ارکانِ ایمان پر کیسے ایمان لانا ہے۔

عبادت کی برکت سے ایمان مرجھاتا ہے اور نہ پراگندہ ہوتا ہے۔ اس پر بڑھاپا طاری ہوتا ہے اور نہ وہ بوسیدہ ہوتا ہے، بلکہ دلوں میں ہمیشہ تروتازہ رہتا ہے۔ عبادت کے بغیر ایمان اپنی نورانیت، رونق، ذوق و شوق اور عشق کھو بیٹھتا ہے، جس کے نتیجے میں انسان کے ہاتھ میں منوں مٹی تلے دبے آباءواجداد کی عظمت پر فخر کرنے کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ اپنے مشائخ عظام اور علمائے صالحین کے مناقب بیان کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے مناقب کا تذکرہ اچھی بات ہے، خصوصاً آج کل کے دور میں جب آباءواجداد کو برا بھلا کہنے کا رواج چل پڑا ہے۔ لیکن یہ کافی نہیں اور نہ ہی ایمان کی بقا اور دوام کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

جن پنج وقتہ نمازوں میں ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوتے ہیں وہ نہ صرف ہمارے ایمان کو تازہ کرتی ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے کئے گئے ہمارے عہد کی تجدید کر کے اسے تقویت بھی پہنچاتی ہیں، تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم نماز کے ہر رکن میں قرآنی آیات کی تلاوت کرتے اور

تسبیحات پڑھتے ہوئے ان کے معانی پر غور و فکر کریں، لیکن اگر اِلفت وعادت پڑ جانے کی وجہ سے نماز میں پژمردگی آگئی اور اس کی روح ختم ہوگئی تو فرض تو ادا ہو جائے گا، لیکن اس سے کسی قسم کی برکت حاصل نہ ہوگی۔

اسی لیے ہم ایک عظیم روحانی شخصیت کو دیکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب انہیں سجدے میں نماز کی حلاوت محسوس ہوئی تو پکار اٹھے: " کاش! مجھے اس جیسی ایک اور نماز نصیب ہو جاتی۔ صحابہ کرام کی ساری نمازیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔" انہیں نماز کے ہر رکن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نیا پیغام موصول ہوتا تھا۔ ان کی نمازوں میں اِلفت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ان کی دیگر عبادات بھی ایسی ہی روحانیت کی حامل ہوتی تھیں، لہٰذا حج کرنے، زکوٰۃ دینے، روزہ رکھنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ ان عبادات سے اپنے ایمان کو تقویت پہنچانے والی روحانی غذا حاصل کیا کریں۔

دین کا ایک پہلو معاملات سے متعلق بھی ہے۔ مومن کی معاشی سرگرمیاں رضائے الٰہی کے مطابق ہونی چاہئیں، جس کی صورت یہ ہے کہ اس کی تجارت کے اصول و مبادی کے لیے معیار قرآن و سنت ہوں۔ اس کے نتیجے میں اس کے ایمان کو تقویت ملے گی، کیونکہ ایسے اصولوں پر عمل درآمد صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب خواہشاتِ نفس پر قابو پا کر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور احکام کی اطاعت اختیار کی جائے۔

فرض کریں ایک مسلمان اپنا سامان فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس کے مال میں کوئی عیب ہے تو اسے اس کی وضاحت کرنی چاہیے۔ اسے پتا ہے کہ اگر اس نے عیب کا ذکر کیا تو اس کا منافع کم ہو جائے گا یا اسے نقصان اٹھانا پڑے گا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کی وجہ سے اس کا دل مطمئن ہوگا اور جب وہ نماز میں اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہوگا تو یہ سکونِ قلب نماز کی برکات کے حصول میں معاون ثابت ہوگا، جس کے نتیجے میں اس کے ایمان میں تروتازگی آئے گی۔ رضائے الٰہی حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا وسیلہ اختیار کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ان تین لوگوں کے قصے میں اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، جو ایک غار میں محبوس ہو گئے تھے اور انہوں نے وہاں سے نجات پانے کے لیے اپنے نیک اعمال کے وسیلے سے دعا مانگی تھی۔ ان میں سے ایک اپنے والدین کا فرمانبردار تھا۔ دوسرے نے انتہائی مشکل وقت میں پاکدامنی کا مظاہرہ کیا تھا اور تیسرا دوسروں کے حقوق کا خاص خیال رکھتا تھا۔ انہوں نے نجات پانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے ان نیک اعمال کے وسیلے سے گڑگڑا کر دعا مانگی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں نجات دلائی، غار کے دہانے پر گرنے والی چٹان لڑھک گئی اور وہ صحیح سالم باہر نکل آئے۔(46) یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ مسلمان حتی الامکان رسول اللہ ﷺ جیسے اخلاق اپنانے کی کوشش کرے اور ہر معاملے میں حتیٰ کہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، سونے اور عبادت کرنے میں بھی آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے، اس لیے اگر لوگ ہمیں ایک سکے کے بدلے ہزار سکے دیں تب بھی ہمارے لیے اس سے بچنا ضروری ہے، بلکہ تمام چھوٹے بڑے گناہوں کے مقابلے میں ہمیں یہی موقف اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ قیامت کے دن وہ ہمارے لیے بھڑکتی ہوئی آگ میں تبدیل ہو جائیں گے۔

حاصل یہ کہ دین تجزی اور تقسیم کو قبول نہ کرنے والے ایک مکمل نظام سے عبارت ہے، دوسرے لفظوں میں تجزی اور تقسیم کو قبول کرنے والی چیز دین نہیں کہلا سکتی۔ دین ایک قد آور درخت کی مانند ہے۔ عقائد اس کی جڑیں ہیں۔ عبادات وغیرہ اس کی شاخیں ہیں۔ معاملات اس کے پھول ہیں۔ تعزیرات اس کی پہرے دار ہیں اور اذکار و اوراد اسے آسمان اور زمین دونوں طرف سے غذا مہیا کرنے والے عناصر ہیں۔ دین ایک مکمل نظام کی حیثیت سے نبی اکرم ﷺ کے ذریعے سے پہنچایا گیا انسانیت کے لئے خدائی عطیہ ہے۔

یہ ممکن تھا کہ ہر انسان کا وجدان اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بغیر کسی واسطہ کے براہ راست دین کی روح حاصل کر لیتا، لیکن چونکہ تمام انسانوں کی روحیں مطلوبہ

پاکیزگی کی حامل نہیں ہوتیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے اپنے بندوں میں سے انبیائے کرام کا انتخاب فرمایا: ﴿اللّٰهُ يَصۡطَفِىۡ مِنَ الۡمَلٰۤـئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ ۢ بَصِيۡرٌ‌﴾ (الحج:۷۵) ''اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کرلیتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ بیشک اللہ دیکھنے والا اور سننے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فریضہ رسالت کی ادائیگی کے لیے ملائکہ اور انسانوں میں سے، جسے چاہتے ہیں منتخب فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ تک پیغام رسالت پہنچانے کے لیے اپنی تخلیق کے دن سے رکوع و سجود اور تسبیح میں مصروف بے شمار ملائکہ میں سے حضرت جبرائیل امین علیہ السلام کا انتخاب فرمایا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے تئیس سال تک رسول اللہ ﷺ کے پاس وحی لانے کی خدمات سرانجام دیں۔ رسول اللہ ﷺ ہمہ تن گوش ہوکر انتہائی احترام کے ساتھ وحی سنتے۔اس دوران آپ ﷺ اور جبرائیل امین علیہ السلام کے درمیان اس قدر گہرے دوستانہ مراسم قائم ہوگئے کہ جب جبرائیل علیہ السلام آخری مرتبہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ پر وفورِ جذبات سے گریہ طاری ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ فریضہ رسالت کی ادائیگی کے لیے ایسی ہستیوں کا انتخاب فرماتے تھے۔

دوسرے انبیائے کرام کا انتخاب بھی اسی انداز سے افضل ترین اور ادائے رسالت کے لیے موزوں ترین افراد میں سے ہوتا تھا۔ وہ سب کے سب کندن تھے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ منتخب ہستی تھے، اسی طرح آپ ﷺ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے والے صحابہ کرام بھی بہترین انتخاب تھے۔ دین ایسی ہی سنہری کڑیوں کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے۔

جس طرح رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ دین کی خاطر مختلف قسم کی تکلیفیں اٹھائیں، اسی طرح دوسرے انبیائے کرام نے بھی طرح طرح کی اذیتیں برداشت کیں اور ہر طرح کی مشکلات کا سامنا کیا۔ انہوں نے یہ سب کچھ کسی دنیوی غرض سے نہیں کیا، بلکہ اگر رسول اللہ ﷺ اپنی دعوت سے دستبردار ہوجاتے تو انتہائی مالدار بن جاتے، دنیا کی ہر نعمت و آسائش پالیتے، خوب صورت

ترین عورت سے شادی کر لیتے اور مکہ کے رؤساء میں شمار ہوتے، لیکن نبوت کے سامنے ان چیزوں کی کیا حیثیت تھی؟

رسول اللہ ﷺ کو آسمانوں کی سیر کرائی گئی اور اپنے پروردگار سے ملاقات کے لیے جاتے ہوئے ستاروں کو آپ کے راستے میں فرشِ راہ بنایا گیا، لیکن آپ ﷺ وہاں ایسا حسن وجمال دیکھنے کے بعد جسے آپ سے پہلے کسی نے دیکھا تھا اور نہ آپ کے بعد کوئی دیکھے گا، اپنی امت کو بام عروج پر لے جانے کے لیے واپس تشریف لے آئے۔ اس قدر حسن وجمال کا مشاہدہ کرنے اور اس قدر قرب کی لذت کا مزا چکھنے کے بعد ان مقامات کو کون چھوڑ سکتا ہے؟ لیکن آپ ﷺ اس دنیا کی طرف لوٹ آئے جہاں لوگ آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتے، آپ پر گندگی پھینکتے اور آپ پر سنگ باری کر کے آپ کو لہولہان کر دیتے۔ آپ اس شہر کی طرف لوٹ آئے جس میں آپ کا مذاق اڑایا جاتا اور آپ سے انتہائی اہانت آمیز سلوک کیا جاتا۔ اپنی دعوت اور فریضہ رسالت کی ادائیگی کی خاطر ان تمام مصائب کو برداشت کرنے سے آپ ﷺ کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہ تھا۔ جس انسان کے دل کو جنت کے حسین مناظر بھی اپنا اسیر نہ بنا سکے اور اس نے اپنی امت کے پاس واپس آنے کو ترجیح دی وہ مفاد پرست انسان ہو سکتا ہے اور نہ ہی مصلحت پسند۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بے نیاز ہیں۔ انہیں ہماری عبادت کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہم اس کی بندگی کریں۔ جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا خلیفہ بنانے کے لیے ساری مخلوق میں سے منتخب فرمایا، اسے متوازن زندگی گزارنے کی تعلیم دینے کے لیے قرآن کریم میں بیان کردہ طریقے کے مطابق زندگی گزارنے کا حکم دیا، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنا نظام خود نہ چلا سکنے کے باعث اور غلط راستوں پر بھٹکنے سے بچانے کے لیے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور دین کی صورت میں ایک نورانی طرزِ زندگی کی طرف ہماری راہنمائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے آپ کو خدائی تعلیمات اور معیاروں کے مطابق ڈھالنے اور اپنے من میں پوشیدہ تمام صلاحیتوں کو اعلیٰ مراتب کے حصول کے لیے بروئے کار لانے کا حکم دیا۔

بلاشبہ ہمیں دین کی ضرورت ہے۔اگر انسان کو اپنی حقیقی ضروریات کا علم اور اس بات کا احساس ہو جائے کہ اس کی تخلیق صرف ابدی سعادت کو پانے کے لیے ہوئی ہے اور اگر وہ اپنی تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں کو استعمال اور ان میں اضافہ کر سکے تو وہ درج ذیل الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے گا:"اے ہمارے پروردگار! ہمیں ایک ایسا نظام حیات دیجیے، جس کے مطابق ہم اپنی زندگیوں کو ڈھال کر ٹھوکریں کھانے اور غلط راستوں پر بھٹکنے سے بچ سکیں اور ہمیں ایسے پُرپیچ راستوں پر سرگرداں پھرنے سے بچائے، جن کی کوئی منزل نہیں۔"

بڑے بڑے فلسفیوں اور اہل خرد کو بھی اس راہ میں ٹھوکریں کھانی پڑیں اور وہ کبھی بھی حقیقت کو نہ پاسکے، جبکہ رسول اللہ ﷺ کے نقشِ پا کی پیروی کرنے والا انسان ایک قدم بھی بے مقصد نہیں اٹھاتا، بلکہ زندگی کا ہر لمحہ خود آگہی کے ساتھ دوسروں کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے گزارتا ہے، کیونکہ وہ رضائے الٰہی کی تلاش میں رہتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اسوۂ حسنہ ہونے کی حیثیت سے پیروی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی عمر کے سرمائے کے ہر لمحے سے اس بیج کی مانند فائدہ اٹھاتا ہے، جس سے سات خوشے پیدا ہوتے ہیں۔

دین انسانی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے انسانی عقل کی تخلیق ہرگز نہیں ہے۔ دین کے بنیادی خدوخال اس پر مبنی ہیں کہ وہ انسانی فطرت سے ہم آہنگ ایک ایسا نظام ہے، جس کا تصور انسانی فطرت میں آغاز سے ہی ودیعت ہے۔انسان فطری طور پر دینی تعلیمات کا محتاج ہے۔صرف دین کی برکت سے انسان درست عقیدے اور اچھے معاملات کا علم حاصل کر سکتا ہے، نیز دین کی برکت سے وہ جنت کا ایسا مستحق ٹھہرتا ہے کہ وہ اس کے سانچے میں ڈھل کر رفتہ رفتہ پختہ ہوتا رہتا ہے اور آخر کار اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قیامت کے دن اسے پہچان کر اس کی دستگیری فرماتے ہوئے لواء الحمد کے نیچے اپنی امت میں شامل فرمالیں گے۔

جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ میدانِ محشر میں اپنی امت کو کیسے پہچانیں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا:"قیامت کے دن میں اپنی امت کے افراد کو پہچان لوں گا۔" صحابہ

نے عرض کی: "یارسول اللہ ﷺ! اتنی زیادہ مخلوق میں آپ انہیں کیسے پہچانیں گے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "مجھے بتاؤ۔ اگر کسی شخص کے پیشانی اور پاؤں سے سفید گھوڑے کالے سیاہ گھوڑوں میں ہوں تو کیا وہ انہیں پہچان نہ لے گا؟ صحابہ کرام نے عرض کی: "کیوں نہیں پہچانے گا۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "میری امت کے لوگ بھی قیامت کے دن ایسی حالت میں آئیں گے کہ وضو کی برکت سے ان کی پیشانیاں اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے۔"(47) ہمیں پہچانے جانے کی ضرورت ہے اور ہم دین اور اس کے حیات افروز انفاسِ طیبہ کے حاجت مند ہیں۔

دین نے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق بنیادی تعلیمات فراہم کی ہیں۔ صرف تنگ نظر لوگ ہی دین کو ناقص چیز سمجھ سکتے ہیں۔ جو لوگ دین کو اپنی زندگیوں سے بے تعلق کر کے طاقِ نسیان میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں کبھی نہ کبھی اپنی اس تاریخی غلطی کی برائی اور اس پر ندامت کا احساس ہو گا۔ اس غلطی کا ارتکاب اور اعتراف مشرق و مغرب کے کئی ممالک میں کیا جارہا ہے، تاہم دین زندگی کی روح ہے، جس سے مفر نہیں۔

دین کے کچھ اصول و فروع ہیں۔ جہاں تک اصولوں کا تعلق ہے تو ان میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہو سکتا۔ اصولوں کے لحاظ سے ہمارے اور حضرت آدم علیہ السلام کے دین میں کوئی فرق نہیں، کیونکہ آسمانی مذاہب کے اصولی عقائد ایک جیسے ہیں۔ نص نہ ہونے کی وجہ سے اگرچہ میں قطعی حکم لگانے سے گریز کرتا ہوں، لیکن کہا جاسکتا ہے کہ ملائکہ کے دین کے اصول بھی وہی ہیں جو ہمارے ہیں، یعنی جن باتوں مثلاً اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں، تقدیر اور موت کے بعد اٹھائے جانے پر ہم ایمان رکھتے ہیں ان پر وہ بھی ایمان رکھتے ہیں۔ فرق صرف ایمان کے مرتبے اور مقام کا ہے۔

یہی بات عبادات کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ کوئی بھی ایسا آسمانی مذہب نہیں، جس نے اپنے ماننے والوں پر عبادت کو لازم نہ ٹھہرایا ہو۔ مختلف قوموں اور زمانوں میں عبادت کا طریق کار مختلف ہو سکتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کے لیے اس کی فطرت، حالات

اور زمانے کے مطابق عبادت کا طریق کار مقرر فرمایا ہے، لیکن ایک بنیادی تعلیم کی حیثیت سے عبادت کی روح اور حقیقت میں کبھی بھی کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

مثال کے طور پر آخرت کے عقیدے کو لے لیجئے۔ اس کا تصور ہر آسمانی مذہب میں پایا جاتا ہے۔ یہ ان بنیادی تعلیمات میں سے ہے، جن کے بارے میں ہر نبی نے اپنی امت کو اجمالی یا تفصیلی طور پر ضرور آگاہ کیا ہے۔ اگر بھلائی کی ترغیب اور برائی سے روکنے والا یہ عقیدہ نہ ہوتا تو دین اور انسان کے بنائے ہوئے معاشی اور معاشرتی نظاموں کے درمیان کوئی امتیاز باقی نہ رہتا۔ دین کے بہت سے احکام اور تعلیمات کی بنیاد ہی موت کے بعد اٹھائے جانے پر ایمان پر ہے۔

اگر آخرت پر ایمان نہ ہوتا تو عبادات، دین کی خاطر مصیبتیں جھیلنے اور قربانیاں دینے اور کسی بھی عقیدے یا ایمان کا کوئی فائدہ نہ رہتا اور انسان بہت سے اخلاقِ حمیدہ کو چھوڑ بیٹھتا۔ آخرت پر ایمان ہی ہمیں اچھے اخلاق اپنانے کی ترغیب دیتا ہے، کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ ہم جو بھی نیکی یا بدی کریں گے، ہمیں اس کا بدلہ ملے گا نیز ہم انتہائی بے صبری سے اس لمحے کے منتظر ہیں جب ہم اپنے پروردگار کے جمال کا دیدار کریں گے۔ اس دیدار کے مقابلے میں جنت کی زندگی کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ اس عظیم مقام تک پہنچنے کے لیے اور ہمارے دلوں میں سلگتی آتشِ محبت کی وجہ سے ہماری روحوں کو جلا ملتی ہے اور وہ ہمیں اس ملاقات تک پہنچانے والے سیدھے راستے پر بغیر کسی انحراف کے چلنے پر مجبور کرتی ہیں۔

انبیائے کرام اذنِ خداوندی سے پچھلی شریعتوں کے فروعی احکام کو منسوخ کرتے رہے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت رہی ہے۔ اس کا تعلق انسانی شعور کے ارتقا اور پختگی سے ہے۔ سیدنا آدم علیہ السلام کے دور میں انسانیت ابھی طفولیت کے مرحلے میں تھی، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو عصر کے وقت کے سورج سے تشبیہ دی ہے، دوسرے لفظوں میں آپ ﷺ کے دور میں انسانیت پختگی اور کمال کی حد کو پہنچ کر حق و باطل کے درمیان اچھی طرح تمیز کرنے لگی تھی، اسی لیے اس نے باطل کے بعد آنے والے حق کو مضبوطی سے تھام لیا۔

دین کے فروعی احکام بھی اس مرحلے کے بالکل مناسبِ حال ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اپنی وسیع حکمت کے تحت ان فروعی احکام کو مقرر فرمایا،اسی لیے اس دین کی عبادات کے طریقِ کار میں سینکڑوں مصلحتوں اور حکمتوں کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، گویا اس مرحلے کی عبادت کا طریقِ کار ایک باشعور اور پختہ ذہن قوم کے بالکل مناسبِ حال ہے، جبکہ دوسرے مذاہب تبدیل و تحریف کا نشانہ بن کر اپنی اصلی شناخت کھو بیٹھے ہیں، بلکہ اگر ان کی اصل ہیئت محفوظ بھی رہتی تب بھی وہ اس دور کے لیے مناسب نہ ہوتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اِس دور کے لیے، جس دین کو پسند فرمایا ہے وہ صرف اور صرف اسلام ہے۔

حاصل یہ کہ مذہب کبھی بھی سیلابوں اور آسمانی بجلیوں جیسی قدرتی آفات سے انسانی خوف کے نتیجے میں وجود میں نہیں آیا، نہ ہی دین کبھی ایسا معاشی یا معاشرتی نظام رہا ہے، جس کا ہدف انسان کے معاشی اور معاشرتی مسائل حل کر کے اسے آسودہ حالی اور سعادت سے ہم کنار کرنا ہو۔ رینان اور روسو کا یہ دعوی بھی بالکل غلط ہے کہ یہ انسانی فطرت کی پیداوار ہے، بلکہ یہ انسان کو دونوں جہانوں میں سعادت سے ہم کنار کرنے والے خدائی قوانین کے مجموعے سے عبارت ہے۔ ہماری سعادت اور سکونِ قلب اس پر منحصر ہے، اسی کے ذریعے ہم احکام خداوندی سے وابستہ رہ سکتے ہیں اور جنت میں پہنچ کر جمالِ خداوندی کا دیدار کر سکتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے وہ انسانیت کو دنیوی سعادت کی ضمانت کبھی فراہم نہیں کر سکتی، لہٰذا وہ دین کی جگہ کیسے لے سکتی ہے؟

انسان براعظم امریکا میں کیسے پہنچا؟

آج کل یہ سوال موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ سادہ سا سوال لگتا ہے، لیکن اس کے پیچھے کار فرما سوچ اور ہدف سادہ نہیں ہے، کیونکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تمہارا خیال ہے کہ ساری انسانیت حضرت آدم علیہ السلام اور حواء علیہا السلام کی نسل ہے، لیکن ایک ماں باپ کی اولاد اس نئے دریافت شدہ براعظم میں کیسے پہنچی؟ اگر تمہارا خیال درست ہوتا تو یہ لوگ وہاں نہ پہنچ سکتے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر انسان اپنے اپنے علاقے میں ارتقا کے زیرِ اثر مستقل طور پر پروان چڑھا۔

لہٰذا بادی النظر میں سادہ نظر آنے والے اس سوال میں یہ الحادی فکر مضمر ہے۔ ہم یقیناً یہ کہتے ہیں کہ تمام انسان آدم و حواء علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ یہ بات صرف ہم نہیں کہتے، بلکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے اور اسی وجہ سے ہم اس پر صدقِ دل سے ایمان رکھتے ہیں۔

مادہ پرست کئی سالوں سے باہم متعارض نظریات پیش کر رہے ہیں اور قرآنِ کریم کے بیان کردہ تصورِ تخلیق کو مجروح کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، لیکن جیسا کہ ہم نے ایک اور کتاب(48) میں تفصیل سے ذکر کیا ہے، یہ نظریات یکے بعد دیگرے غلط ثابت ہو گئے ہیں اور سائنسی پہلو سے قرآنِ کریم کے موقف کا صحیح ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ ہم یہاں اس موضوع کو نہیں چھیڑیں گے، بلکہ اس موضوع میں دلچسپی رکھنے والوں کو اوپر ذکر کردہ کتاب کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دینے پر اکتفا کریں گے، تاہم اتنی بات ضرور کہیں گے کہ سارے انسان حضرت آدم و حواء علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ اس کے برعکس دعوی کرنے والے نظریہ ارتقا کو آئے روز نئے نئے سائنسی اعتراضات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، نیز ہمیں یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ڈارون ازم کی ایک نظریے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ ہم انتہائی کمزور بنیادوں پر قائم اس نظریے کے رد میں ضرورت سے زائد دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں، لیکن ہم ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں، کیونکہ اس نظریے کے پس پردہ موجود الحادی فکر اس

قدر خطرناک ہے کہ وہ نہ صرف اس قدر دلائل پیش کرنے کا جواز فراہم کرتی ہے، بلکہ ہمیں اس پر مجبور کرتی ہے۔ آج واضح طور پر نظر آیا ہے کہ یہ نظریہ پیدا ہی مردہ ہوا تھا اور اس میں زندگی کے آثار کبھی بھی ظاہر نہ ہوئے۔ ہزاروں اہل ایمان سائنسدانوں نے اسے اس قدر تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ اس کا کوئی بھی پہلو تنقید سے محفوظ نہ رہا۔ سینکڑوں بار اس کا بالکل بے بنیاد ہونا ثابت کیا جا چکا ہے، تاہم چونکہ بعض گمراہ کن لوگ اس کا احیائے نو کر کے ہمارے بعض نوجوانوں کی بے خبری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اس لیے ہم نے بھی اس پر تنقید کرنے کو ضروری خیال کیا ہے۔

کرۂ ارض میں کئی بار بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ مثال کے طور پر ماہرین ارضیات کہتے ہیں کہ موجودہ بحر ابیض متوسط دس ہزار سال پہلے خشک قطعۂ ارض تھا اور موجودہ خشکی کے کئی حصے پہلے زیر آب تھے۔ اگر ان کی یہ بات درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بحر ابیض متوسط کی موجودہ جگہ پر اُس دور میں تہذیب و تمدن اور ریاستیں موجود رہی ہوں گی، یہی بات براعظم امریکا اور آسٹریلیا کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے، یعنی یہ ممکن ہے کہ کسی دور میں یہ دونوں براعظم دنیا کے دیگر براعظموں سے متصل ہوں اور آج ان کے درمیان حائل سمندر اس وقت خشکی کا حصہ ہوں۔ اگر اس پہلو سے دیکھیں تو انسان کا براعظم امریکا وغیرہ میں منتقل ہونا بالکل آسان اور ممکن دکھائی دیتا ہے۔

مزید برآں انسانی تاریخ ناقابل تصور حد تک قدیم ہے، کچھ عرصہ پہلے ہی ۲۷۰ ملین سال پرانے انسان کے بہت بڑے ڈھانچے کی دریافت سے متعلق مضامین شائع ہوئے ہیں، جبکہ ابھی تک بندر کے قدیم ترین دریافت شدہ ڈھانچے کا زمانہ ۱۲۰ ملین سال پہلے کا بتایا جاتا ہے، گویا ان دونوں کے درمیان دوگنا سے زیادہ عرصہ حائل ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض سمندری حیاتیات مثلاً سبز کائی اور اسی طرح موجودہ شہد کی مکھیاں ۵۰۰ ملین برس پہلے بھی اسی حالت میں پائی جاتی تھیں جیسے آج پائی جاتی ہیں۔

ان اعداد و شمار کے ذریعے سائنس دان اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ کائنات اور زندگی کے ظہور کا زمانہ اس سے قدیم تر ہے، جو پہلے خیال کیا جاتا تھا، لہٰذا ما قبل التاریخ دور کے بارے

میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی یا کم از کم ہم نے جو احتمالات بیان کیے ہیں اور ان کی روشنی میں جو باتیں کہی ہیں انہیں رد نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ہمارے نقطہ نظر سے اختلاف رائے رکھنے والوں کے پاس ہمارے نقطہ نظر کی مخالفت میں کوئی قابل ذکر دلیل موجود نہیں ہے۔

جب فرانسیسیوں کا مایا کے باشندوں سے سامنا ہوا تو انہوں نے فرانسیسیوں کو بتایا کہ ان کی قدیم تاریخ کے مطابق ان کی زمین ایک اور خشکی کے ٹکڑے کے ساتھ ملی ہوئی تھی، لیکن طوفانوں اور زلزلوں کے باعث خشکی کا وہ حصہ سمندر میں ڈوب کر غائب ہو گیا اور وہ زمین کے بلند مقامات پر محفوظ رہے، اسی قسم کے اشارات ہندوستان کی تاریخ میں بھی ملتے ہیں کہ ایک بہت بڑے طوفان کے نتیجے میں ان سے متصل خشکی کا حصہ ان سے جدا ہو گیا اور ان دونوں کے درمیان سمندر حائل ہو گیا۔ ممکن ہے کہ ان سے جدا ہونے والا خشکی کا حصہ موجودہ براعظم آسٹریلیا ہی ہو، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا براعظم امریکا اور آسٹریلیا تک پہنچنا مشکل یا ناممکن نہ تھا۔

نیز اگر کرۂ ارض کی موجودہ جغرافیائی خدوخال کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی ان براعظموں تک پہنچنا کچھ مشکل نہیں، کیونکہ آبنائے "برنگ" کا پانی بسا اوقات اس قدر منجمد ہو جاتا ہے کہ روس کے راستے سے امریکا پہنچنا ممکن ہو جاتا ہے، نیز پرانے دور کی کشتیوں کے ذریعے اس مسافت کو طے کرنا بھی ممکن تھا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلمان سیاح جدید بحری جہازوں کی ایجاد اور کرسٹوفر کولمبس سے پہلے براعظم امریکا پہنچ چکے تھے، بلکہ وہ کشتیوں پر اپنے ساتھ اپنے گھوڑے بھی لے گئے تھے۔ اس حقیقت کی طرف بہت سے محققین نے اشارہ کیا ہے، لہٰذا انسان کا براعظم امریکا منتقل ہونا اور وہاں انسانی آبادی کا پایا جانا عملی طور پر ناممکن ہے اور نہ ہی کوئی عجیب و غریب واقعہ ہے، بلکہ ایک عام سا واقعہ ہے۔

جہاں تک ڈارون ازم کا تعلق ہے تو اس سے متعلق بہت سا تنقیدی لٹریچر سامنے آچکا ہے اور اس بارے میں بہت سی علمی کتابیں اور بحثیں شائع ہو چکی ہیں۔ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کتابوں کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

دعوت کی محنت کو چھوڑنے اور اس سے بے تعلق ہونے والے اپنے بھائیوں سے کیسا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟

بعض اسباب کی بنا پر ہمارے بعض بھائیوں کا دعوت سے تعلق ٹوٹ گیا ہے۔ ایسا ہر دور میں ہوتا رہا ہے، لیکن اس کے باوجود ان کے ساتھ ہمارا ایمانی رشتہ برقرار ہے۔ وہ ہمارے بھائی ہی ہیں اور قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق مسلمان جس قدر و منزلت اور احترام کا مستحق ہوتا ہے وہ بھی اس کے حقدار ہیں۔ دوسرے ہر معاملے کی طرح یہاں بھی قرآن و سنت ہی معیار ہیں۔ ہم ان کی کبھی بھی غیبت نہیں کرسکتے، کیونکہ غیبت حرام اور اپنے بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے، گویا اپنے بھائی کی قول و فعل سے اہانت کرنے اور اس کا گوشت دیگچی میں پکا کر کھانے میں کوئی فرق نہیں۔ بعض حالات میں غیبت کرنا جائز ہوتا ہے، جس کی تفصیل کتبِ فقہ میں موجود ہے، تاہم میں ایسے حالات اور حدود کے قریب جانے کے حق میں نہیں ہوں، کیونکہ ایسے حالات میں بہت ہی کم لوگ اعتدال کی راہ اختیار کرسکتے ہیں۔

لہٰذا ہر شخص کا اس حق کو استعمال کرتے ہوئے ان حدود کے قریب جانا درست نہیں۔ یہ تو اس مسئلے کا ایک پہلو ہے۔ اس کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم اپنے اس بھائی کے بارے میں جو بات کہیں گے وہ کبھی نہ کبھی اس تک ضرور پہنچے گی، جس کے نتیجے میں وہ ہم سے اور بھی دور ہو جائے گا اور چونکہ ہم اس کا سبب بنے ہیں، اس لیے اس کی ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوگی۔ یہ کوئی معمولی گناہ نہیں، کیونکہ اس دعوت اور مبارک دینی خدمت سے کسی کو دور یا محروم کرنے کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارے اس قسم کے غلط رویے سے ایک دور میں دعوت پر اپنی جان فدا کرنے والا شخص نہ صرف اس سے دور ہو جائے، بلکہ اس کا دشمن بن جائے، جس طرح حق دعوت سے عداوت رکھنا بہت بڑا گناہ ہے، اسی طرح اس کا باعث بننا بھی جرم عظیم ہے۔

بعض لوگ اکثر اوقات ایسی دعوتی یا دینی جماعت پر تنقید اور اس سے استہزاء کرتے نظر آتے ہیں، جس کے تحت وہ کام نہیں کر رہے ہوتے۔ اگر ہم اس پہلو کو پیش نظر رکھیں تو جماعت

سے دور ایسے افراد کے تمام تصرفات کی توقع حکمت کا تقاضا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان کی بری تقدیر اور بدنصیبی ہے۔ ان لوگوں کی اس تکلیف دہ صورتحال پر ہم افسوس اور ترحم کے اظہار کے سوا کیا کر سکتے ہیں؟ ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم دوسروں سے ایسا رویہ اپنائیں جیسا ہم چاہتے ہیں کہ اگر ہم ان کی جگہ ہوتے تو دوسرے ہم سے اپناتے، دوسرے لفظوں میں ہمیں اس معاملے میں انہیں ضرورت سے زیادہ ملامت نہیں کرنی چاہیے۔

یہی رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے۔ آپ ﷺ نے غلطی کرنے، شک میں مبتلا ہونے اور اعمال یا خدمات سرانجام دینے میں کوتاہی کرنے پر کبھی کوئی بات نہیں کہی۔ آپ ﷺ عبداللہ بن ابی بن سلول ایسے جن لوگوں کے نفاق سے واقف تھے، لیکن آپ ان کی بھی غیبت نہ فرماتے، بلکہ ان کے ظاہر کو قبول فرماتے۔ اُس کے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بہتان طرازی کرنے کے بعد صحابہ کرام نے آپ ﷺ سے اس کے قتل کی اجازت مانگی، لیکن آپ ﷺ نے اس کے خلاف کوئی بات ارشاد نہ فرمائی، بلکہ فرمایا کہ میں لوگوں کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا کہ محمد اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کروادیتا ہے۔ اگر آپ حدیث کی کتابوں کو کھنگالیں گے تو آپ ان میں کوئی ایسی حدیث نہ پائیں گے، جس میں آپ ﷺ نے کسی مؤمن کو تکلیف پہنچائی ہو یا اس کی بے عزتی کی ہے۔ اگر آپ کو کوئی ایسی بات مل گئی تو میں اپنی سابقہ بات سے رجوع کرلوں گا اور آئندہ کبھی ایسی بات نہ کہوں گا، لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کو کبھی ایسی بات نہ ملے گی۔ ہمارے پیش نظر ہمیشہ یہی معیار رہنا چاہیے اور اپنے بھائیوں کی کبھی بھی غیبت نہیں کرنی چاہیے۔

عظیم مفکر علامہ بدیع الزمان نورسی کے کردار سے بھی ہمیں یہی راہ نمائی ملتی ہے، جب کچھ عرصہ تک ان کے بعض تلامذہ ان سے دور رہے اور پھر آخرکار دوبارہ ان کے پاس آگئے تو انہوں نے ایسے تلامذہ کے خلاف کوئی بات نہ کہی، بلکہ ان کے لوٹنے پر ان کی تعریف کی اور صرف ان کے واپس لوٹنے پر زور دیا۔ ان کے بارے میں ہماری یادداشت میں یہی بات باقی رہ گئی ہے، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس واپسی سے پہلے فراق اور دوری بھی ہوئی تھی، لیکن اپنی گفتگو میں انتہائی احتیاط برتنے والے اس عظیم راہنما نے ان کی واپسی پر تو زور دیا، لیکن ان کی مفارقت

اور دوری کے بارے میں ایک سطر بھی نہ لکھی۔ اگرچہ ان کی زندگی میں بہت سے لوگوں نے ان پر بہت سے الزامات لگائے اور ان کی شخصیت پر حملے کیے، لیکن انہوں نے ایسے لوگوں کے خلاف کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جو غیبت کے دائرے میں آتی ہو اور نہ ہی ان میں سے کسی کا نام ظاہر کیا۔ کسی انسان کا مؤمن کی حیثیت سے کفر کے خلاف موقف اختیار کر کے جنت کا مستحق ٹھہرنا کوئی معمولی بات نہیں، اس لیے جس طرح ہم سانپ اور بچھوؤں سے دور بھاگتے ہیں، اسی طرح ہمیں اپنے بھائیوں کی غیبت کرنے سے بھی بچنا چاہیے۔

اس موضوع کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ عام حالات میں اسلامی نظام کے تحت جو سزائیں نافذ کی جاتی ہیں وہ محاذِ جنگ پر نافذ نہیں ہوتیں، یعنی اگر کوئی شخص محاذِ جنگ پر چوری، زنا یا قذف کا مرتکب ہو تو اسے ان جرائم پر سزا نہیں دی جائے گی۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ کہیں وہ شخص اپنے بچاؤ کے لیے دشمن سے نہ جا ملے، کیونکہ اگر وہ دشمن سے جا ملا تو ایک تو وہ دائمی خسارے میں مبتلا ہو گا، دوسرے ہم ایک ایسے شخص کو اپنا دشمن بنا بیٹھیں گے جو ہمارے سارے رازوں سے واقف ہے اور یہ دونوں باتیں ہمارے لیے نقصان کا باعث ہیں، اس لیے اگرچہ حالات پر قابو پانا ضروری ہے، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اسے اپنا دشمن بنائیں اور نہ ہی اس کے ساتھ دشمنوں جیسا برتاؤ کریں، بلکہ اس کے ساتھ بہترین حسن سلوک کریں۔

مثلاً بعض اوقات ہمارا کوئی بھائی خوف یا کسی منصب کی خواہش کی وجہ سے ہم سے دور ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس کے اس فعل کے محرکات سے واقف ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ محتاط رہنا چاہتا ہے۔ احتیاط اچھی بات ہے، لیکن ہم اس سے اس بارے میں جھگڑا نہیں کریں گے۔ ہمارا ایسا رویہ اختیار کرنے سے اس کے سامنے ہمارے دروازے کھلے رہیں گے۔ ہو سکتا ہے سالہا سال بعد ہمارے تعلقات پھر سے استوار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے اسے بعد میں حقیقت معلوم ہو جائے اور وہ ہمارے پاس لوٹ آئے۔ اگر وہ اپنی غلطی اور ہمارے موقف کے حق بجانب ہونے کا اعتراف کر لے تو ہم اس سے کہیں گے: ”تم اب بھی حق بجانب ہو۔“

نیز جس شخص کی ہم غیبت کر رہے ہوتے ہیں، اس کے ساتھ بعض اور لوگوں کی رشتہ داری، محبت یا اشتراک فکر کا تعلق ہوتا ہے۔ غیبت سے ایسے لوگوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور اس میں ہمارا ہی نقصان ہے پھر آج ہی اپنی ساری باتیں نہیں کہتے، بلکہ آنے والے دنوں میں بھی ہم نے باتیں کرنی ہوتی ہیں، لہٰذا اسے آج کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

بسااوقات ایسے لوگ ہماری غیبت کر کے ہمیں تکلیف پہنچاتے ہیں، لیکن ہمیں اس کے مقابلے میں ایسا ہی برتاؤ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ ہمیں اپنی عزتِ نفس کی خاطر انتقام لینے اور شخصی معاملات میں الجھنے سے سخت اجتناب کرنا چاہیے۔ دعوت کی عظیم محنت کی خاطر ہمیں اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہیے۔ جب رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور اسلام پر حملے ہو رہے ہوں تو ایسے حالات میں ہم اپنی عزت کو موضوعِ بحث نہیں بنا سکتے، بلکہ اس بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس دور میں ہم کسی انسان کی جو بہترین مدد کر سکتے ہیں وہ اس کی دینی زندگی کی حفاظت کی مدد ہے۔ اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے پہنچنا ہماری سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ کی صفات اور اسمائے حسنیٰ کے مختلف درجات ہیں؟

اگر ہمارے نام ہمارے والدین نہ رکھتے، بلکہ بعد میں حاصل ہونے والی مہارتوں کی بنیاد پر ہمارے نام رکھے جاتے تو ہم میں سے کسی کا نام نانبائی ہوتا تو کسی کا نام ترکھان رکھا جاتا، غرض ہر ایک کا نام اس کے پیشے پر دلالت کرتا۔ بعض اوقات نام مبالغہ کے الفاظ بھی ہوتے ہیں، مثال کے طور پر جو شخص معمولی درجے کی ستر پوشی کرتا ہے، اسے "ساتر" کہتے ہیں، لیکن جو بہت زیادہ ستر پوشی کرتا ہے اسے "ستار" کہا جاتا ہے۔ جو شخص تعریف کرتا ہے وہ "حامد" کہلاتا ہے، لیکن بہت زیادہ تعریف کرنے والے کو "حماد" کہتے ہیں۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارے نام مستقبل میں ہمیں حاصل ہونے والی مہارتوں کے پیش نظر نہیں رکھے جاتے، بلکہ وہ ہمارے والدین کی خواہشات کے عکاس ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اسم اور مسمیٰ میں کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ شاید کسی کو یہ مثال اچھی نہ لگے، لیکن اس کے سوا چارہ نہ تھا، کیونکہ مجرد (Abstract) حقائق کی وضاحت اور تفہیم کے لئے ہمیں مجبوراً ایسی مثالوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا معاملہ اس سے مختلف ہے، کیونکہ ان کے بارے میں بندوں کو انبیائے کرام نے بتایا ہے۔ اسمائے حسنیٰ کا تعلق کائنات میں جاری خدائی اقدامات کے ساتھ ہے۔ قوسِ قزح کے رنگوں کی مانند باہم مربوط کائناتی حسن سب پر عیاں ہے۔ ہم کوہ و دمن، باغوں اور پھولوں اور آنکھوں اور پلکوں میں اس جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہزاروں سال سے شعراء اس ظاہری حسن و جمال کے گیت گاتے رہے ہیں اور گاتے رہیں گے، لیکن وہ اس کی بہت معمولی مقدار کو الفاظ کا جامہ پہنا سکے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس حسن و جمال کو دیکھ کر ہم اس قدر حیرت زدہ ہیں اور اسے پوری طرح بیان کرنا ہمارے بس میں نہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے ایک نام "الجمیل" کا مرہونِ منت ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ کائنات میں رزق کی تقسیم کا بڑا منظم نظام کار فرما ہے۔ ایک خلیے سے لے کر گینڈے تک ہر جاندار کو اس کے مناسبِ حال رزق ملتا ہے، چنانچہ ذکر و تسبیح ملائکہ کا رزق ہے۔ گوشت انسانوں کی خوراک ہے اور ہڈیاں جنوں کی روزی ہے۔ بلاشبہ تقسیم رزق کے سلسلے میں ہونے والی ان تمام سرگرمیوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا نام "الرزاق" ہے۔

اگر بالفرض ہمیں "الجمیل" اور "الرزاق" کا اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہونے کا نہ بھی علم ہوتا تب بھی ہم اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سازیوں کو دیکھ کر پکار اٹھتے کہ آپ ہی جمیل اور رزاق ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے دوسرے اسمائے حسنیٰ کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں، تاہم اللہ تعالیٰ نے ہمیں شکوک و شبہات کا شکار ہو کر ٹھوکریں کھانے سے بچانے کے لیے اپنی کرشمہ سازیوں کا جلوہ دکھانے کے بعد اپنے لیے ان اسمائے حسنیٰ کا انتخاب بھی خود ہی فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے یہ نام توقیفی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے پاس سے اللہ تعالیٰ کا کوئی نام تجویز نہیں کر سکتے۔ ان اسمائے حسنیٰ کا تعلق مخصوص خدائی صفات کے ساتھ ہے۔ اوپر ذکر کردہ مثال کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کو نانبائی یا ترکھان نہیں کہا جا سکتا، جو روٹی پکانا یا نجاری کا کام نہ جانتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز میں حسن و جمال کا رنگ اسی لیے بھرا ہے تاکہ ہمیں پتا چلے کہ حسن و جمال کا اصل سرچشمہ اس کی ذاتِ والا صفات ہے، لہٰذا ہر سطح کا انسان حسن کے کسی بھی مظہر میں "الجمیل" کا پرتو دیکھ سکتا۔

اسی طرح دوسرے تمام اسمائے حسنیٰ کا تعلق بھی مخصوص صفات کے ساتھ ہے اور ان صفات کا تعلق "الشأن" کے ساتھ ہے۔ اگر ہم یہی بات کسی انسان کے بارے میں کہنا چاہتے تو اسے استعداد اور قابلیت سے تعبیر کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی تعبیر اختیار کرنا درست نہیں۔ حاصل یہ کہ افعال کا اسمائے حسنیٰ کے ساتھ، اسمائے حسنیٰ کا صفات کے ساتھ، صفات کا شئونِ الٰہیہ کے ساتھ اور شئونِ الٰہیہ کا حق تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ تعلق ہے۔ اس مقام پر ہمیں وہی بات کہنی چاہیے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی: "اے ذاتِ معروف! ہم آپ کو کماحقہ نہیں پہچان سکے۔" یا جو بات ابوبکر صدیقؓ نے کہی تھی: "ادراک کی

قدرت نہ ہونا بھی ایک قسم کا ادراک ہے۔" کہہ کر ادب و احترام سے سر جھکالینا چاہیے۔
اللہ تعالیٰ موجود ہیں اور ہمارے روئیں روئیں کو اس کا احساس ہے، لیکن ہم میں اسے پانے کی سکت
نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود سے بڑھ کر کوئی چیز واضح اور عیاں نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود
اس کی ذات پردۂ خفا میں ہے۔ اس مقام پر ہم اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے درمیان فرق کے
بارے میں اسی قدر عمومی وضاحت پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کی تفصیلات کسی اور موقع کے لیے
چھوڑ رکھتے ہیں۔

دشمنوں کی تخریبی سرگرمیوں کے مضر اثرات سے نسل نو کی حفاظت کیونکر ممکن ہے؟

حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے لے کر آج تک کفار تخریبی اور اہل ایمان تعمیری کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ آج بھی یہی صورتحال قائم ہے۔ دور حاضر کے عظیم مفکر علامہ نورسی رحمۃ اللہ علیہ کو اس بات کا شدت سے احساس تھا، چنانچہ وہ فرمایا کرتے تھے: ”اگر ان دونوں قوتوں کے درمیان توازن ہوتا اور دونوں کے پاس ایک جیسے وسائل ہوتے تو ہمیں اپنے مخالفین پر فتح حاصل ہوتی۔“

ہمارے دشمن صرف تخریبی کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ انسان کو خواہشات کے جال میں پھانسنے کے لیے انسانی جذبات اور طبیعت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اسے خالص مادی زندگی کا اسیر اور غلام بنانے کے لیے اس کے دل میں خواہشات کی آگ بھڑکاتے ہیں اور عزت و منصب کے سبز باغ دکھا کر انہیں اس کی زندگی کے مقصد کے طور پر پیش کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ معمولی سے ذرائع استعمال کر کے بڑے پیمانے پر تخریبی سرگرمیاں انجام دینے اور نوجوان نسل کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمارے لیے بھی معاملہ اس قدر آسان ہوتا تو ہم اتنی زیادہ جدوجہد کے بعد بہت کچھ کارنامے سرانجام دے چکے ہوتے، تاہم ہمیں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ ہم ایک ایسے عظیم قلعے کی تعمیر نو کر رہے ہیں، جس کے در و دیوار صدیوں سے منہدم ہو چکے ہیں۔

ذرا سوچیں! ترکی اور بعض دیگر ممالک میں توحید کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کھلم کھلا انکار کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی پر کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ دین کی اہانت کی جاتی ہے اور باوجود اس کے کہ قرآن روشنی اور حق کا سرچشمہ ہے اور بہت سے غیر مسلموں نے بھی اس کے معجزانہ کتاب ہونے کا اعتراف کیا ہے، اسے طاقِ نسیان میں رکھ دیا گیا ہے۔ اور تو اور بعض متدین لوگوں کے ہاں بھی دین اپنی اہمیت اور اولویت کھو چکا ہے، غرض صورتحال انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ ایسے حالات میں جہاں ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں وہیں ان کی اہمیت اور قدر میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ دشمن صرف ایک پتھر یا اینٹ کو اپنی جگہ سے ہٹاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ساری کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے، لیکن ہمیں نہ صرف ایک ایک اینٹ کر کے

عمارت کو تعمیر کرنا ہوتا ہے، بلکہ تعمیر شدہ حصے کی حفاظت بھی کرنی ہوتی ہے، تاہم ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اس کام میں ہمیں عنایتِ الٰہیہ کی حمایت حاصل ہے۔ یہ بات لکھتے ہوئے مجھے مشہور صاحب علم پاسکل کا ایک مقولہ یاد آگیا ہے۔

پاسکل صاحبِ وجدان و عشق انسان تھا، لیکن قسمت نے اس کی یاوری نہ کی۔ ایک مسلمان مفکر اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس نے آخری کشتی میں سوار ہونے کا موقع ضائع کر دیا اور اس میں سوار نہ ہو سکا۔ وہ حضرت محمد ﷺ کے ساحل کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا، لیکن اپنے آپ کو اس نور کی آغوش میں نہ دے سکا، تاہم یہ ایک دوسرا موضوع ہے۔ میں یہاں جو بات بیان کرنا چاہتا ہوں وہ ہمارے موضوع سے متعلق اس کا ایک دوسرا واقعہ ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”ایک دفعہ میں ایک بگھی میں سوار تھا جسے دو گھوڑے کھینچ رہے تھے۔ بگھی دریائے سین کے ساتھ ساتھ جارہی تھی۔ اچانک گھوڑے میرے قابو سے باہر ہو کر دریا کی طرف بے تحاشا دوڑنے لگے۔ بچنے کی کوئی امید نہ تھی اور صاف نظر آرہا تھا کہ دریا میں گرنا میرا مقدر بن چکا ہے، لیکن اچانک ایک غیر متوقع صورتحال پیش آئی اور بگھی گھوڑوں سے جدا ہو گئی۔ گھوڑے دریا میں جا گرے، لیکن مجھے دو نورانی ہاتھوں نے بچا لیا، جس کے نتیجے میں میں بمع بگھی دریا کے کنارے پر محفوظ رہا۔“

اس واقعے کا ہی اثر تھا کہ پاسکل نے اپنی بقیہ زندگی راہب کی حیثیت سے ایک کنیسہ میں غور و فکر کرتے ہوئے گزاری، حالانکہ اس سے پہلے اس کی ساری زندگی لہو و لعب میں گزری تھی۔ پاسکل کے برعکس ہمیں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات میں سینکڑوں دفعہ ایسے نورانی ہاتھوں اور عنایتِ الٰہیہ کا مشاہدہ ہوا ہے، اسی لیے ہم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور عنایتوں پر اس کے بے انتہا شکر گزار ہیں۔

ایک طرف دشمنانِ اسلام فلموں، ڈراموں، شراب و شباب اور رقص و سرور کی محفلوں کے ذریعے ہمارے نوجوانوں کو بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں تو دوسری طرف ہم ان سے بظاہر مشکل دکھائی دینے والے کاموں کا مطالبہ کرتے ہیں، کیونکہ ہم ان سے کہتے ہیں: ”نماز پڑھو، روزے رکھو، خواہشاتِ نفس پر قابو پاؤ اور اپنے لیے نہ جیو، بلکہ قربانی دو اور آئندہ نسلوں کے

لیے جیو۔'' لیکن بظاہر مشکل دکھائی دینے والے مطالبات کے باوجود ہزاروں کی تعداد میں نوجوان ہمارے پاس آکر اسلام کے اصولوں پر عمل درآمد کرتے ہیں۔ کئی سال پہلے ہم نے بتایا تھا کہ سویت یونین اور چین ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ آج یہ ایک عام بات بن چکی ہے۔ماضی میں کہی گئی بہت سی باتیں کماحقہ نہیں سمجھی جاسکیں، لیکن آج وہ حقیقت کا روپ دھار چکی ہیں۔ آس پاس کے علاقوں میں ہمیں بڑی اہم تبدیلیاں رونما ہوتے ہوئے نظر آرہی ہیں۔ دین کے حق میں انسانیت کے دل ایسے موم ہونے لگے ہیں، جیسے برف سورج کی تمازت سے پگھلنے لگتی ہے۔ کفر کے کارندے اعلیٰ مناسب کھو کر نیچے آنے لگے ہیں اور ہماری صفوں میں شامل لوگ تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ آئندہ ربع صدی میں بہت سی تبدیلیاں پیش آئیں گی اور عالم اسلام کو اقوام عالم کے درمیان مناسب مقام حاصل ہو گا۔ایک طرف کفر اپنی شان و شوکت اور مواقع کھونے لگا ہے، جبکہ دوسری طرف ہم اپنی صفوں میں نظم ونسق پیدا کر کے پیش قدمی کرنے لگے ہیں۔

ہمیں اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے۔باقی نوجوان نسل کی حفاظت اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت سے یہی امید ہے کہ وہ بڑی محنت اور مصائب و مشکلات جھیلنے کے بعد تیار ہونے والی نوجوان نسل کی حفاظت فرمائیں گے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو درندوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت شامل حال نہ ہوتی تو یہ ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ بلاشبہ یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا لطف و احسان ہے کہ اس نے ہمیں ایسے شعبوں میں کام کرنے کی توفیق دی، جن سے ہم پہلے ناآشنا تھے، لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہمیں احساس ہوا کہ ہمارے لیے ان شعبوں میں کام کرنا ناگزیر ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اس کام کی تکمیل تک اپنی عنایت اور مدد کو شامل حال رکھے۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔

نوجوانی کی خواہشات کے خطرات سے اپنے آپ کو کیسے بچایا جائے؟

دور حاضر کے انسانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے ان کی اکثریت اچھے جذبات پر اثر انداز ہونے والے نوجوانی کے جذبات کے دباؤ میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے منشا کے مطابق اسلامی حقائق کو پیش کرنا مشکل ہو گیا ہے، لیکن ایسے حالات میں جدوجہد کرنے کے مثبت پہلو بھی ہیں۔ جس قدر مشکلات بڑھتی ہیں اور مصائب پیش آتے ہیں، اسی قدر اجر و ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی سر فروشی کے وقت حالات کی شدت اور سنگینی ہی کی بدولت انہیں سید الشہداء کا مرتبہ ملا۔ انہیں مسلمانوں کی قلت اور کفار کی کثرت کا علم تھا، لیکن اس کے باوجود وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر قوتِ ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جہاد کے لیے نکل پڑے، یہی بات ان کے سید الشہداء بننے کا ذریعہ بنی۔

جن گناہوں کی وجہ سے آج ہم پریشان ہیں وہ صحابہ کرام کے دور میں بھی موجود تھے۔ عورتیں خانہ کعبہ کے گرد برہنہ ہو کر طواف کرتی تھیں۔ شراب نوشی، رشوت ستانی، قمار بازی اور سود خوری معاشرے کے رگ و ریشے میں سرایت کیے ہوئے تھی، لیکن صحابہ کرام نے ان تمام فواحش سے پیٹھ پھیر کر اسلام کی طرف رخ پھیرے رکھا۔ وہ انسان تھے اور انسانی طبیعت اور جذبات کے مالک تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی تمام خواہشاتِ نفس کو قربان کیا، جس کے نتیجے میں انہیں عظمت اور بلندی نصیب ہوئی۔ انہوں نے تمام فواحش کو چھوڑ کر پاکیزہ زندگی اپنائی اور ہر قسم کے خطرات کا سامنا کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے نقش پا پر چلتے رہے، جس کے نتیجے میں انہیں بہت سے فضائل حاصل ہوئے اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے ہدایت کے ستارے بننے کے سزاوار ٹھہرے۔

آج بھی بہت سے خطرات در پیش ہیں، اسی لیے ایک دفعہ بیسویں صدی کے مفکر بدیع الزمان سعید نورسی کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ مصائب، خطرات اور فتنوں کے دور کے ہیرو ہیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ اس صدی کی انسانیت کو پکارتے تو یوں فرماتے: ”آؤ! آؤ! اے خطرات

کے دور کے لوگو!" کیونکہ اگر ہم بازار، شاہراہ، معاشرتی اور تجارتی سرگرمیوں، فرد، خاندان، معاشرے، مدرسے اور دیگر تمام محکموں اور اداروں کا جائزہ لے کر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں تو جو بات ان سب پر سچی آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی حالت "بہت ناگفتہ بہ" ہے۔

آپ کہیں بھی جائیں یا گھومیں پھریں گناہوں کے کچھ نہ کچھ اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ روح کے بار بار پژمردہ ہوئے اور دل میں میلا پن آئے بغیر معاشرتی زندگی کی سرگرمیوں میں حصہ لینا ممکن نہیں رہا۔ آج صحیح مسلمان بن کر رہنا انگاروں پر چلنے سے زیادہ دشوار ہو گیا ہے۔ ہم اس قدر ہولناک اور خطرناک دور کی پیداوار ہیں۔ ہماری فطرت میں موجود نفسانی خواہشات ہمیں ڈسنے کے لیے بچھو کی طرح موقع کی تلاش میں رہتی ہیں۔ یہ خواہشات اور شہوات اس برے ماحول میں جس میں ہم جنم لیتے اور پرورش پاتے ہیں، مسلسل غذا اور تقویت حاصل کرتی رہتی ہیں، لہٰذا اس بات کا ہر وقت امکان رہتا ہے کہ خواہشات کا یہ بچھو کسی بھی وقت ہمیں ڈس کر ہمارے جسموں کو مسموم بنا دے۔

تاہم ہم نفع کی امید پر اس نقصان کو بخوشی قبول کرتے ہیں اور ہمیں حاصل ہونے والا فائدہ ہمارے لیے باعث تسلی ہوتا ہے، کیونکہ مشکلات کے اس دریا کو عبور کرنے پر ہمیں اجر و ثواب بھی اسی قدر زیادہ ملتا ہے۔ جب صحابہ کرام ان کڑی شرائط پر پورے اترے تو وہ اعلیٰ درجات کے مستحق ٹھہرے۔ ہمیں بھی رحمت خداوندی سے یہی امید ہے کہ وہ دور حاضر کے اہل ایمان کو اس سعادت کو پانے کی توفیق دے گی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے دور میں جبکہ گناہوں کے مواقع بکثرت ملتے ہیں اور معاصی کا ارتکاب آسان ہو گیا ہے، ہم سے بلا قصد گناہوں کا صدور ہو جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم رحمت خداوندی کی چوکھٹ کو چھوڑیں اور نہ ہی اپنے پایۂ استقلال کو متزلزل ہونے دیں۔

اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے مجھے اپنی بعض یادداشتیں دہرانے کا موقع دیجیے۔ جب میں چھوٹا تھا تو ہمارا ایک کتا تھا جو ہماری بکریوں کی رکھوالی کرتا اور ہمیشہ ہمارے دروازے پر بیٹھا رہتا۔ مجھے اس کے اس پرخلوص رویے پر حیرت ہوتی۔ میں اس کے ساتھ کھیلتا اور اسے روٹی کھلاتا

تھا۔ میں اس سے بحث نہیں کروں گا کہ حفظانِ صحت کے اصولوں کی روشنی میں میرا یہ عمل کس حد تک درست تھا، لیکن میرا مقصد صرف اپنے بعض جذبات کا اظہار کرنا ہے۔ بچپن کی یہ یادیں مجھے بکثرت یاد آتی ہیں اور میں اپنے ہاتھ اٹھا کر اپنے پروردگار سے گڑگڑا کر دعا کرتا ہوں: "اے اللہ! جس طرح اس کتے کے اخلاص کی وجہ سے میں اس کا دوست تھا، اسی طرح آپ بھی اپنے در کے اس قطمیر (49) کو بخش دیجئے، جو آپ کے در کے سوا کسی در پر نہیں گیا... اسے بخش دیجئے اور اس پر رحم فرمایئے۔" ہمیں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا اعتراف ہے، لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت سے بخشش کی امید بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ توبہ کی سچی رغبت کو قبول فرماتے ہیں اور اسے رد نہیں فرماتے۔ ذیل میں ہم چند قابل توجہ امور کی نشاندہی کرتے ہیں:

اول: ہر اعتبار سے پرخطر اور چکنی سپاٹ زمین پر پوری طرح چوکنا ہو کر چلنا ضروری ہے۔ جیسے بارودی سرنگوں سے اٹی زمین یا دشمن کے علاقے سے احتیاط کے ساتھ گزرا جاتا ہے، آج شاہراہوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے بھی ایسی ہی احتیاط برتنی چاہیے۔

دوم: شاہراہ پر نکلنے سے پہلے ہمیں کوئی کتاب پڑھ کر، کوئی اچھا منظر دیکھ کر، کوئی وعظ سن کر یا نفس کا کڑا محاسبہ کر کے اپنے احساسات اور جذبات کی پاکیزگی کا بندوبست کر لینا چاہیے، دوسرے لفظوں میں ہمیں روحانی ماحول اپنائے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔

سوم: اکیلے باہر نہیں نکلنا چاہیے، بلکہ ہمیشہ ایسے دوست کی معیت کا اہتمام کرنا چاہیے، جو نفس کے خلاف ہماری معاونت کرے اور ہماری روح کی تروتازگی کی حفاظت کر کے اسے بیدار رکھے۔

چہارم: ہمیں سفر و حضر میں حتی الامکان روحانی زندگی سے متعلق ایسا مواد اپنے ساتھ رکھنا چاہیے، جو غفلت میں مبتلا ہونے سے ہماری حفاظت کرے۔ یہ مواد جہاں گناہوں سے آڑ بنے گا وہیں ہمیشہ مراقبے اور یادِ الٰہی میں مشغول رہنے کا باعث بھی بنے گا۔ جس شخص کا دل مراقبے اور یادِ الٰہی کے جذبات سے لبریز ہو وہ بہت کم گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے۔

پنجم: جونہی کسی گناہ کا صدور یا کسی غلطی کا ارتکاب ہو فوراً ندامت اور توبہ کا اظہار کیا جائے، کیونکہ مؤمن کے دل میں سب سے کم گناہ ہونے چاہئیں اور بہت ہی کم وقت کے لئے باقی رہنے چاہئیں۔ اس کے دل میں گناہ کے اثرات عارضی ہوتے ہیں اور جلد زائل ہو جاتے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے ہمارے اور سورج کے درمیان حائل ہونے والے بادلوں کی مانند ہوتے ہیں۔ جس قدر توبہ میں تاخیر ہو گی اسی قدر روح پر تاریکی چھائے گی، گناہوں کے راستے کھلیں گے اور ان کا ارتکاب آسان ہو جائے گا، لہٰذا گناہ جس نوعیت کا بھی ہو فوراً اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بخشش کی طرف لپک کر ایسی صورتحال کو پیدا ہونے سے روکنا چاہیے۔

ایک صحابی گھبراہٹ کی کیفیت میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: "یارسول اللہ! میں تو ہلاک ہو گیا۔ میں نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا۔ میرے بارے آپ جو چاہیں فیصلہ فرمائیں۔" رسول اللہ ﷺ نے ابھی اسے کوئی جواب نہ دیا تھا کہ آیت مبارکہ ﴿وَأَقِمِ الصَّلاَةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذَلِكَ ذِكْرَى لِلذَّاكِرِينَ﴾ (ھود: ۱۱۴) "اور دن کے دونوں سروں یعنی صبح اور شام کے اوقات میں اور رات کی چند ساعتوں میں نماز پڑھا کرو۔ کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ ان کے لیے نصیحت ہے جو نصیحت قبول کرنے والے ہیں۔" نازل ہوئی، گویا اس ٹوٹے ہوئے دل کو دیکھ کر عرشِ الٰہی بھی کانپ اٹھا۔(50)

تہجد کی نماز عالم برزخ میں روشنی کا باعث ہو گی۔ وہ گناہوں کو جلد مٹانے کا انتہائی کارگر ذریعہ ہے، کیونکہ نماز تہجد میں انسان بیم و رجا کی قلبی کیفیت کے ساتھ تاریک رات کے خوبصورت ترین لمحات میں دعا کے ذریعے اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ایسی دعا کو اللہ تعالیٰ یقیناً شرفِ قبولیت عطا فرماتے ہیں، بشرطیکہ وہ دعا اخلاص اور حسن نیت سے کی جائے۔ چونکہ جب ہم نماز میں ہم اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہو کر پورے خشوع و خضوع کے

ساتھ اپنی عبودیت کا اظہار کرتے ہیں تو وہ نمازوں کے درمیانی اوقات میں ہم سے سرزد ہونے والے گناہوں اور معاصی کو بخش دیتے ہیں، اس لیے ہمیں نوافل اور تہجد کے ذریعے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک طرف ہم اپنے آپ کو گناہوں کے ماحول میں گھرا ہوا پاتے ہیں اور اس صورتحال پر غمزدہ ہوتے ہیں تو دوسری طرف ایسی مثبت باتیں بھی پاتے ہیں، جن سے ان منفی باتوں کے اثرات کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ ہماری موجودہ صورتحال صحابہ کرام کے حالات سے مشابہت رکھتی ہے اور ہمیں ان کی مشابہت اختیار کرنے کا قوی محرک مہیا کرتی ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ وحی کے اثرات محسوس کرتے تھے، لیکن اگر ہم زمانے کی حدود سے آزاد ہو جائیں تو ہم محمدی صف میں ان کے پیچھے جگہ پا کر اپنی نجات کی ضمانت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہماری امیدوں پر پانی نہ پھیرے۔ (آمین)

چین کے اشتراکی نظام کے ابھی تک ناکام نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟ کیا آپ کو مسلمانوں کے بارے میں روس اور چین سے کوئی اچھی امید ہے؟

چین میں بہت سے مذاہب کے پیروکار بستے ہیں، لیکن ان میں اکثریت کنفیوشس ازم کے ماننے والوں کی ہے۔ ابتدا میں یہودیت اور مسیحیت کو بھی وہاں کچھ فروغ ملا تھا، لیکن جونہی یہودیت کی نسل پرستی اور مسیحیت کے پاپائے روم کو مرکز تسلیم کر کے اس سے ہدایات وصول کرنے کا انکشاف ہوا، ان کا فروغ رک گیا، کیونکہ یہ بات چینی مزاج سے میل نہ کھاتی تھی، اسی لیے پہلے ان کے جس قدر فروغ کی توقع کی جارہی تھی انہیں اس قدر فروغ نہیں ملا، بلکہ عیسائیوں کے گرجاگھر اور یہودیوں کی عبادت گاہیں ویران ہو گئیں۔ چین میں مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دس کروڑ ہے۔ اشتراکی نظام کے قائم ہونے سے پہلے مسلمانوں کی مساجد کھلی تھیں اور انہیں عبادت کرنے کی آزادی حاصل تھی، لیکن اشتراکی نظام کے آنے سے انہیں شدید دھچکا لگا، مسلمانوں کی مساجد کو بند کر دیا گیا اور اعلانیہ عبادت کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اگرچہ حالیہ ایام میں پابندیوں میں کچھ نرمی کی گئی ہے، لیکن ابھی تک ان کے اثرات برقرار ہیں۔

بدھ مت اور ہندو مت کو بھی چین میں کافی اثر ورسوخ حاصل ہے، تاہم جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کنفیوشس ازم کے پیروکاروں کی اکثریت ہے۔ یہ مذاہب دراصل صرف اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ ہیں۔ ان میں عقیدۂ نبوت کا تصور ہے اور نہ ہی عقیدۂ آخرت سے متعلق تعلیمات، لہٰذا اخلاقیات کے میدان میں بھی ان مذاہب کی تعلیمات کے اثرات مشکوک اور محتاجِ تحقیق ہیں، تاہم سورج کی روشنی سے محروم لوگوں نے جب قندیل کی روشنی کو دیکھا تو اسے ہی حقیقی روشنی سمجھ کر ان مذاہب کی اخلاقی تعلیمات پر عمل پیرا ہو گئے۔ ان کی شناخت کی بقا و حفاظت انہی تعلیمات کی پیروی کی مرہونِ منت ہے۔

چین ماضی میں بھی اشتراکی نہیں تھا اور اب بھی اس نظام سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں ہے، کیونکہ اشتراکیت اپنا کوئی وعدہ بھی پورا نہ کر سکی اور دیگر ممالک میں ناکام ہونے والا مادہ پرستانہ

فلسفہ یہاں بھی ناکام ثابت ہوا۔ اشتراکی نظام نے کچھ عرصے تک لوگوں کو دھوکے میں مبتلا رکھا اور ان کی بے خبری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو ان کے مسائل کے حل کے طور پر پیش کیا، لیکن آج اس کی حقیقت آشکار ہو چکی ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ وہ کسی بھی مشکل یا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ آج وہ دہشت گردی اور طاقت کے بل بوتے پر اپنے وجود کو برقرار رکھنا چاہتا ہے، لیکن عنقریب ناکامی اس کا مقدر بن چکی ہے۔ بہت سے اہل بصیرت کئی سال پہلے اس ناگزیر انجام کی پیش گوئی کر چکے ہیں۔ آئندہ چند سالوں میں انسانیت اس خوفناک انجام اور ہولناک سقوط کا مشاہدہ کر لے گی کہ انسان کے بنائے ہوئے نظام کا کیا انجام ہوتا ہے۔

حاصل یہ کہ تعبیرات کے معمولی فرق کے ساتھ مؤرخین اور ماہرین عمرانیات کا کہنا یہ ہے کہ روسی قدامت پرستی اور چینی کنفیوشس ازم کی طرف لوٹ آئیں گے اور یہودی، عیسائی اور مسلمان اپنے اپنے مذاہب پر قائم رہیں گے۔ یہ تو اِن اہل علم کی رائے ہے۔ ہم اس پر اس بات کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ مستقبل میں غلبہ پانے والا واحد مذہب دین اسلام ہے، کیونکہ ہمارے صادق و امین نبی نے ہمیں اس بات کی خوشخبری دی ہے کہ ایک وقت آئے گا جب عیسائیت تحریفات سے پاک ہو کر اپنی اصل حقیقت کو پالے گی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی شخصیت کی نمائندگی کرنے والی مہدیت کی پیروی کرتے ہوئے اسے اپنا پیشوا بنا لے گی۔

قرآن کریم نے ہمیں درج ذیل دعا کی تلقین کی ہے: ﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَاماً﴾ ”اور ہمیں پرہیز گاروں کا امام بنا۔“ یہ اصول ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بات کا فیصلہ نہیں فرمانا چاہتے اس کی دعا بھی الہام نہیں فرماتے، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں متقین کے پیشوا بنائے جانے کی دعا سکھائی ہے تو اگر ہم اپنے قول و فعل سے صحیح اور پورے طریقے سے اپنی دعا پر عمل پیرا ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی شانِ ربانی سے پوری امید ہے کہ یہ دعا شرفِ قبولیت پائے گی، مزید برآں اس آیت مبارکہ کے الفاظ بھی لائق توجہ ہیں۔ اس دعا میں صرف اخلاص اور تقوی کے حصول کی دعا نہیں مانگی گئی، بلکہ متقین کی قیادت و سیادت اور امامت و پیشوائی کی درخواست کی گئی ہے۔ اگر متقی سے مراد

ایسا شخص ہو جو اِن قوانین کے دائرے میں رہتے ہوئے فطری شریعت کی حفاظت میں آجاتا ہے تو اس سے ہمارے موضوع سے متعلق پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں "امت وسطہ" اسی لیے بنایا ہے تاکہ ہم دنیا میں استقامت کی مثال قائم کریں، جو کہ قیادت کے اوصاف میں سے ہے۔ اس ساری تفصیل کے بعد ہم بطور خلاصے کے درج ذیل بات کہہ سکتے ہیں:

عنقریب مسیحیت اپنی خرابیوں سے نجات پاکر پاک صاف ہو جائے گی، تاہم صفائی کے اس مرحلے سے گزرنے کی وجہ سے عقیدے اور عمل ہر دو اعتبار سے اسلام کے مقابلے میں اس کی حیثیت ثانوی اور بطور تابع کے رہے گی، کیونکہ وہ کتنی ہی پاک صاف کیوں نہ ہو جائے اس میں ایک دفعہ تحریف کی گدلاہٹ بہرحال آچکی ہے اور اس کی پاکیزگی عمل جراحی کے مرحلے سے گزرنے کی مرہونِ منت ہے، لہٰذا وہ آغاز سے ہی پاک اور پاکیزہ پانی کی ہم پلہ ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کا اس کے ساتھ موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ اسلام آغاز سے ہی پاک صاف آبِ زلال ہے۔ قرآن کریم نے اس کی حفاظت کی ضمانت دی ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ "بیشک یہ کتابِ نصیحت ہمیں نے اتاری ہے اور یقیناً ہم اس کے نگہبان ہیں۔" لیکن عیسائیت کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی، کیونکہ وہ کچھ ہی عرصے بعد تحریفات کا نشانہ بن کر تاریکی اور گمراہی کے راستے پر چل پڑی، جبکہ مسلمان ہمیشہ سے روشن راستے پر درخشاں افق کی طرف گامزن ہیں۔

ایک بات میں بکثرت کہتا رہتا ہوں اسے میں یہاں پھر دہرانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ہم صرف اپنی ذمہ داریاں سر انجام دینے کے پابند ہیں۔ نتائج اللہ تعالیٰ کے سپرد اور اس کی حکمت و احسان پر موقوف ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے نبی اکرم ﷺ کے جد امجد عبد المطلب نے ابرہہ سے کہا تھا کہ مجھے صرف اپنے کام سے غرض ہے۔ میں ربِ کعبہ کے معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا۔ اس واقعے کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ جب ابرہہ خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے ارادے سے آیا تو بارعب شخصیت کے مالک عبد المطلب اس سے ملنے کے لیے گئے۔ جب ابرہہ نے انہیں دیکھا تو ان کے ساتھ احترام سے پیش آیا اور یہ سمجھا کہ وہ اس سے خانہ کعبہ کو مسمار نہ کرنے کی درخواست لے کر آئے ہیں، لیکن اس کا یہ گمان درست ثابت نہ ہوا۔ جب اس نے ان سے آنے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا: "میری بادشاہ سے یہ درخواست ہے کہ وہ میرے وہ دو سو

اونٹ لوٹا دے، جو اس کے کارندے پکڑ کر لے آئے ہیں۔" یہ سن کر ابرہہ نے تعجب سے کہا: "کیا تم میرے کارندوں کے ہاتھوں پکڑے ہوئے اپنے دو سو اونٹوں کے بارے میں مجھ سے گفتگو کر رہے ہو، لیکن اپنے اور اپنے آباء واجداد کے نزدیک دینی شعار کی حیثیت رکھنے والے اس گھر کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے جسے مسمار کرنے کے لیے میں آیا ہوں؟" یہ سن کر عبدالمطلب نے کہا: "میں صرف اونٹوں کا مالک ہوں۔ اس گھر کی مالک ایک اور ہستی ہے۔ وہ خود اس کی حفاظت کر لے گی۔" (51)

بعد میں عبدالمطلب کی توقع کے عین مطابق واقعات پیش آئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی انوکھے انداز سے حفاظت فرمائی۔ پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ کنکریاں لے کر آئے اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کے لشکر کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند کر دیا۔ میں اس واقعے پر مشتمل سورت فیل کو جب بھی پڑھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ اسلام کے کعبے پر حملہ کرنے والے تمام کفار کا یہی انجام ہو گا۔ اس کے بعد جب میں سورت قریش پڑھتا ہوں تو مجھے وہ اطمینان اور سکون محسوس ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ اپنے راستے پر چلنے والوں کو نصیب فرماتے ہیں۔

لہٰذا ہمیں اپنے ذمہ عائد فرائض کو سرانجام دینا چاہیے اور اس دین مبین کے مقدس مقامات کی حفاظت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیے۔ جس طرح اس نے کل کے ابرہہ کو اپنا گھر مسمار نہیں کرنے دیا اسی طرح وہ آج کے ابرہہ کو بھی اپنے مقدس مقامات کو منہدم کرنے کا موقع نہیں دے گا اور جس طرح کل کا فرعون مر کر بے نام و نشان ہو گیا ہے اسی طرح آج کا فرعون بھی ایسے بے نام و نشان ہو گا کہ تم حیرت و استعجاب کی تصویر بنے رہ جاؤ گے۔ ہم بہت زیادہ پر امید ہیں۔ مستقبل قریب میں اسلام کی آواز سب سے بلند ہو گی، لہٰذا ہمیں موضوع کو صرف روس اور چین تک محدود نہیں رکھنا چاہیے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

ستبدی لک الأیام ما کنت جاھلاً   ویاتیک بالأخبار من لم تزود

"عنقریب زمانہ ان باتوں کو واضح کر دے گا، جن سے تم ناواقف ہو۔ تمہارے پاس ایسا شخص خبریں لے کر آئے گا، جسے تم نے کچھ نہ دیا ہو گا۔"

تم عورتوں کو مارنے کے ارشادِ نبوی پر کیسے عملدرآمد کرتے ہو؟

عورتوں کو مارنے سے متعلق کوئی بھی ارشادِ نبوی موجود نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو کچھ ارشاد فرمایا تھا وہ سب کو معلوم ہے، البتہ اس سوال کا تعلق درج ذیل آیت مبارکہ سے ہے: ﴿وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيرًا﴾ (النساء: ۳۴) "اور جن عورتوں کی نسبت تمہیں معلوم ہو کہ سرکشی اور بدخوئی کرنے لگی ہیں تو پہلے ان کو زبانی سمجھاؤ۔ اگر نہ سمجھیں تو پھر ان کے ساتھ سونا ترک کر دو۔ اگر اس پر بھی باز نہ آئیں تو زدوکوب کرو پھر اگر تمہارا کہنا مان لیں تو پھر ان کو ایذا دینے کا کوئی بہانا مت ڈھونڈو۔ بیشک اللہ بہت اونچا ہے بڑا ہے۔"

اس آیت مبارکہ میں مردوں کو درج ذیل ہدایات دی گئی ہیں:

اول: نافرمان، درشت مزاج اور متکبر عورتوں کو سب سے پہلے مرد سمجھائیں۔ جب تک عورتیں تمہارے ساتھ رہیں، تمہارا کہا مانیں اور تمہاری نسل کے جاری رہنے کا ذریعہ بنیں اس وقت تک ان کی صحیح راہنمائی کرنا، انہیں نصیحت کرنا اور مناسب انسانی رویے اپنانے میں ان کی مدد کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ ممکن ہے ان میں کچھ کمزوریاں ہوں یا ان کے بعض رویے تمہیں پسند نہ آئیں، ایسی صورت میں تمہیں ان کی مدد کر کے ان کی درست راستے کی طرف راہنمائی کرنی چاہیے۔ بعض اوقات وہ اپنے حسن و جمال کا ہتھیار استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن تمہارا اولین فرض ان میں اللہ تعالیٰ کی نگرانی کا شعور پیدا کرنا ہے۔ یہ (فَعِظُوهُنَّ) کی مختصر وضاحت ہے۔

دوم: خوابگاہ وہ جگہ ہے، جسے بعض عورتیں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے اور مرد پر حکمرانی قائم کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اگر عورت خوابگاہ میں اپنے اس مقصد کو پانے میں کامیاب ہو جائے اور مرد کو اپنا غلام بنا لے تو ایسے شخص کو دیگر معاملات میں اپنی بیوی

سے اطاعت و فرمانبرداری کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔اس کے برعکس اگر اس میدان میں جو کہ عورت کا میدان سمجھا جاتا ہے، مرد اپنے ارادے کو استعمال کرے، سرتسلیم خم نہ کرے اور عورت کے ہاتھوں میں کھلونا نہ بنے تو اس کے لیے نفسیاتی طور پر عورت پر اپنی سیادت قائم کرنا آسان ہو جاتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آداب اور رازداری کا خیال رکھا جائے تاکہ گھر یا باہر کے کسی فرد کو اس کا علم نہ ہو سکے۔یہ انتہائی حساس معاملہ ہے،اس لیے افراط و تفریط سے بچتے ہوئے ہمیشہ اعتدال کا راستہ اختیار کرنا ضروری ہے تاکہ فریقین کی مرضی کے مطابق نتائج حاصل کیے جا سکیں۔

مرد کو چاہیے کہ خوابگاہ کو چھوڑے اور نہ ہی دوسرے بستر پر سوئے، بلکہ اپنی قوتِ ارادی کا مظاہرہ کرنے کے لیے بیوی کی طرف پیٹھ پھیر لینا ہی کافی ہے،اس طرح وہ عورت کا ہتھیار اسی کے خلاف استعمال کر کے اسے اپنا ہتھیار استعمال کرنے کا موقع نہیں دے گا اور عورت کی انا پرستی کے مقابلے میں اپنی شخصیت کا اظہار کر کے زبانِ حال سے اسے پیغام دے گا کہ میں اس سے ہرگز زیر نہ ہوں گا۔

تاہم یہ بات یاد رہے کہ آیات مبارکہ میں ان مراحل کا تذکرہ مخصوص ترتیب اور تسلسل سے ہے۔اگرچہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک "واو" مطلق جمع کے لیے استعمال ہوتی ہے، لیکن جمہور علماء کے نزدیک یہ حرف ترتیب اور تتابع کا فائدہ بھی دیتا ہے، دوسرے لفظوں میں پہلے پند و نصیحت سے کام لینا چاہیے، لیکن اگر یہ بے اثر ثابت ہو تو بیوی سے خوابگاہ میں علیحدگی اختیار کی جائے۔ہمارے نزدیک ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ کا یہی مطلب ہے۔

سوم: کبھی اوپر ذکر کردہ تمام اقدامات ناکافی ثابت ہوتے ہیں اور عورت کی نافرمانی اور ہٹ دھرمی برقرار رہتی ہے۔ایسی صورت میں یعنی تیسرے مرحلے میں مخصوص شرائط و قیود کے تحت مرد کو عورت پر ہاتھ اٹھانے کا حق حاصل ہوتا ہے، تاہم عورت کو ایسے انداز سے مارنے کی اجازت نہیں، جس سے اسے شدید تکلیف پہنچے۔ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَاضْرِبُوهُنَّ﴾ کا یہی مفہوم ہے۔

اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ان تین مراحل کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ انہیں نظر انداز کرنا یا اس کی تائید یا مخالفت کرتے ہوئے صرف مار پر ہی زور دینا حدِ اعتدال سے تجاوز ہے، کیونکہ مار کوئی مقررہ اور متعین ضابطہ نہیں ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ کی بندیوں کو نہ مارا کرو۔" اس کے بعد حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: "عورتیں اپنے خاوندوں پر شیر ہو گئی ہیں۔" یہ سن کر آپ ﷺ نے انہیں مارنے کی اجازت مرحمت فرما دی۔(52) کچھ ہی عرصہ بعد رسول اللہ ﷺ کا گھر اپنے خاوندوں کے ہاتھوں پیٹے جانے کی شکایت کرنے والی عورتوں سے بھر گیا۔ ازواجِ مطہرات نے اس معاملے کی اطلاع رسول اللہ ﷺ تک پہنچائی۔ رسول اللہ ﷺ یہ جان کر مسجد کی طرف نکلے اور صحابہ کرام کو جمع فرما کر ارشاد فرمایا: "بہت سی عورتیں اپنے خاوندوں کی شکایت لے کر محمد کے گھر والوں کے پاس آئی ہیں۔ ایسے لوگ اچھے نہیں ہیں۔"(53)

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے مسئلے کا حتمی حل پیش فرما دیا، یعنی آپ ﷺ نے ابتدا میں مارنے کی اجازت دے کر شکایت کی راہ ہموار کی اور جب شکایت کی گئی تو مارنے کی ممانعت فرما دی۔ مارنے کی ممانعت والی بہت سی احادیث آیت مبارکہ کے اجمال کی تفصیل کرتی ہیں، مثلاً رسول اللہ ﷺ نے ایسے مردوں کے رویے پر جو اپنی بیویوں کو مارتے ہیں اور پھر رات کے وقت جانوروں کی طرح ان پر جا پڑتے ہیں تنقید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے: "کیا تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو غلاموں کی طرح مارتا ہے اور پھر رات کو اس سے مجامعت کرتا ہے؟" "کیا تم میں سے کسی شخص کو اس بات سے حیا نہیں آتی کہ وہ دن کے آغاز میں اپنی بیوی کو غلاموں کی طرح مارتا ہے اور پھر دن کے اختتام پر اس سے ہم بستری کرتا ہے؟"

جب کوئی اور چارہ کار نہ رہے اور پہلے دو اقدامات بے اثر ثابت ہوں تو مار کو آخری علاج اور استثنائی صورت کے طور پر صرف ایسی عورتوں کے بارے میں اختیار کیا جا سکتا ہے، جو اپنی فطرت اور مزاج کی وجہ سے مار کے بغیر ٹھیک نہیں ہوتیں، اسی طرح ضروری ہے کہ مار پیٹ عورت کے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ نہ ہو، اسی لیے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''چہرے پر مارنے سے بچو۔''کیونکہ چہرہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا آئینہ دار ہے۔اس کے بعض خطوط اس حقیقت کے عکاس ہیں، لہٰذا چہرے پر مارنے سے بچنا ضروری ہے۔دراصل مارنے کا مقصد بیوی میں عظمت اور عزت کے جذبات پیدا کر کے اس میں تحریک پیدا کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کم سے کم وسائل کا استعمال ضروری ہے۔یہ تحریر لکھتے وقت میری عمر ترپن سال ہو چکی ہے، لیکن اس کے باوجود مجھے آج تک یاد ہے کہ پرائمری کی ایک استانی نے کیسے میرے کان سے پکڑ کر مجھے کہا تھا:''تم ایسے ہو؟''جب بھی مجھے یہ واقعہ یاد آتا ہے تو مجھے یہ نصیحت بھی یاد آجاتی ہے اور میں اس تنبیہ کے نفسیاتی اثر کو اپنے ضمیر پر پڑتا محسوس کرتا ہوں۔

بیوی کی اصلاح اور درستی کے لیے مار پیٹ کو آخری چارہ کار کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے، نیز اس سے عورت کو ایذا نہیں ہونی چاہیے۔یہ بھی یاد رہے کہ اگر مردوں نے مارنے میں حد سے تجاوز کیا یا مارنے میں ان کے پیش نظر اصلاح کے سوا کوئی اور مقصد ہوا تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے جوابدہ ہوں گے۔

جس طرح ہم عورت کی اصلاح اور درستی کی امید سے پند و نصیحت اور عمدہ گفتگو سے کام لیتے ہیں اور اس کی عزتِ نفس کو مجروح کیے بغیر محض اس کی اصلاح کی غرض سے خوابگاہ میں اس سے علیحدگی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، اسی طرح اگر معمولی سی مار پیٹ اس کی اصلاح کے لیے ضروری ہو تو ہم اسے بھی استعمال کر سکتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر وہ ہم سے کسی معاملے میں اختلاف کرے یا کسی بات سے انکار کرے تو ہم جانوروں کی طرح اسے مارنے لگیں۔یہ درشت، بے مقصد اور جاہلانہ عمل ہے، جس پر انسان سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سخت بازپرس ہوگی۔یہ بات تربیت کی تمام صورتوں پر صادق آتی ہے۔استاد اپنے شاگرد کو اصلاح یا ادب سکھانے کے سوا کسی اور غرض سے نہیں مار سکتا، ورنہ وہ جوابدہ ہوگا۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ پند و نصیحت اور علیحدگی کے تمام اقدامات کی ناکامی کے بعد تجربے کی روشنی میں آخری چارہ کار کے طور پر مار پیٹ کو کس فہم و دانش کی بنیاد پر ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے؟ فرض کریں اگر سو میں سے ایک عورت کی اصلاح مار پیٹ کے ذریعے ممکن ہو تو اسلام

اصلاح کے اس اسلوب کو کیوں ممنوع قرار دے؟ یہ بھی اصلاح اور تربیت کا ایک طریقہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مخصوص شرائط کے تحت مارنے کی اجازت دی ہے۔ آپ ﷺ نے سخت مار پیٹ سے منع فرما کر عورت کی حسد اور انتقام کے جذبات سے حفاظت فرمائی ہے۔

بعض اوقات اس سلسلے میں یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ جب مرد کو نافرمان اور ہٹ دھرم بیوی کو مارنے کا حق حاصل ہے تو عورت کو نافرمان اور ہٹ دھرم خاوند کو مارنے کا حق کیوں نہیں حاصل؟

آیت کریمہ کی رو سے مرد عورتوں پر قوّام ہیں اور اس قوّامیّت کا مدار اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ برتری پر ہے۔ مرد کو عورت پر کئی پہلوؤں سے برتری حاصل ہے، تاہم اس برتری کو ایک جسم کے مختلف اجزاء کی ایک دوسرے پر فوقیت کے تناظر میں دیکھنا چاہیے، مثلاً اگر مرد کو آنکھ کی حیثیت حاصل ہے تو عورت کو کان کا مقام حاصل ہے اور اگر مرد کو دماغ کا مقام حاصل ہے تو عورت کو دل کی حیثیت حاصل ہے، حاصل یہ کہ دونوں کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔ دل کے خون کو پمپ کرنے پر دماغ کی زندگی موقوف ہے اور دماغ کی کسی شریان کے پھٹنے سے دل کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ دونوں اعضا کی زندگی کا ایک دوسرے پر انحصار ہے۔ اگرچہ وہ دو مختلف اعضاء ہیں، لیکن ان کا تعلق ایک ہی جسم کے ساتھ ہے، تاہم اگر ہم اس موضوع پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالیں تو ہم عورت پر مرد کی برتری کا انکار نہیں کر سکتے۔

مرد پورا سال بھرپور نشاط کے ساتھ گزارتا ہے اور مشکل ترین کام سرانجام دیتا ہے۔ وہ جسمانی اور نفسیاتی ہر دو لحاظ سے عورت سے زیادہ طاقتور ہے۔ مشکل ترین کام مغرب میں بھی مردوں کے ہی سپرد کئے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کانوں کے کارکن ہمیشہ مرد ہوتے ہیں۔ دوسری طرف عورت اپنے طبیعی تقاضوں کی وجہ سے ہر ماہ کے کچھ ایام حالت حیض میں گزارتی ہے اور نفاس کی حالت میں تو تقریباً دو ماہ بستر پر گزارتی ہے۔ وہ جسمانی طاقت اور قوتِ ارادی کے لحاظ سے بھی مرد کی بہ نسبت کمزور ہوتی ہے اور ہر وقت ہر قسم کی معاشرتی محفلوں میں شرکت نہیں کر سکتی، نیز اپنی قیمتی ترین متاع کھونے کی صورت میں معاشرے کے افراد سے آنکھ ملا کر

بات نہیں کر سکتی، اس لیے اس کے لئے شدید احتیاط کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے۔ وہ بغیر محرم کے طویل سفر نہیں کر سکتی۔

اگر ہم ان امور اور دیگر امور جن کے معروف ہونے کی وجہ سے انہیں ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، کو پیش نظر رکھیں تو مرد کی عورت پر برتری ناقابل انکار حقیقت بن کر سامنے آتی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے کو ان دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ عورت میں رحمت و شفقت اور حساس مزاجی زیادہ ہوتی ہے، اس لیے بچوں کی پرورش اسے سونپی گئی ہے، جو باپ کے بس کی بات نہیں، لیکن دوسری طرف مرد میں خارجی حالات کے دباؤ کو برداشت کرنے کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اسے مشکل ترین کاموں کو سرانجام دینے کا اہل قرار دیا گیا ہے۔

جب بچہ رات کو رونے لگتا ہے تو بعض اوقات باپ بیڈ روم چھوڑ کر کسی دوسرے کمرے میں جانے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن ماں دوڑ کر بچے کے کمرے میں جاتی ہے اور صبح تک اس کے ساتھ رہتی ہے، کیونکہ اس کے دل میں بچے کی ناقابل بیان حد تک محبت ہوتی ہے۔ ایک افسانوی قصہ مشہور ہے کہ کسی بیٹے نے اپنی ماں کو ذبح کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جب وہ اس کے دل کو کاٹنے لگا تو اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا اور اس کے منہ سے بے اختیار "ہائے امی!" نکلا جسے سن کر ماں کے دل نے پکارا: "جی میرے بیٹے!" اگرچہ یہ فرضی قصہ ہے، لیکن ماں کی محبت پر خوب اچھی طرح روشنی ڈالتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر کوئی ایسا وحشی شخص اپنی ماں پر ظلم و ستم ڈھائے اور پھر کسی مشکل میں گرفتار ہو جائے تو اس کی ماں سب سے پہلے اس کی مدد کو آئے گی اور اس کی حمایت کرے گی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جذبات کے معاملے میں عورت کو مرد پر سبقت حاصل ہے اور اگر اس سبقت سے صحیح مصرف میں کام لیا جائے تو یہ خیر کثیر کا باعث بنتی ہے۔

عورت ہی نئی نسل کی تربیت کرتی ہے۔ اچھی تعلیم و تربیت اسے انسانیت کی معراج پر پہنچا دیتی ہے۔ مرد تو زیادہ تر وقت گھر سے باہر گزارتا ہے، جبکہ عورت صبح سے شام تک اپنے بچوں کی صحیح تربیت کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ مائیں ہی ہیروؤں، عظیم ہستیوں اور انسانیت کے لیے قابل فخر

شخصیات کی تربیت کرتی ہیں۔ اگر مرد اور عورت اپنی اپنی امتیازی خصوصیات اور صلاحیتوں کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اپنے فرائض سر انجام دیں تو گھر دنیا میں ہی جنت کا نمونہ پیش کر سکتا ہے۔

مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں، یہی وجہ تھی کہ جنت جس میں ہر چیز کامل ترین صورت میں موجود تھی، میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی تکمیل کے فوراً بعد ان کی خاطر اماں حواء کو پیدا کیا گیا۔ اگر اماں حواء کی تخلیق پہلے ہوتی تو ان کی خاطر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا جاتا، کیونکہ ان میں سے کسی ایک کے لیے دوسرے سے استغناء ممکن نہ تھا۔ عورت گھر کے اندر کے کام سر انجام دیتی ہے اور مرد باہر کے۔ جس طرح مرد کی ذمہ داریاں بعض پہلوؤں سے دشوار ہیں، اسی طرح عورت کے بعض فرائض بھی مشکل ہیں، لیکن "**المغانم بحسب المغارم**" (نفع نقصان کی بقدر ہوتا ہے۔) کے اصول پر مبنی مرد کی قوامیّت اس کے کندھوں پر بھاری ذمہ داریاں ڈالتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بیوی بچوں پر خرچ کرنا اور گھر کے تمام اخراجات اٹھانا مرد کی ذمہ داری ہے۔

عورت کے حمایتیوں (Feminists) کی طرف سے پیش کیے جانے والے حقوقِ نسواں کا نتیجہ عورت کے مقام میں کمی اور اس کی تحقیر و تذلیل کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ عورت کا مردوں جیسے کام سر انجام دینا سردیوں میں ننگے پھرنے اور گرمیوں میں کوٹ پہننے جیسی احمقانہ حرکت ہے۔ عورت اسی وقت تک معزز ہوتی ہے جب تک وہ اپنے صحیح مقام پر رہتی ہے، اسی طرح مرد اسی وقت تک لائق احترام ہوتا ہے جب تک وہ اپنی حدود میں رہتا ہے اور ان سے تجاوز نہیں کرتا۔ جو لوگ ان کی جگہوں میں ردوبدل کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کی لعنت کا مستحق قرار دیتے ہیں، کیونکہ ان کا یہ طرزِ عمل فطرت سے جنگ کے مترادف ہے۔ جس قسم کی بدانتظامی جسم کے اعضاء کے مقامات کو بدلنے مثلاً کان کو گھٹنے، ناک کو پیٹ کے درمیان اور آنکھ کو پاؤں کے نیچے لگانے سے پیدا ہو گی، اسی طرح کی بدانتظامی مرد اور عورت کے اپنی اپنی جگہیں بدلنے سے پیدا ہو گی۔ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ عورت عورت بن کر اور مرد مرد بن کر رہے۔ جو لوگ ان کی جگہوں میں تبدیلی لانے کے لیے سرگرم ہیں وہ فطرت کے خلاف جنگ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

دور حاضر میں سائنسی علوم کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی وضاحت کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ آپ اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

تمام واقعات اور اشیاء کا مختلف سائنسی علوم کی روشنی میں جائزہ لیا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ علوم دینی مسائل سمیت تمام واقعات اور اشیاء کو پرکھنے کا معیار قرار پائے ہیں، مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہیں تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ علم طبیعیات ایک خالص سائنسی موضوع کی حیثیت سے وجودِ باری تعالیٰ کی طرف مشیر ہے، علم کیمیا فلاں فلاں مسائل میں اللہ تعالیٰ کے وجود کا اعلان کرتا ہے۔ بسا اوقات ہم ان تمام علوم اور ایٹم سے لے کر کائنات تک میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو پیشِ نظر رکھ کر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید کے دلائل و براہین تلاش کرتے ہیں۔

ایک زمانہ ہوا میں نے "الطب محراب الایمان" (علم طب ایمان کا دروازہ ہے) نامی کتاب پڑھی تھی۔ مجھے یہ عنوان بہت پسند آیا، کیونکہ میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص علم طب حاصل کرنے کے بعد اللہ پر ایمان نہ لائے۔ اس علم کے محراب میں بہت سے ایمانی مسائل مذکور ہیں، کیونکہ انسان حیرت انگیز طور پر باریک بینی سے پیدا کیا گیا ہے، جس کی وضاحت علم تشریح الابدان سے ہوتی ہے۔ انسان کے کسی بھی عضو کو دیکھ کر اس کی ساخت و پرداخت پر حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا اور انسان "اللہ اکبر" پکار اٹھتا ہے، لہذا علم طب بلاشبہ ایمان کا دروازہ ہے۔

ہم عام طور پر اپنے دین کی وضاحت کے لیے مختلف علوم کا سہارا لیتے ہیں اور قرآنی اعجاز کو ثابت کرنے کے لیے انہیں بطور وسیلہ استعمال کرتے ہیں، مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ماں کے رحم میں جنین جن مراحل سے گزرتا ہے، ان کا قرآنِ کریم میں وضاحت کے ساتھ ذکر ملتا ہے اور وہ جدید سائنس کے دریافت کردہ مراحل کے عین مطابق ہیں۔ ایک امی شخص کی چودہ سو سال پہلے جدید آلات، ایکس ریز اور دیگر ایسے آلات کے بغیر ان سائنسی حقائق تک کیسے رسائی ہوئی، جن کے بغیر ان مراحل کا علم

نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کا تعلق انسانی قدرت سے ہوتا تو ایسا ہونا ممکن نہ ہوتا۔ ان سائنسی دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم رسول اللہ ﷺ کا کلام ہرگز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

جس طرح ہم قرآنِ کریم کا خدا کا کلام ہونا دلائل سے ثابت کرتے ہیں اسی طرح ہم حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر بھی دلائل قائم کرتے ہیں۔ ایمان سے متعلق دیگر موضوعات کو بھی اسی انداز سے زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ چونکہ ہم قرآنی اعجاز پر کسی اور مقام پر سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں، اس لیے ہم یہاں اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں، لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ ہم اپنے دین کی وضاحت کے لیے مختلف سائنسی علوم کی طرف صرف اس لیے مراجعت کرتے ہیں کہ اس دور میں انسانی عقل کا ان سے گہرا تعلق ہے اور مادہ پرست دشمنانِ اسلام سائنس کو الحاد اور انکارِ خدا کے ذریعے کے طور پر استعمال کرتے ہیں، اس لیے بعض فریب خورہ لوگوں کے ذہنوں سے شکوک و شبہات کے ازالے اور سائنس اور دین کے درمیان عدم منافات کے اثبات کے لیے ہم اسی اسلحے کو استعمال کرنے پر مجبور ہیں، دوسرے لفظوں میں مارکس، اینجلز اور لینن جیسے مادہ پرستوں کے سائنس کو الحاد اور انکارِ خدا کے ذریعے کے طور پر استعمال کرنے کے برعکس ہم پر ضروری ہے کہ ہم سائنس کو دین کو دلائل سے ثابت کرنے کے لیے استعمال کریں۔ میں اس میں کوئی قباحت نہیں پاتا، بلکہ میں داعیانِ اسلام کو اس اسلحے سے لیس ہونے کی ترغیب دیتا ہوں، کیونکہ قرآنی آیات ہمیں آسمانوں اور کائنات کے عجائبات دکھانے اور خدائی کاریگری کے کرشمے، قدرت اور طاقت کا مشاہدہ کرانے کے لیے ہماری انگلی پکڑ کر ہمیں ستاروں اور کہکشاؤں کی سیر کراتی ہیں، ہماری توجہ ہمارے اعضاء اور ان کی حیرت انگیزیوں کی طرف مبذول کراتی ہیں، کائنات کے اسرار کو ہمارے سامنے طشت از بام کرتی ہیں، ہمیں یہ بتا کر کہ اہل علم ہی اللہ تعالیٰ سے کما حقہ ڈرتے ہیں حصولِ علم کا شوق دلاتی ہیں اور بہت سے علمی موضوعات کی طرف اشارہ کرکے انسان کو زمین و آسمان کی ملکوت پر غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

لیکن یہ بات نظروں سے اوجھل نہیں رہنی چاہیے کہ کائنات پر غور و فکر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ہونا چاہیے، ورنہ اس کا نتیجہ قرآن کے نام پر قرآن کی تحریف کی صورت میں نکلے گا، لہٰذا اس کے طریقِ کار کے سلسلے میں ہمیں درج ذیل نقاط کو پیش نظر رکھنا چاہیے:

اول : اس طریق کار کو صرف اسلام کی حقانیت کے اظہار کے لیے استعمال کرنا چاہیے اور اسے اپنی علمیت کے اظہار یا فخر و مباہات کے لیے استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہیے، ورنہ سامعین پر ہماری گفتگو کا ذرا اثر نہ ہو گا۔ اگر ہماری نیت خالص اور درست نہ ہوئی تو ہمارے منہ سے نکلنے والے ان پر نور حقائق کی نورانیت ختم ہو جائے گی اور وہ بے اثر ہو کر واپس ہماری طرف لوٹ آئیں گے۔ اگر ہماری گفتگو کا مقصد مخاطبین کو قائل کرنے کی بجائے انہیں خاموش کرانا ہوا تو ہم ان کے دل جیت سکیں گے اور نہ ہی ان پر کوئی مثبت اثر ڈال سکیں گے، لیکن اگر ہماری نیت اچھی ہوئی تو اس موضوع میں دلچسپی رکھنے والوں پر غیر محسوس انداز میں اثر ہو گا، کیونکہ اس صورت میں ہمارا مقصود دوسروں تک حقائق پہنچانا ہو گا نہ کہ اپنی شخصیت کا اظہار۔ بعض اوقات سادہ سی گفتگو جس میں آپ کی رائے میں موضوع کا حق ادا نہیں ہوا ہوتا کسی دوسرے موقع پر آپ کے دیئے گئے فصیح و بلیغ خطبے کی بہ نسبت سامعین پر زیادہ اثر کرتی ہے، لہٰذا ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے واحد مقصد رضائے الٰہی کا حصول اور لوگوں کے ساتھ ان کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کرنا ہونا چاہیے۔

دوم : ہمیں یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ تمام لوگ سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبان سمجھتے ہیں اور نہ ہی اسلامی موضوعات کی وضاحت کے پس پردہ ایسی سوچ کار فرما ہونی چاہیے۔ ایسی سوچ درست نہیں ہے۔ ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ ہمیں اپنے اصولوں میں تردد ہے اور ہم ان کی تقویت کے لیے ان علوم کی مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے ہمارے اصولوں کے بارے میں عدم احترام کا اظہار ہو گا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو ثابت شدہ حقیقت اور اسلامی اصولوں کو سائنس کی تصدیق کی محتاج اور تبعی چیز سمجھنا کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اس موضوع کا حاصل درج ذیل الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے:

سائنس ہمارے دلوں میں پوشیدہ حقائق پر گرد و غبار کی جمی ہوئی دبیز تہوں کو صاف کرنے کا ذریعہ تصور ہوتی ہے، لیکن اگر ہم نے نعوذ باللہ سائنس کی دریافتوں کو حقائق کا درجہ دے

کر آیات و احادیث کو ان کے تابع بنا دیا اور انہیں سائنسی معلومات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے غلط تاویلات کا سہارا لیا تو ہم اپنے آپ کو اور اپنے مخاطبین کو ان مقامات پر شکوک و شبہات میں مبتلا کرنے کا باعث بنیں گے، جہاں اسلام اور سائنس میں ہم آہنگی نہیں ہو پاتی۔ ہمیں درج ذیل طریقِ کار اختیار کرنا چاہیے:

اللہ اور اس کے رسول کا کلام بر حق ہے اور اس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں، جبکہ سائنسی علوم اسی قدر صحیح ہیں، جس قدر وہ اللہ اور اس کے رسول کے کلام سے ہم آہنگ ہیں اور جس قدر ان سے دور ہیں اسی قدر نادرست ہیں۔ درست سائنسی علوم بھی ایسے اصولوں کی حیثیت نہیں رکھتے کہ جن پر ایمانی حقائق کی صحت موقوف ہو۔ اگرچہ وہ ایمان سے متعلق مسائل پر غور و فکر کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، لیکن ہمارے دلوں میں ایمان کی روشنی صرف اللہ تعالیٰ پیدا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے حاصل ہونے والے ان نتائج کے حصول کی سائنسی علوم سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس قسم کی امید ہماری روحانی اور قلبی زندگی پر ایسی ضربِ کاری لگاتی ہے کہ اس کے بعد سنبھلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ عمر بھر اللہ تعالیٰ کے بارے میں کائناتی دلائل کی تلاش میں سرگرداں رہنے والے شخص کی ساری زندگی فطرت، قوانینِ فطرت اور ان کے مفاہیم سے قلبی وابستگی رکھنے والے شخص کی مانند گزرتی ہے۔ وہ پانی اور بہار کی رعنائی دیکھتا ہے، لیکن اس کے دل میں ایمان کی سبز کونپل کبھی نہیں پھوٹتی اور عمر بھر اپنے جمع کردہ دلائل کے باوجود اللہ تعالیٰ کے وجود کو اپنے وجدان میں ایک مرتبہ بھی محسوس نہیں کر پاتا۔ اگرچہ بظاہر وہ نیچری (Naturalist) دکھائی نہیں دیتا، لیکن حقیقت میں اس کی ساری زندگی ایک نیچری کی زندگی کی طرح گزرتی ہے۔

لہذا سائنس اور تمام سائنسی علوم کو ثانوی اور حقائق کے چہرے سے گرد و غبار صاف کرنے کے ذریعے کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ جب شیطان دل میں وسوسہ ڈالے تو اسے زائل کرنے کے لیے ان دلائل کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے، کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں ایمان کی روشنی اس قدر تیز ہے کہ ان دلائل کے حاملین اس پر کسی چیز کا اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس روشنی کو بڑھا سکتے ہیں۔

انسان اپنے دل میں جاگزیں ایمان کی وجہ سے مؤمن کہلاتا ہے نہ کہ ذہن میں جمع کردہ معلومات کی وجہ سے، لہٰذا انفسی اور آفاقی دلائل کی تلاش میں سرگرداں شخص راہِ حق کی بہت کم مسافت طے کر سکتا ہے۔ اگر وہ اس کیفیت کی قید سے آزاد نہ ہو سکے تو قلب و روح کے زینوں پر کبھی بھی نہیں چڑھ سکتا، لیکن اگر وہ ایک مخصوص مقام پر پہنچنے کے بعد اسے ایک جانب رکھ دے اور قرآن کریم کی روشنی میں سفر جاری رکھے تو اسے مطلوبہ انشراحِ صدر حاصل ہو جائے گا اور نور سے اس کے دل و جان منور ہو جائیں گے۔ ایک مغربی مفکر لکھتا ہے: ”میرے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کماحقہ ایمان لانے کے لیے ضروری ہے کہ میں اپنی تمام کتابوں کو پس پشت ڈال دوں۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ انفس و آفاق میں غور و فکر اور ان سے متعلق کتابوں کا مطالعہ مفید چیز ہے، لیکن جیسے ہی یہ چیزیں اپنا فرض ادا کر دیں انسان پر لازم ہے کہ وہ انہیں ایک طرف رکھ دے، تاکہ اس کے ساتھ صرف اس کا ایمان رہ جائے۔ اوپر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق کسی حد تک ذاتی تجربے سے ہے، جو لوگ ایمان کی مضبوطی کا باعث بننے والے وجدانی تجربات سے نہیں گزرے، انہیں شاید یہ نظری باتیں دکھائی دیں، لیکن اپنے پروردگار کے مشتاق اور اپنی راتوں کو نور سے منور کرنے والے لوگ ہماری باتیں سمجھتے ہیں۔

سلطنت عثمانیہ کے شاہی حرم سرا پر شدید تنقید کی جاتی ہے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ہم ترکی کی حسین اسلامی روایات پر اس قدر فریفتہ اور عمل پیرا ہیں کہ ہم اپنی خواتین کی دوسروں کے سامنے تشہیر نہیں کرتے، لیکن ترقی کے علمبرداروں اور اسلامی روایات کے دشمنوں نے ابھی تک عورت کو حرم سرا سے متعلق افواہوں کا موضوعِ سخن بنایا ہوا ہے، لیکن آخر حرم سرا ہے کیا؟ اگر آپ ان سے یہ سوال پوچھیں گے تو وہ جواب میں کہیں گے کہ مغرب ہم سے شدید بغض کی بنیاد پر جو قصے بیان کرتا ہے وہ درست ہیں۔ ان کی نظر میں جانوروں کی افزائشِ نسل کے مراکز کی طرح حرم سرا بھی افزائشِ نسل کا مرکز تھا... یہ بہتان طرازی اور افترا پردازی ہے۔

"تنظیمات" کے دور سے ہم حرم سرا سے متعلق معلومات اپنے مآخذ کی بجائے مغربی مآخذ سے حاصل کر رہے ہیں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ کچھ دن پہلے میں نے ایک جرمن سے کہا تھا: "اگر آپ بازار یا لائبریری میں جائیں گے تو آپ کو نہ صرف فرانس، جرمنی اور اٹلی بلکہ بعض ایشائی ممالک کے حرم سراؤں کے قصوں پر مشتمل ان کے گندے ماحول کی عکاسی کرنے والی بہت سی فلمیں، ڈرامے اور کتابیں ملیں گی، لیکن فتح استنبول کے بعد کی پانچ سو سالہ تاریخ (اس سے پہلے دور کی تو بات ہی کیا ہے) میں آپ کو شاہی حرم سرا سے متعلق کوئی فحش واقعہ سننے کو نہ ملے گا۔ اس قسم کے واقعات کے نہ سنے جانے کی وجہ رازداری کے لیے اختیار کردہ تدابیر نہیں ہیں، بلکہ اس کا باعث یہ ہے کہ ہمارے ہاں حرم سرا میں فحش واقعات پیش ہی نہیں آئے۔"

اس قسم کے فحش واقعات نہ صرف شاہی حرم سرا میں پیش نہیں آئے، بلکہ مالدار طبقے کے حرم سرا بھی ان سے محفوظ رہے ہیں، کیونکہ ہمارے ہاں حرم سرا نہ صرف پاکدامنی اور پاکیزگی کا نمونہ ہے، بلکہ وہ ہمارے ہاں عورت کے خصوصی مقام و مرتبے کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ ہماری تاریخ کی خوبیوں کا انکار کرنے والوں نے ہمیں اپنی تاریخ کے درخشاں پہلوؤں کو دیکھنے سے محروم کر رکھا

ہے۔ در حقیقت عورتوں اور مردوں کی اجتماع گاہیں جدا رکھنا اور انہیں ناجائز میل جول کی اجازت نہ دینا مرد اور عورت میں موجود ضعف کے نتیجے میں توازن قائم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ حرم سرا نہ صرف تقدس و حرمت کی حامل جگہ تھی، بلکہ وہ خاندانی فساد اور نسبوں کے اختلاط کی راہ میں رکاوٹ اور ترکی کی اسلامی روایات کے حسن و جمال کا مظہر تھا۔

حرم سرا ایسا گلدستہ ہے، جس سے پھولوں کی مہک اور اخلاق واقدار کی خوشبو پھوٹتی ہے۔ ہمارے ہاں خوابگاہ کی خصوصی حیثیت ہوتی ہے، کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جہاں نسب کا تعین اور اس کی حفاظت ہوتی ہے اور جہاں پوری رازداری اور خصوصیت کے ساتھ خاندان کی داغ بیل پڑتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اسے مہمانوں کے لیے کھولا جاتا ہے اور نہ ہی یہاں کسی کو بلایا جاتا ہے، نہ صرف اجنبی بلکہ خاندان کے دوسرے افرد بھی جب چاہیں وہاں نہیں جاسکتے۔ خوابگاہ کو اس قدر رازداری (Privacy) حاصل ہوتی ہے کہ ہمیں تربیت دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص ہماری تکریم کی خاطر ہمیں سونے کے لیے اپنی خوابگاہ پیش کرے تو ہم اس کی دعوت کو قبول نہ کریں۔ خوابگاہ بھی دوسرے کمروں کی طرح ایک سادہ سا کمرہ ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود اس قدر رازداری برتنے میں کیا راز ہے؟ ہمارے ہاں ہر چیز کا رنگ مختلف ہے۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی آداب کا خیال رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے حرم سرا صرف عثمانیوں کا ہی امتیاز نہیں، بلکہ ہم میں سے ہر ایک کے گھر میں حرم سرا ہے۔ جو لوگ اس بارے میں اپنے آباء واجداد پر تنقید کرتے ہیں وہ دراصل اپنے اوپر تنقید کر رہے ہوتے ہیں۔

عثمانیوں کے ہاں حرم سرا کو اور بھی زیادہ رازداری (Privacy) حاصل ہوتی تھی اور ہر کسی کو حرم سرا میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ جیسا کہ بعض محلات میں دیکھا گیا ہے حرم سرا کے گرد اونچی اونچی دیواریں کھڑی کی جاتی تھیں، مثلاً توپ کاپے کے محل میں حرم سرا کے حصے کو باقی محل سے جدا رکھنے میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے، جہاں محل کی خواتین اور کنیزیں باغیچوں اور باغات میں شرعی حدود میں رہتے ہوئے سیر و تفریح اور آرام کرتی تھیں۔ اس بندوبست سے خواتین اور کنیزوں کی کسی نامناسب چیز پر نظر پڑنے سے حفاظت کرنا مقصود ہوتا تھا۔ ان

خواتین اور کنیزوں کی عام زندگی اور سیر و تفریح شریعت کی حدود میں ہوتی تھی۔ وہ باہر جھانکتیں تھیں اور نہ ہی ان کی نظر اپنے خاوندوں اور محرموں کے سوا کسی پر پڑتی تھی۔

دراصل محل سے وابستہ مرد بھی ایسی ہی زندگی بسر کرتے تھے اور یہ تمام پابندیاں ان پر بھی عائد تھیں۔ ان کی زندگی بھی دیواروں کے پیچھے گزرتی اور وہ صرف حلال تفریح سے محظوظ ہوتے تھے۔ اگر یہ زندگی محل کی قید سے عبارت ہے تو مرد بھی اس قید میں برابر کے شریک تھے۔ اگر لوگ اس بات پر تنقید کرتے ہیں تو میرے خیال میں وہ ایسی چیز پر تنقید کرتے ہیں، جس کا انہیں علم ہی نہیں، تاہم اگر اس تنقید کا رخ محل میں خواتین کی کثرت کی طرف ہے تو اس کا جواب قدرے تفصیل طلب ہے۔

یہ درست ہے کہ بعض عثمانی سلاطین کی دو دو یا تین تین بیویاں تھیں، لیکن اس کے خلاف ہم کچھ کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ مغرب، اس کے نظریات اور آراء معیار ہیں اور نہ ہی سب کچھ ہیں۔ ایک دور تھا جب اہل مغرب مختلف انداز سے سوچتے تھے۔ آج وہ تعددِ ازواج پر اعتراض کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کل وہ آج کے طرزِ فکر پر تنقید کرنے لگیں۔

مزید برآں جس ذات کو اس بارے میں بات کہنے کا حق حاصل ہے، اس نے اپنی بات کہہ دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو مخصوص شرائط کے ساتھ چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ صرف عثمانی سلاطین نے ہی اس رخصت سے فائدہ نہیں اٹھایا کہ انہیں تنقید کا نشانہ بنایا جائے، بلکہ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور مسلمانوں کی بہت سی عظیم ہستیوں نے اس رخصت سے فائدہ اٹھایا ہے، لہٰذا دین کی عطا کردہ اس رخصت پر تنقید کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں۔ بعض لوگوں کی دو دو اور تین تین بیویاں ہوتیں، لیکن ان کی راتیں عبادت میں اور دن روزے کے ساتھ گزرتے، چونکہ ہم رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے تعددِ ازواج کے موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں، اس لیے یہاں ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہیں، لیکن اگر ضرورت محسوس ہوئی تو ہم اس دینی مسئلے پر علیحدہ سے سیر حاصل بحث کریں گے۔

ایک اور موضوع جسے حرم کے موضوع کے ذیل میں اٹھایا اور ہدفِ تنقید بنایا جاتا ہے، کنیزوں کا معاملہ ہے۔ چونکہ غلامی کی جس صورت کو اسلام نے باقی رکھا ہے، اس پر ہم تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں، اس لیے ذیل میں صرف یاددہانی کے طور پر انتہائی اختصار کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

کنیزیں جنگ کے دوران گرفتار ہونے والی خواتین کو کہتے ہیں۔ مسلمان انہیں اپنے گھروں میں رکھ کر ان کی تربیت کرتے، انہیں اچھی زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتے اور ان کی تمام جسمانی اور روحانی ضروریات پوری کرتے۔ اگر ان میں سے کوئی دین اسلام کو قبول کر لیتی تو عام طور پر اسے آزاد کر دیا جاتا تھا، اسی طرح اگر اس کے مالک کا اس سے کوئی بچہ جنم لیتا تو وہ "ام الولد" بن کر آزادی کی مستحق ٹھہرتی۔ باقی جہاں تک ان سے جنسی تعلقات قائم کرنے کا تعلق ہے تو چند شرائط کے ساتھ ان کے مالک کو اس کی اجازت تھی۔ ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ اس کا کوئی خاوند نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ مکمل طور پر ایک ہی شخص کی ملکیت میں ہو اس کے ایک سے زائد حصہ دار نہ ہوں۔

چونکہ اس موضوع پر گفتگو ناگزیر ہے، اس لیے ہم کہتے ہیں کہ جنگ میں گرفتار عورتوں (کنیزوں) میں ایک طرح کی مشترکہ ملکیت کا پہلو پایا جاتا ہے، لیکن اسلام کی رُو سے مالک اس مشترکہ ملکیت کو ختم کرکے اسے اس سے نجات دلاتا ہے، اس کی آبرو کی حفاظت کرتا ہے اور اسے آزادی کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

آج قیدیوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ انہیں اصطبل نما جگہوں میں جانوروں کی طرح رکھ کر طرح طرح کے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے، جس سے ظلم و ستم ڈھانے والوں کو خوشی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ایک اسرائیلی فوجی نے ایک فلسطینی نوجوان کے ساتھ جو برتاؤ کیا اسے ساری دنیا نے دیکھا۔ باقی اہل مغرب کی اجتماعی قتل وغارت گری کا تو ہر کسی کو علم ہے۔ اہل مغرب کے اس وحشیانہ سلوک کو دیکھنے کے بعد ان کی تنقید کا جائزہ لیں تو یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ اہل مغرب انسانیت کے مفہوم سے آشنا ہیں اور نہ ہی یہ جانتے ہیں کہ انسانوں کے ساتھ کیسے برتاؤ کیا جاتا ہے، اسی لیے وہ انسانوں کے ساتھ برتاؤ کے اسلامی تصور

کو نہیں سمجھ پاتے۔ چونکہ وہ انسانی معاملات کا ادراک نہیں رکھتے، اس لیے انسانی سلوک پر تنقید کرتے ہیں۔ در حقیقت اہل مغرب کی یہ ناواقفیت کوئی تعجب خیز بات نہیں، بلکہ سراسر ان کے مزاج کے مطابق ہے، لیکن تعجب تو مغرب کی تقلید کرنے والے اپنے ہم وطنوں کی جہالت پر ہے۔

وہ ہم سے جنگ میں گرفتار قیدیوں سے کس قسم کے برتاؤ کے امیدوار ہیں؟ کیا ہم انہیں آزاد کر دیں، تاکہ وہ دوبارہ مسلح ہو کر ہم پر حملہ آور ہوں؟ کیا ہم ان کے قیدیوں کے ساتھ یہ برتاؤ ایسے وقت میں کریں جب وہ ہمارے جنگی قیدیوں کو بدستور اپنی قید میں رکھتے ہیں؟ کیا وہ چاہتے ہیں کہ ہم سے اپنی مرضی کے مطابق جس طرح بھی بن پڑے اپنے قیدی رہا کرا لیں اور پھر ہم سے اس بات کے امیدوار بھی رہیں کہ ہم اپنی عظمت اور مروت کے پیش نظر ان کی قیدیوں کو رہا کر دیں؟ کیا یہ غفلت اور بے وقوفی نہیں ہے؟ اگر ہم دشمنوں کے دلوں میں رعب ڈالنے کے لیے کسی قسم کی تادیبی کاروائی نہیں کرنا چاہتے تو پھر ان سے جنگ کیوں کرتے ہیں؟ کیوں ہزاروں انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنتے ہیں؟ کیوں ہزاروں عورتوں کو بیوہ اور ہزاروں بچوں کو یتیم کرواتے ہیں؟

جو لوگ جنگ شروع کرتے ہیں وہ جنگ کے عواقب سے باخبر ہوتے ہیں اور اس کے نتائج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ جنگ میں شریک ہو کر قید ہونا بھی جنگ کا ایک نتیجہ ہے، لہٰذا کیا اسلامی اصولوں کی روشنی میں قیدیوں سے سلوک کرنا بہتر اور زیادہ انسان دوست رویہ نہ ہو گا؟ جس طرح دشمن ہمارے آدمیوں کو قیدی بناتے ہیں، اسی طرح ہم ان کے آدمیوں کو قیدی بناتے ہیں۔ اب ہم ان قیدیوں کے ساتھ کیسا سلوک کریں؟ کیا ہم انہیں آزاد کر دیں یا انہیں موت کے گھاٹ اتار دیں؟ نہیں، بلکہ ہم انہیں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیں گے اور جب وہ ان گھروں میں اسلام کا روحانی ماحول دیکھیں گے تو ان کے دل اسلام کی طرف مائل ہوں گے اور ان کے مسلمانوں کے ساتھ ذاتی تعلقات قائم ہوں گے۔ ایسا انسانی برتاؤ دیکھ کر وہ بغیر کسی جبر واکراہ کے بخوشی اسلام قبول کر لیں گے، تب اسلامی مروت کا مظاہرہ ہو گا اور ان کے لیے آزادی کی بہت سی صورتیں پیدا ہو جائیں گی۔ چونکہ ان کے مالک غلاموں کو آزاد کرنے کے

ثواب سے واقف ہیں، اس لیے وہ اپنے مسلمان بھائیوں کو کبھی بھی غلام بنا کر رکھنے کو پسند نہ کریں گے، مزید برآں بہت سے گناہوں کی توبہ کی پہلی شرط ہی غلام آزاد کرنا ہے، غرض اسلام میں غلاموں کو آزادی کی نعمت سے نوازنے کی بہت سی صورتیں ہیں۔

ہم قیدیوں کے ساتھ انسانوں جیسا برتاؤ کرتے ہیں، ان کی صحیح انسانی تربیت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دنیا اور آخرت کے درمیان اعتدلال پیدا کرنے میں ان کی مدد کرتے ہیں اور اسلام کی طرف ان کی راہنمائی کرنے کے لیے جو کچھ ہمارے بس میں ہوتا ہے کرتے ہیں، جس کے لیے سب سے پہلا اقدام ان کے ساتھ انسانوں جیسا برتاؤ ہے۔ محلات میں غلاموں خصوصاً کنیزوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا تھا۔ کیا ان محلات سے برے سلوک کی وجہ سے کبھی کسی عورت نے بھاگنے کی کوشش کی ہے؟ کیا ایسی ایک مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے؟ ہرگز نہیں، ایسی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔

آخر میں ہم اِس انسانی برتاؤ اور سلوک کے نتائج کا تاریخ کی روشنی میں جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاریخ سے ایک اصطلاح ''موالی'' کا پتا چلتا ہے۔ موالی ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو (خود یا ان کے آباء واجداد) غلام رہے ہوں اور پھر انہیں آزادی نصیب ہوئی ہو۔ موالی میں ایسی ایسی عظیم ہستیاں پیدا ہوئی ہیں، جن کا نام تا قیامت انتہائی احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا شمار بھی موالی میں ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ان سے اپنے نواسوں کی طرح محبت فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں باز نطینیوں کی سرکوبی کے لیے بھیجی جانے والی جنگی مہم جس میں حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ کرام بھی شامل تھے، کی قیادت سونپی۔ اس وقت ان کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ ان کے والد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ موتہ کی قیادت کرتے ہوئے شہادت پائی تھی۔

امام مالک جیسے شخص کی تربیت کرنے والے حضرت نافع رضی اللہ عنہ بھی موالی میں سے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی مرجانہ نامی ایک باندی تھی، جس سے انہیں شدید

محبت تھی، لیکن جب آیت مبارکہ ﴿لَن تَنَالُواْ الْبِرَّ حَتَّى تُنفِقُواْ مِمَّا تُحِبُّونَ﴾ (آلِ عمران: ۹۲) ''مومنو! جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمہیں عزیز ہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو گے کبھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے۔'' نازل ہوئی اور ان کے پاس اس سے زیادہ پسندیدہ کوئی چیز نہ تھی تو انہوں نے پسندیدہ چیزیں راہِ خدا میں خرچ کرنے والوں میں شمار ہونے کے لیے اسے قربِ الٰہی کے حصول کی خاطر آزاد کر دیا۔(54) پھر مرجانہ نے کسی شخص سے شادی کی اور اس کے ہاں حضرت نافع پیدا ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ان سے محبت کرتے اور انہیں اپنے سینے سے لگاتے۔ انہوں نے حضرت نافع کی تربیت کی اور انہیں علم کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچایا۔ وہ خود بھی امت کے عظیم عالم تھے۔ عالم اسلام کا یہ درخشندہ ستارہ بھی موالی میں سے تھا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، مسروق اور طاؤس بن کیسان وغیرہ بہت سی عظیم ہستیاں موالی تھیں حتی کہ اموی دور کے دو علماء نے ایک مذاکرے میں اکاون علماء کا تذکرہ کیا، جن میں سے پچاس موالی تھے۔ اگر یہ محلات ایسی شخصیات تیار کرتے تھے (جو کہ ایک حقیقت ہے) تو ہمیں چاہیے کہ کچھ عرصے کے لیے اپنی آزادی سے دستبردار ہو کر وہاں تربیت حاصل کریں اور پھر دوبارہ اپنی آزادی حاصل کر لیں، لہٰذا ہم اس سلسلے میں کسی قسم کی تنقید کا جواز نہیں پاتے، ہمیں بغیر دلیل کے قائم کردہ خیالات سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہیے۔

بعض لوگ سلطان عبد الحمید ثانی کو "السلطان الاحمر" (خونی بادشاہ) کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ کیا سلطان عبد الحمید ثانی واقعی ایسے شخص تھے؟

جب سلطان عبد الحمید نے زمام اقتدار سنبھالی تو پوری سلطنت مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔ اس پہلو سے وہ حضرت علی بن ابی طالب کرار کرم اللہ وجہہ اور ان کے دورِ خلافت سے گہری مماثلت رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے عظیم مفکر بدیع الزمان سعید نورسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "اس دور کے بڑے بڑے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسی عظیم شخصیت کی ضرورت تھی اور انہوں نے واقعتہً ان فتنوں کا جوانمردی سے سامنا کیا۔"

امویوں کے شدت پسندانہ رویے اور خوارج کے بھڑکائے ہوئے فتنوں کی وجہ سے معاشرہ سخت بے چینی کا شکار تھا، لہٰذا ان مشکلات پر قابو پانے کے لیے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ جیسے ایثار اور اخلاص کے جذبے سے سرشار، دنیا سے بے رغبت اور اسے بے وقعت سمجھنے والے عظیم انسان کی ضرورت تھی۔ شاید اسی لیے تقدیر نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کو اس بے چین دور تک مؤخر کیا، یہی بات عبد الحمید ثانی کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ ان کا دور بھی فتنوں اور فساد کا دور تھا اور وہ بالاتفاق بڑے ذہین، ہوشیار اور باتدبیر انسان تھے۔ بعض مؤرخین بغیر کسی ظاہری سبب کے اختیار کردہ ان کی بعض تدابیر کو ان کے تخیلات کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے انہیں تخیلات کی دنیا میں رہنے والا انسان سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف بعض غیر معتدل اور بے ادب لوگ انہیں بزدل شخص تصور کرتے ہیں۔

جب انہوں نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی تو سلطنت کا منظر نامہ کچھ یوں تھا: تیونس میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ ہنڈیا کی طرح کھول رہا تھا۔ فرانسیسی اور اطالوی مراکش میں دراندازی کرکے فتنے کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ مصر کسی بہت بڑی تبدیلی کا عندیہ دے رہا تھا اور عرب بے چین تھے، غرض کسی بھی عالمی جنگ میں شریک ہونے کی صورت میں ترکی کی شکست کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔

جزیرہ کریٹ کے حالات بھی کچھ مختلف نہ تھے۔ وہاں متعین حکام کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے اور فوج بے بس تھی، کیونکہ مغرب خوفناک بلا کی مانند وہاں پنجے گاڑھے بیٹھا تھا اور اس کا جزیرے سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ بلقان میں روس واضح طور پر مداخلت کر کے فتنوں کو ہوا دے رہا تھا، جبکہ سلاوی اہل بلغاریہ کے ذریعے بلقانی اقوام کو سلطنت عثمانیہ سے علیحدگی اختیار کرنے پر اکسا رہے تھے۔

اناطولیہ میں "دونمہ" (55) نامی گروہ سرگرم تھا۔ اگرچہ انہوں نے اپنے نام محمد اور علی رکھ لیے تھے، لیکن ان کے باطن میں تبدیلی آئی تھی اور نہ ہی ان کا بغض ختم ہوا تھا۔ یہ بغض اور غصہ ہر طرف فتنے کی آگ بھڑکانے کے لیے کافی تھا۔ جس طرح مدینہ منورہ میں یہودی رسول اللہ ﷺ کے اور ابن سبا اور اس کا گروہ حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے دور میں اسلام کا شدید دشمن تھا، اسی طرح دونمہ سلطان عبدالحمید کے شدید ترین دشمن تھے۔ مدحت پاشا کا تعلق دونمہ سے ہی تھا۔ اسے یورپ کی پشت پناہی حاصل تھی اور فتنے کی آگ بھڑکانے میں وہ اپنا کردار ادا کرتا تھا۔ آرمینیوں نے ملک کے اندر اور باہر مخالفت کا محاذ کھول رکھا تھا۔ سریانی بھی بپھرے ہوئے تھے۔ بعض ایسی اقوام اور عناصر جو صدیوں تک ہمارے ساتھ شانہ بشانہ جنگ میں شریک ہوتی رہی تھیں اب ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ ان تمام مشکلات سے کامیابی کے ساتھ نبٹنا کچھ آسان نہ تھا، اسی لیے سلطان عبدالحمید کا تینتیس سال تک سلطنت کو قائم رکھنے میں کامیاب ہونا بذاتِ خود بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اگر وہ اور کوئی اور خدمت نہ بھی سرانجام دیتے تب بھی ان کی صرف یہی کامیابی ان کی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کافی تھی۔ ان کے مخالفین سخت دل اور بے رحم تھے، جبکہ ان کے اردگرد کوئی دوست تھا اور نہ کوئی باصلاحیت حکومتی اہلکار۔ وہ ظالم نہ تھے، بلکہ جو نظم وضبط ان کی شخصیت کی خصوصیت تھی اسے معاشرے پر نافذ دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے معاشرے کی ایک ایک زوال پذیر اکائی کو ایسے نظام میں ڈھالنے کی کوشش کی، جس سے وہ مزید زوال اور پستی کا شکار ہونے سے بچ سکے، دوسرے لفظوں میں اگر معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن نہ ہو سکے تو کم از کم مزید ابتری کا شکار تو نہ

ہو۔ ایسی صورتحال ان سے سختی سے نظم و ضبط کی پابندی کرانے کی متقاضی تھی، لیکن اس کے باوجود ہمارے بعض پسندیدہ اور قابل احترام ادیبوں اور شعراء نے سلطان عبدالحمید کی شخصیت کا غلط اندازہ لگایا اور اپنے مضامین اور اشعار میں ان پر تنقید کی، تاہم جب انہوں نے ان کے بعد سلطنت کے سقوط کا مشاہدہ کیا تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے اس پر معذرت کی۔ سلطان محمد فاتح کے سوا کسی بھی عثمانی سلطان نے علوم و فنون کی ایسی خدمت نہیں کی جیسی خدمت سلطان عبدالحمید نے کی۔ علوم و معارف کی خدمت کے پہلو سے ان کی شخصیت نابغۂ روزگار تھی۔ جدید طرز پر مدارس کے قیام کا آغاز پہلی دفعہ انہی کے دور میں ہوا۔ کاباطاش اور کوللی ان مدارس میں سے صرف دو نام ہیں، جو انہوں نے استنبول میں کھولے تھے۔(56) سلطان عبدالحمید پہلے سلطان تھے، جنہوں نے سنجیدگی سے عالم اسلام کے ساتھ گفت و شنید کا آغاز کیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے حجاز میں مدینہ منورہ تک ریل کی پٹڑی بچھائی، یہی وجہ ہے کہ سلطان سلیم کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا سہرا ان کے سر جاتا ہے، کیونکہ سلطان سلیم کی فتوحات کے ثمرات عالم اسلام کے ساتھ عملی گفت و شنید اور قرب کی کوششوں کے بغیر حاصل نہیں کیے جاسکتے تھے، لیکن چونکہ سلطان سلیم کے دور میں اس کے لیے حالات سازگار نہ تھے، اس لیے یہ سعادت سلطان عبدالحمید کے حصے میں آئی اور پٹڑی بچھانے کا خواب سلطان عبدالحمید کے دور میں پورا ہوا۔

آج باسفورس پر بچھائے گئے پل(57) کی تعریف کے گن گائے جاتے ہیں حتی کہ بعض لوگ اسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ قرار دیتے ہیں، لیکن اس کا ڈیزائن سلطان عبدالحمید کے دور میں تیار ہوا تھا، جو سلطان کی دوراندیشی اور اصابت رائے کی دلیل ہے، تاہم حالات نے انہیں اس پل کی تعمیر کا موقع نہ دیا اور اس کے مکمل خاکے الماریوں میں ہی پڑے رہ گئے، جن کے بارے میں بعض محقق مؤرخین نے کچھ ہی دن پہلے اخبارات میں انکشاف کیا ہے، جس کے نتیجے میں سلطان عبدالحمید کی فراست اور بھی مبرہن ہو جاتی ہے۔

سلطان کے آس پاس موجود لوگوں میں سے کوئی بھی ان کے مستقبل کے خیالات کی قدر و قیمت نہ جان سکا، جس کی وجہ سے بہت سی مشکلات اور غلط فہمیوں نے جنم لیا۔ ان کے اقدامات

آئندہ پچاس سالوں کو سامنے رکھ کر اٹھائے گئے تھے، لیکن ان کے ارد گرد موجود حکومتی اہلکار کوتاہ نظر واقع ہوئے اور انہیں صحیح طریقے سے نہ سمجھ سکے۔ یہ صورتحال آج بھی جوں کی توں قائم ہے۔ بعض حکومتی اہلکار آئندہ دس سالوں کو مد نظر رکھ کر تجاویز اور افکار پیش کرتے ہیں، لیکن ان کی یہ کوششیں ان کے رفقا کے ہاتھوں سبوتاژ ہو جاتی ہیں۔

انہیں ''السلطان الاحمر'' (خونی بادشاہ) کہا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فرانسیسیوں کے وضع کردہ اس لقب کو سلطان کے بارے میں مثبت تاثر پیدا کرنا چاہیے تھا، کیونکہ فرانسیسی ترکوں کے بہی خواہ نہ تھے۔ غرض فرانسیسیوں کے اس بہتان کو ہمارے ہاں کے بعض ان بدبختوں نے ہماری زبان میں رائج کیا جو اپنے آباء واجداد کو برا بھلا کہنے پر فخر محسوس کرتے ہیں، لیکن تاریخ ثابت کر دے گی کہ سلطان عبدالحمید انتہائی ذہین و فطین انسان تھے یا سلطان احمر (خونی بادشاہ)، بلکہ تاریخ نے یہ ثابت کرنا شروع بھی کر دیا ہے، کیونکہ سلطان کا اس لقب سے دور یا قریب کا کوئی تعلق نہیں۔

مدحت پاشا نے اپنے ساتھیوں سے مل کر سلطان عبدالحمید کے چچا سلطان عبدالعزیز کو قتل کیا اور پھر اس جرم کو چھپانے کے لیے یہ دعویٰ کیا کہ سلطان نے خودکشی کی ہے۔ اس جرم کو خودکشی کے طور پر پیش کرنا اتنی کمزور بات ہے کہ اس کے ذریعے کسی بچے کو بھی دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ جب سلطان عبدالعزیز کو قتل کیا گیا تو اس کی دونوں کلائیوں کی شریانوں کو کاٹا گیا اور یہ دعویٰ کیا گیا کہ انہوں نے اس طریقے سے خودکشی کی، لیکن اگر انہوں نے اپنی ایک کلائی کو کاٹ دیا تو ان کے لیے دوسری کلائی کو کاٹنا کیسے ممکن ہوا؟ نیز ان کی گردن کی بعض شریانیں بھی کٹی ہوئی تھیں۔ اس بات کا خودکشی کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ مزید برآں انہیں خودکشی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے۔

پھر اس بارے میں ایک تحقیقاتی کمیٹی تشکیل دی گی۔ اس کمیٹی نے متعلقہ رپورٹوں کا جائزہ لینے کے بعد مدحت پاشا اور اس کے ساتھیوں کو مجرم قرار دیا اور انہیں پھانسی کی سزا سنائی۔ سلطان

عبد الحمید کو کیونکر سلطان احمر (خونی بادشاہ) کہا جا سکتا ہے، جبکہ انہوں نے اپنے چچا کے قاتل اور اپنے شدید ترین دشمن کے پھانسی کے احکام کو تاحیات قید کی سزا میں تبدیل کرنے کے لیے اپنے اختیارات کو استعمال کیا اور اسے طائف میں نظر بند کر دیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دونمہ سے تعلق رکھنے والے مدحت پاشا کو بچانے اور قید سے فرار کرانے کی کوششوں کے بارے میں بین الاقوامی خفیہ اطلاعات ملنے لگیں، جن کے نتیجے میں سلطان عبد الحمید نے طائف کے گورنر کو سخت ہدایات دیتے ہوئے کہا کہ اگر مدحت پاشا جیل سے فرار ہوا تو اس خطرناک غفلت کی تمام تر ذمہ داری اس پر عائد ہو گی۔

گورنر کو آئے روز فرار کی ان کوششوں کے بارے میں اطلاعات مل رہی تھیں، جن سے آخر وہ تنگ آ گیا، لہٰذا اس بات کا احتمال موجود ہے کہ ممکنہ سزا سے بچنے کے لیے اس نے جیل میں خود ہی مدحت پاشا کا گلا گھونٹوا دیا ہو، لیکن اس واقعے کا سلطان عبد الحمید سے دور یا قریب کا کوئی تعلق نہیں، حالانکہ وہ اس کی پھانسی کے احکامات پر بھی عملدرآمد کروا سکتے تھے، خصوصاً جبکہ مدحت پاشا نے ایک اجنبی ملک میں پناہ لینے کی کوشش بھی کی تھی، جو کہ خیانت کے مترادف ہے۔ سلطان عبد الحمید اس قدر رحم دل تھے کہ رحمدلی ان کی نفسیاتی بیماری بن گئی تھی۔ وہ کسی بھی انسان کا خون نہیں بہانا چاہتے تھے۔ یہی رحمت و شفقت تھی، جس نے انہیں "جیش الحرکت" (58) کا مقابلہ کرنے سے باز رکھا۔

محمود پاشا (59) فہم و فراست سے عاری انسان تھا۔ اسے امور سلطنت کے بارے میں ایک کاشتکار سے زیادہ علم نہ تھا۔ وہ پارلیمنٹ میں بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔ پارلیمینٹ کے سربراہ بعض اوقات غیر ملکی مہمانوں کے سامنے شرمندگی سے بچنے کے لیے اسے بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ ملکی معاملات اور ملک کو درپیش مشکلات کے بارے میں اس قدر غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرنے والے شخص نے اپنے ارد گرد ان بدیسی لوگوں (60) کو جمع کر لیا تھا، جنہیں اس نے سلانیک سے استنبول بلایا تھا۔ جب محل کے حفاظتی دستے کے سربراہ یلدز کو یہ خبر ملی تو وہ فوراً سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس لشکر کو منتشر کرنے کی اجازت مانگی۔ سلطان کو اس معاملے کی شروع

سے خبر تھی، لیکن انہوں نے اپنے حفاظتی دستے کے کمانڈر کی تجویز کو قبول نہ کیا اور یہ کہہ کر اس کی درخواست کو رد کر دیا کہ میں اپنی قوم کا خون بہانے کی کبھی اجازت نہ دوں گا، جبکہ دوسری طرف جیش الحرکت عسکری نظم وضبط سے عاری تھا۔ اس کی قیادت کا محمود پاشا کے ہاتھ میں ہونا اس بات کی کھلی دلیل تھی۔ اس لشکر کے اکثر سپاہیوں کو استنبول آنے کی غرض وغایت ہی معلوم نہ تھی، بلکہ بعض کا تو یہ خیال تھا کہ وہ سلطان کی مدد کے لیے آئے ہیں۔

سلطان صرف اور صرف اپنی رحمت و شفقت کی بھینٹ چڑھے۔ اگر وہ جمعیت اتحاد و ترقی (Union and Progress Committee) کی پر تشدد کاروائیوں کے بارے میں اس قدر انسانی اور رحمدلانہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتے تو ان کا ردِ عمل یقیناً کچھ اور ہوتا۔

مزید بر آں ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتحادی اس قدر مصائب و آلام کا باعث بنیں گے، دوسرے لفظوں میں وہ قوم کی قیادت کی دعویدار اس جماعت سے ان کاموں کی توقع نہ رکھتے تھے، جن کا اس سے ظہور ہوا۔ وہ انہیں اپنی انسانی سوچ کے آئینے میں دیکھتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ ان کا بھائی رشاد انہی کے نقش قدم پر چلے گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ہاں توکل کا پہلو حسنِ تدبیر کے پہلو پر غالب تھا، جس کے نتیجے میں وہ اپنی مروت کی بھینٹ چڑھ گئے۔

سلطان عبد الحمید ثانی کی زندگی کا ایک روحانی پہلو بھی ہے۔ جس طرح انہوں نے سیاست کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا تھا، اسی طرح روحانیت کے میدان میں بھی ان کا مقام بہت بلند تھا۔ ایسے منصب پر فائز بہت کم لوگ دنیا اور آخرت کے درمیان توازن قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ایسے تھوڑے سے لوگوں میں سلطان عبد الحمید ثانی بھی شامل تھے۔ جب ہم حج کے لیے گئے تو وہاں ایک عمر رسیدہ شخص ہماری خدمت کیا کرتا تھا۔ جب اس نے ہم سے سلطان کا نام سنا تو شدتِ احترام سے کانپ اٹھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ سلطان نے کئی حج کیے تھے۔ اس نے ہمیں سلطان کی ٹھہرنے کی جگہوں کے نام بھی بتائے، حالانکہ بظاہر سلطان نے ساری عمر ایک بھی حج نہ کیا تھا۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا سب سے پہلے فرانسیسیوں نے ان کے لیے "السلطان الاحمر Le Sultan Ruj" (خونی بادشاہ) کا لقب استعمال کیا اور آرمینیوں نے اپنے اخبارات میں اس کی نشر و اشاعت کی، لہٰذا اس لقب کو استعمال کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ وہ کس منہ سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ انہیں اس کا تذکرہ کرنے پر شرم آنی چاہیے۔ وہ کور چشم چمگادڑوں کے لیے واقعی سلطان احمر (خونی بادشاہ) تھے، لیکن ہمارے لیے عظیم بادشاہ تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی وسیع جنت میں ٹھکانہ عطا فرمائے۔ (آمین)

یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہیں اور ہر جگہ موجود بھی ہیں؟

اللہ تعالیٰ ایک اور یکتا ہیں، لیکن اپنے علم اور قدرت کی بدولت ہر جگہ اور ہر وقت موجود ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ دوسرے اجسام کی طرح وہ بھی کسی خاص مکان کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ایک اور یکتا کہہ کر ہم ان کی جلالتِ شان اور عظمت کا اظہار کرتے ہیں اور جب ہم کہتے ہیں کہ وہ ہر جگہ موجود ہیں تو ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی رحمت و رحیمیت اور علم و قدرت کے ساتھ ہر جگہ موجود ہیں۔ اللہ کے لیے مثلِ اعلیٰ ہے، لیکن بلا تشبیہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ سورج کی ان شعاعوں کی مانند ہیں، جو اگرچہ ہمارے سروں کو چھو رہی ہوتی ہیں، لیکن وہ ہماری پہنچ سے بہت دور ہوتی ہیں، دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے ذریعے ہمارا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور ہم سے ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں، لیکن ہم اس کی عظمت کو نہیں پا سکتے۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ (ق:١٦) "اور ہم تو رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب خدا تعالیٰ ہر جگہ حاکم و نگران ہیں، لیکن وہ کیف و کم سے پاک ہیں۔ وہ ﴿يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ﴾ (الأنفال:٢٤) "آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔" لہٰذا وہ مجھ سے میرے دل سے زیادہ قریب ہیں۔ اگر میں کہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے دل میں ہیں تو یہ درست ہو گا، کیونکہ وہ میرے بارے میں خود مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، نیز ﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَكِنَّ اللَّهَ رَمَى﴾ (الأنفال:١٧) "اور اے نبی جس وقت تم نے کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں۔" سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر اور دیگر مواقع پر رسول اللہ ﷺ کے نام پر خود رمی کی تھی، لہٰذا بشمول رمی کے اللہ تعالیٰ ہر چیز پر اثر انداز ہیں۔ مذکورہ بالا آیت جیسی آیات کی رُو سے اللہ تعالیٰ اپنی قدرت، علم، رحمانیت، رحیمیت، جمال، جلال، علم، ارادہ اور دیگر تمام صفات کے ذریعے نہ صرف ہر جگہ موجود ہیں، بلکہ حاکم و نگران ہیں۔

لیکن اس کے باوجود متعدد آیات اور کائناتی حقائق کی رو سے اللہ تعالیٰ ایک اور یکتا ہیں۔ اگر نعوذ باللہ دو معبود ہوتے تو زمین و آسمان میں فساد برپا ہو جاتا۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ﴾(الأنبياء:٢٢) "اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین اور آسمان درہم برہم ہو جاتے۔ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں تو اللہ جو مالک عرش ہے ان باتوں سے پاک ہے۔" یعنی ستارے آپس میں ٹکرا کر پھٹ جاتے، ایٹموں کا ایک دوسرے سے تصادم ہو جاتا اور زمین پر پڑنے والی سورج کی شعاعوں سے یورینیم کی شعاعوں کے تعاملات کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا، جس کے نتیجے میں روئے زمین پر کوئی ذی روح چیز زندہ نہ رہتی۔

قدیم علمائے کلام اس دلیل کے لیے "برہان التمانع" کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اس دلیل کی رُو سے اللہ تعالیٰ ایک ہیں اور دو معبودوں کا وجود ناممکن ہے، کیونکہ کسی معمولی سی چیز مثلاً کشتی وغیرہ کے چلانے میں بھی اگر دو ہاتھ کار فرما ہوں تو اس کا انجام اضطراب کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کسی گاڑی میں دو اسٹیرنگ لگا کر اسے دو ڈرائیوروں کے حوالے کر دیا جائے تو بہترین شاہراہ پر بھی اس کا نتیجہ حادثے کی صورت میں ہی نکلے گا، لہٰذا کائنات کا نظام بھی دو مستقل اور آزاد ارادوں کے ماتحت ہوتا تو اس کا انجام بھی تباہ کن ہوتا۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس عظیم الشان اور انتہائی منظم کائنات میں عالم کبیر یعنی کائنات سے لے کر عالم متوسط یعنی انسان اور عالم صغیر یعنی ایٹم تک ہر چیز میں کوئی مخفی تقدیر کارفرما ہے۔ ان تمام عالموں میں موجود نظم و ضبط اور ہم آہنگی کسی مبنی بر علم منصوبہ بندی کے بغیر ممکن نہیں پھر اسے منصوبے کے دائرے سے وجود کے مرحلے میں لانے کے لیے قدرت اور ارادے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے بعد یہ نظام مسلسل نگرانی اور دیکھ بھال کا محتاج ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ سب کچھ صرف ایک ذات کے زیر انتظام وقوع پذیر ہو حتیٰ کہ انسان بھی اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ اس انسانی رویے کو قانونِ دفعِ مداخلت سے موسوم کیا جاتا ہے، لہٰذا اس عظیم کائنات کے پیچیدہ اور باہم مربوط معاملات کے نظام سے متعلق خدائی معاملات میں کوئی اور شخص کیسے مداخلت کر سکتا ہے؟

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اگر اس کتابِ فطرت یا کارخانۂ قدرت میں دو ہاتھ کار فرما ہوتے تو ساری کائنات کا نظام درہم برہم ہو جاتا، لیکن چونکہ اس کا نظام درہم برہم نہیں ہوا، بلکہ وہ انتہائی منظم ہے، اس لیے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا خالق ومالک ایک اور یکتا ذات ہے۔ اب ہم اس موضوع کو وجدانی پہلو سے دیکھتے ہیں۔

ہمارے گردوپیش میں داخلی اور واقعی سطح پر رونما ہونے والے واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہمارا اسہارا اور ٹھکانہ ہیں، کیونکہ میں اپنے آپ کو عاجز و درماندہ سمجھ کر اپنے ہاتھوں کو گڑگڑاتے ہوئے ایسے بلند کرتا ہوں، جیسے میں کسی ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں کسی ٹوٹی ہوئی لکڑی پر بیٹھا پکار رہا ہوں: ''اے میرے پروردگار!'' اس دوران میں اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ کوئی ذات میری پکار سن رہی ہے، لیکن میری پکار سننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ ذات ہر جگہ حاضر وناظر اور سارے جہانوں کی پالن ہار ہو، کیونکہ جس وقت وہ میری آہ وبکا کو سن رہی ہوتی ہے، عین اسی وقت وہ ایک چیونٹی کی التجا بھی سن رہی ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ چیونٹی سے اس کی ذات کی بہ نسبت زیادہ قریب ہیں۔ دنیا بھر میں مقبولِ عام دعاؤں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: ''ایک دفعہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ صلاۃ الاستسقاء کے لیے نکلے، اسی دوران میں انہوں نے ایک چیونٹی کو دیکھا کہ وہ ایک ٹانگ اٹھائے بارش کی دعا کی رہی ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: ''لوٹ جاؤ۔ تم پر بارش ہونے ہی والی ہے۔ اس چیونٹی نے بارش کی دعا مانگی ہے جسے شرف قبولیت حاصل ہو چکا ہے۔''(61) دنیا کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر اس کے حضور اپنی ضروریات پیش کرتی ہے اور اس سے گڑگڑا کے دعا مانگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ دعاؤں کو قبول فرماتے ہیں اور درج ذیل آیت مبارکہ میں اس حقیقت کا اظہار فرماتے ہیں: ﴿أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ﴾ (النمل:٦٢) ''بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے۔'' نیز ہمارے ضمیر بھی اس بات کی گواہی دیتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہیں، ہر آواز سنتے ہیں، ہر چیز کے حال سے واقف ہیں، سب کی ضروریات پوری فرماتے ہیں اور اپنی صفت رحمانیت اور رحیمیت کے

ذریعے سب کے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔وہ عظیم پر جلال اور زبردست قوت کے مالک ہیں۔انہیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، بلکہ اکیلے ہی ہر کام سرانجام دینے پر قدرت رکھتے ہیں۔ان کی عظمت، جلال اور وحدانیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے لیے جنت کی تخلیق اتنی ہی آسان ہے جتنا کہ موسم بہار کو وجود بخشنا۔وہ ہر جگہ موجود ہیں اور ہر چیز کو دیکھتے سنتے ہیں، لیکن کسی جسم کی مانند کوئی جگہ نہیں گھیرتے، ہر جگہ موجود ہونے کے باوجود اپنے اسمائے حسنیٰ اور صفات عالیہ کی بدولت ہر قسم کے کیف و کم سے پاک ہیں۔یہ اس کے جمال، احدیت، رحمانیت اور رحیمیت کی ایک تجلی ہے۔

اس کی ایک دلیل ملاحظہ فرمایئے: اگر میری آنکھوں کی رطوبت خشک ہو جائے اور اس میں رطوبت نہ رہے تو میں آنکھوں کے خشک ہونے کے مرض (Dry Eye) میں مبتلا ہو جاؤں گا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر لحظہ میری آنکھ کی نگرانی کرتے ہیں اور اسے بیماری سے محفوظ رکھنے کے لیے مرطوب رکھتے ہیں، لہٰذا ان تمام امور کے سرانجام دیئے جانے کے لیے کسی ایسی ذات کا وجود ناگزیر ہے، جس نے مجھے دیکھنے کے لیے آنکھیں عطا کیں اور جو کچھ میری آنکھیں دیکھتی ہیں وہ اس سے باخبر ہے، نیز کوئی ذات ہے جو کھانے کے دوران ہمارے لقموں کو قابل ہضم بنانے کے لیے انہیں مرطوب بناتی ہے، معدے کی طرف خفیہ پیغام بھیجتی ہے، جبڑوں کو حرکت میں لاتی ہے اور زندگی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے خلیوں کو ان کی ضرورت کے مطابق غذا بہم پہنچاتی ہے، اسی لیے ہم کہتے ہیں: ''ہمارے پروردگار کے اسمائے حسنیٰ اس کی رحمانیت اور رحیمیت کی صورت میں ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔'' اگر اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود نہ ہوتے اور ہمیں دیکھ اور سن نہ رہے ہوتے تو لقمہ ہمارے منہ میں سوکھ جاتا اور پتھر کی مانند بن کر ہمارے معدے میں اترتا، نیز غذا خلیوں تک متوازن انداز میں نہ پہنچ پاتی۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے ہماری جانوں سے زیادہ قریب ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے اسمائے حسنیٰ کی تجلیات کی بدولت ہم سے ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں، گو ہم اپنی بشری خصوصیات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے بہت دور ہیں، تاہم ان دونوں صورتوں میں ہم آہنگی کیسے پیدا کی جاسکتی ہے؟

ہم اس کی وضاحت ایک مثال سے کرتے ہیں: سورج ہم سے بہت قریب ہے، لیکن ہم اس سے بہت دور ہیں۔ اگرچہ سورج ایک ہی ہے، لیکن اس کی مختلف قسم کی طویل کرنیں ہر روز ہمارے سروں کو نرمی سے چھوتی اور ہمارے لیے درختوں پر لگے پھلوں کو پکاتی ہیں۔ سورج کی حرارت، روشنی اور رنگ اس کی مختلف صفات کی طرح ہیں۔ اگر اس کی حرارت میں قدرت، روشنی میں علم اور سات رنگوں میں سماعت وبصارت جیسے حواس ہوتے تو سورج ہم سے ہماری جانوں سے زیادہ قریب ہوتا اور ہم میں مختلف قسم کے تصرفات کرتا، حالانکہ وہ ایک کثیف مادی جسم ہے۔ اس میں ہر دم ہائیڈروجن ہیلیم میں تحویل ہوتی رہتی ہے۔ کروڑوں ٹن ہائیڈروجن کے ہیلیم میں تبدیل ہونے سے روشنی اور شعاعوں کی صورت میں بہت زیادہ توانائی پیدا ہوتی ہے، حالانکہ سورج محض ایک مادی جسم ہے، جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مادے سے منزہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ روشنی ہیں نہ شعاع ہیں اور نہ ہی ایٹم ہیں، بلکہ ان تمام موجودات کے خالق ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز سے مختلف ہیں۔

اللہ تعالیٰ نور کو روشنی اور شکل وصورت عطا کرنے والے ہیں، اس کا سرچشمہ اور اس کے خالق ہیں۔ ہر قسم کے انوار، روشنیاں، حرارت اور رنگ ان کے دست قدرت میں ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق سورج کی یہ حالت ہے تو ازل سے موجود وحدہ لاشریک خدا کے ہر جگہ حاضر وناظر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

فرشتے اور جنات ایک وقت میں مختلف مقامات پر موجود ہو سکتے ہیں، نیز ابلیس تنِ تنہا ایک لحظے میں وسوسہ ڈال کر بہت سے لوگوں پر اثرانداز ہو سکتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی بعض حقیر اور عاجز مخلوقات میں یہ صلاحیت موجود ہے تو حی وقیوم خدا کے اسمائے حسنیٰ ہر جگہ جلوہ گر ہو کر ہر چیز پر نگاہ کیوں نہیں رکھ سکتے؟

قلب سلیم کیا ہے؟

لفظ سلیم کا ماخذ فعل سَلِم ہے، جو لفظ اسلام کا ماخذ بھی ہے۔ قلب سلیم کا لغوی معنی ہے ایسا دل جو ہر قسم کی بیماری اور عارضہ سے محفوظ ہو، تاہم اصطلاح میں اس سے مراد ایسا دل ہے، جو اسلام کے سوا کسی چیز سے آشنا نہ ہو۔

قلب سلیم والا بننے کے لیے قرآنِ کریم میں بیان کردہ مؤمنانہ اخلاق کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک عمومی تعریف ہے، جس میں بہت سے امور داخل ہیں۔ حضرت سعد بن ہشام بن عامر سے مروی ہے کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: ''اے ام المؤمنین! مجھے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کے بارے میں بتائیے؟'' انہوں نے فرمایا: ''آپ ﷺ کے اخلاق قرآن (کا نمونہ) تھے۔ کیا تم قرآنِ کریم میں ارشادِ خداوندی ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (القلم: ۴) ''اور یقیناً تم اخلاق کے اعلی مرتبے پر ہو۔'' نہیں پڑھتے؟'' (62) قرآنِ کریم اسی لیے نازل ہوا تا کہ پہلے رسول اللہ ﷺ اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالیں اور پھر آپ ﷺ کی پیروی میں آپ کی امت اپنی زندگی، افکار اور تصورات کو اس کے مطابق سنوارے، نیز ہم دیکھتے ہیں کہ قلبِ سلیم دوسروں کو ایذا پہنچانے سے مکمل اجتناب کرنے والا دل ہوتا ہے، کیونکہ حدیث نبوی میں ہے: ''حقیقی مسلمان وہ ہے، جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہیں۔'' (63) اگرچہ یہ مخصوص تعریف ہے، لیکن اسے امتیازی حیثیت حاصل ہے، لہٰذا مسلمان پر لازم ہے کہ وہ کسی بھی انسان کو زبان یا ہاتھ سے ایذا نہ پہنچائے۔ قرآن کریم میں قلبِ سلیم کی تعبیر صرف دو مقامات پر استعمال ہوئی ہے اور دونوں مقامات پر اس کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے۔ حضرت ابراہیم اپنی قوم کی گمراہی اور کجروی خصوصاً اپنے باپ کی حالت زار پر سخت دکھی تھے۔ ان کا اپنے والد کے بارے میں اس قدر اہتمام بالکل طبیعی اور فطری تھا۔ ہر شخص فطری طور پر اپنے خاندان اور عزیز واقارب سے محبت کرتا اور ان کا خیال رکھتا ہے اور جس قدر کوئی شخص قریب ہوتا ہے، اسی قدر اس سے محبت زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی بھی نیک بیٹا اپنے باپ کے گمراہ ہونے کو پسند نہیں کر سکتا، بلکہ اسے اس پر شدید کرب و الم ہو گا،

خصوصاً جبکہ اس کی طبیعت میں اولوالعزم نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسی پاکیزگی اور حساس مزاجی پائی جاتی ہو، یہی وجہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کی خاطر بہت دردمند تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم اور باپ کو دین توحید کی دعوت دیتے تھے، لیکن ان کی قوم بشمول ان کے باپ کے ہٹ دھرمی کرتی رہی اور اس بنیاد پر انکار کرتی رہی کہ ہم نے اپنے آباءواجداد کو بتوں کی پوجا کرتے دیکھا ہے۔ ہر دور میں جب بھی کوئی قوم حق اور حقیقت سے راہِ فرار اختیار کرنا چاہتی تھی تو وہ یہی عذرِلنگ پیش کرتی تھی۔ اس ہٹ دھرمی کو دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کے سامنے ہاتھ پھیلا کر یہ دعا کی: ﴿رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْماً وَأَلْحِقْنِيْ بِالصَّالِحِيْنَO وَاجْعَل لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِيْ الْآخِرِيْنَO وَاجْعَلْنِيْ مِن وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِOوَاغْفِرْ لِأَبِيْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّيْنَO وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَO يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُوْنَO إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾ (الشعراء: ۸۳۔۸۹)

"اے پروردگار! مجھے علم و دانش عطا فرما اور نیکوکاروں میں شامل فرما اور بعد والے لوگوں میں میرا ذکر نیک باقی رکھیو اور مجھے نعمت کی بہشت کے وارثوں میں شامل کیجیو اور میرے باپ کو بخش دے کہ وہ گمراہوں میں سے ہے اور جس دن لوگ اٹھا کھڑے کیے جائیں گے مجھے رسوا نہ کیجیو، جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے، ہاں جو شخص اللہ کے پاس بے روگ دل لے کر آیا وہ بچ جائے گا۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام قلب سلیم کے مالک تھے اور آیت مبارکہ ﴿وَإِنَّ مِن شِيْعَتِهِ لَإِبْرَاهِيْمَOإِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ﴾(الصفات:۸۳۔۸۴)"اور انہی کے پیروؤں میں ابراہیم تھے، جب وہ اپنے پروردگار کے پاس عیب سے پاک دل لے کر آئے۔" سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ جیسا کہ گزشتہ آیت مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس بات پر زور دیتے تھے کہ قیامت کے دن صرف قلب سلیم والے لوگ ہی فائدے میں رہیں گے، جس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس دن کافر دل والا کبھی بھی امن و سلامتی کے کنارے نہیں پہنچ سکے گا۔ اگر کسی کافر کا بیٹا حضرت ابراہیم جیسا بلند رتبہ نبی بھی ہو اتب بھی اسے اس کا کوئی

فائدہ نہ پہنچے گا۔ اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل اور بہت سے انبیائے کرام کے باپ ہیں حتی کہ سید الرسل حضرت محمد ﷺ کو ان کے ساتھ مشابہت پر فخر تھا، لیکن اس قدر جلیل القدر نبی کے لیے بھی اپنے کافر باپ کو نفع پہنچانا ممکن نہ تھا۔

اگر ہم اس پہلو سے قلب سلیم کے موضوع پر سوچیں تو اس کا مفہوم اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ قلب سلیم کا کفر و شرک، شکوک و شبہات اور تذبذب سے پاک ہونا ناگزیر ہے۔ کافر شخص کا رویہ کتنا ہی انسان دوست کیوں نہ ہو اس کا دل قلب سلیم نہیں ہو سکتا۔ آج بہت سے لوگ کہتے ہیں: "میرا دل صاف ہے، کیونکہ میں انسانوں سے بہت محبت کرتا ہوں اور ان کی مدد کے لیے تگ و دو کرتا ہوں۔" لیکن یہ دعوی بالکل بے بنیاد ہے، کیونکہ ایک دل میں کفر و الحاد ہو تو وہ کبھی بھی قلب سلیم نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہ اپنے اور کائنات کے مالک کا منکر ہے اور اس کا دل اس انکار سے لبریز ہے۔ انسانیت سے محبت یقیناً اچھی اور قابل اہمیت چیز ہے، لیکن ایسا احساس ایمان سے مربوط ہونا چاہیے، ایمان کے بغیر بھلائی، حسن اور فضیلت کی ہر صورت یا تو جھوٹی ہو گی یا عارضی ہو گی، لہٰذا اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

اگر کوئی شخص نہ صرف اپنے وطن بلکہ انسانیت کے لیے جلیل القدر خدمات پیش کرے، لیکن ساتھ ہی یہ دعوی بھی کرے کہ وہ ملکی قوانین اور نظم و ضبط کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کی سابقہ خدمات کے علی الرغم اسے فوراً سزا کا مستحق قرار دیا جائے گا، اسی طرح جو شخص کائنات کے مالک کا انکار کرتا ہے اور اس کا اعتراف نہیں کرتا اسے پیشانی اور قدموں سے پکڑ کر سزا دی جائے گی اور اسے اس کے کسی بھی عمل یا خدمت کا فائدہ نہیں پہنچے گا۔

ابو طالب نے تقریباً اڑتالیس سال رسول اللہ ﷺ کی نگہداشت اور حفاظت کی، لیکن اس کے باوجود چونکہ وہ ایمان نہیں لائے، اس لیے انہیں خدائی امن کا پروانہ نہ مل سکا حتی کہ جب فتح مکہ کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اپنے سفید ریش باپ ابو قحافہ کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے کر آئے تو رونے لگے۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اپنے باپ کے اسلام لانے اور ہدایت پانے کے بعد بھی تم کیوں رو رہے ہو؟ انہوں نے عرض کی: "اگر ابو طالب ایمان لے آتے تو مجھے اس پر زیادہ خوشی ہوتی۔" کیونکہ انہیں اس بارے میں رسول اللہ ﷺ

کی رغبت کا اندازہ تھا اور ابو طالب نے جس طرح رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دیا تھا اور مشرکین سے آپ ﷺ کی حفاظت فرمائی تھی وہ بھی انہیں نہیں بھولی تھی۔ ابو طالب نے آپ ﷺ سے کہا تھا: "اے بھتیجے! جاؤ اور جو چاہو کہو۔ بخدا میں تمہیں کسی قیمت پر مشرکین کے حوالے نہ کروں گا۔"(64) مزید بر آں انہوں نے حضرت علی کرار کرم اللہ وجہہ اور جنگ موتہ کے ہیرو حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ کے حوالے کیا، دوسرے لفظوں میں انہیں سب سے بہتر اور محفوظ ترین ہاتھوں کے سپرد کیا، لیکن کیا ان خدمات نے ابو طالب کو کچھ فائدہ دیا۔ اگر ایمان کی حالت میں ان کا انتقال ہوتا تو اس کا فائدہ انہیں پہنچتا۔

اس پہلو سے قلب سلیم کی بہت اہمیت ہے۔ بسا اوقات انسان بہت سے نیک اعمال سرانجام دیتا ہے، شریفانہ طرز عمل اختیار کرتا ہے اور فیاضی سے خرچ کرتا ہے، لیکن سب سے پہلے یہ یقین کر لینا چاہیے کہ قلب سلیم ہو اور کفر و شرک سے پاک ہو، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ دل اسلام سے آباد اور قرآنی اخلاق سے مزین ہو، کیونکہ اگر دل قرآنی اخلاق سے مزین نہ ہوا تو وہ قلب سلیم نہ کہلائے گا۔ انسانی دل اسی قدر سلیم ہوتا ہے، جس قدر وہ اخلاقِ نبوی کی پیروی کرتا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ میں قرآنی اخلاق جلوہ گر تھے اور آپ ﷺ قلب سلیم کی تمام تجلیات کا مرکز تھے۔ اگر کسی انسان میں یہ بات نہ ہو تو اسے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاقِ نبوی کی پیروی کرنے اور "تخلق باخلاق الله" پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

اسلام کے لیے خدمات پیش کرنے والے اہل ایمان سے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ صرف طاعت و عبادت پر اکتفا کرتے ہوئے اپنے دلوں کو صرف انہی سے منور نہیں کریں گے، بلکہ دوسروں کی دنیوی و اخروی سعادت کے لیے اپنے مادی مفادات اور روحانی فیوضات کی قربانی دینے کے لیے تیار رہیں گے اور دوسروں کو خوشی پہنچانے اور ان کی عاقبت سنوارنے کے لیے اپنی آسودہ حالی کو قربان کر دیں گے۔ اگر وہ کسی جگہ جمع ہوں گے تو صرف اس لیے تاکہ بہتر سے بہتر خدمات پیش کرنے کے لیے اپنے عزم کی تجدید کریں۔ اگر آپ ان کی گفتگو سنیں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ ان کی صرف ایک ہی خواہش "اعلائے کلمة الله" ہے۔ یہ دیکھ کر آپ

کو یقین ہو جانا چاہیے کہ انہی لوگوں کے بارے میں بشارتیں آئی ہیں، یہی حقیقی مؤمن مستقبل میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے ضامن اور صحیح اور سلیم دل کے مالک ہیں۔

قلبِ سلیم کا موضوع بڑی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ بہت سی قرآنی آیات میں قلبِ سلیم کو مال و اولاد کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے: ﴿يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ○ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾ (الشعراء:۸۸۔۸۹) ''جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے، ہاں جو شخص اللہ کے پاس بے روگ دل لے کر آیا وہ بچ جائے گا'' آخرت میں آپ کی صورتحال بہت سے سوالات کی جوابدہی پر موقوف ہوگی۔ ان میں سے چند سوالات حسبِ ذیل ہیں:

کیا آپ نے پسندیدہ طریقے سے زندگی گزاری؟ کیا آپ کی وفات پسندیدہ انداز سے ہوئی؟ کیا آپ کو اچھے انداز سے دوبارہ اٹھایا جائے گا؟ کیا آپ لواء الحمد تک کا راستہ پا سکتے ہیں؟ کیا آپ حوضِ کوثر تک پہنچ سکتے ہیں؟ کیا رسول اللہ ﷺ آپ کو دور سے ہی دیکھ کر پہچان سکیں گے؟ کیونکہ آپ ﷺ نے واضح لفظوں میں بتایا ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنی امت کو دوسری امتوں کے درمیان پہچان لیں گے اور جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایسا کیسے ممکن ہوگا؟ تو آپ ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا: ''تم میں ایک ایسی نشانی ہوگی جو کسی اور میں نہ ہوگی۔ وضو کے اثر سے تمہاری پیشانیاں اور ہاتھ پاؤں منور ہوں گے۔'' رسول اللہ ﷺ ان لوگوں کو پہچانتے ہیں، جن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾ (الفتح:۲۹) ''کثرت سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔'' نعیم بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو وضو کرتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اپنا منہ دھویا اور اپنے بازوؤں کو کندھوں کے قریب تک اور اپنے پاؤں کو پنڈلیوں تک دھویا اور پھر فرمایا: ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: ''میری امت قیامت کے دن ایسی حالت میں آئے گی کہ وضو کے اثر سے ان کی پیشانیاں اور ہاتھ پاؤں روشن ہوں گے۔'' لہٰذا تم میں سے جو اپنی روشنی کو دراز کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ ایسا کرے بھی سہی۔''(65) یہ قلبِ سلیم رکھنے والوں کے مظاہر اور تجلیات ہیں۔

اسلام حیرت انگیز تیزی سے پھیلا اور چودہ سو سال تک کوئی بھی قوت اسے مغلوب نہ کر سکی۔ اس کے کیا اسباب تھے؟ اور موجودہ پستی اور انحطاط کیوں ہے؟

اسلام اور ایمان کے مفاہیم کے درمیان پائے جانے والے فروق کے بارے میں مختلف آراء ہیں، لیکن ہم یہاں ان کی تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔ اگر ہم اسلام اور ایمان دونوں کو بیک وقت پیش نظر رکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان وہ شخص ہے، جو اللہ تعالیٰ اور ایمان کی تمام اساسات پر ایمان رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار ہے، دوسرے لفظوں میں مسلمان اپنی انفرادی، خاندانی اور اجتماعی زندگی سے متعلق تمام خدائی احکام کا پابند ہوتا ہے۔ بعض ادوار میں مسلمان اسلام پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہو سکے، لیکن اگر ان کے دلوں میں اسلامی جذبہ بیدار اور اس کے مطابق زندگی گزارنے کی خواہش موجود تھی تو ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے مؤاخذہ نہ فرمائیں گے، کیونکہ اسلام سے دوری کے نتیجے میں انسان اتنی طویل مسافت طے کر لیتا ہے کہ ایک ہی جست میں اس کی طرف واپس لوٹنا ممکن نہیں رہتا، لہذا اگر انہوں نے ذوق وشوق سے اسلام کی طرف لوٹنے کا عزم مصمم کر لیا اور اس بارے میں منصوبہ بندی اور سوچ وبچار بھی شروع کر دی تو وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں گے، کیونکہ قیامت کے دن مسئولیت سے بچنے کے صرف دو راستے ہیں: (الف) مکمل طور پر اسلام کے مطابق زندگی گزارنا (ب) اسلام کو واپس اپنی زندگیوں میں لانے کے لیے جدوجہد کرنا۔

اگر ان دو میں سے کوئی راستہ بھی اختیار نہ کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ قیامت کے دن مسئولیت سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہوگی، بلکہ دنیا میں بھی ذلت ایسے لوگوں کا مقدر بن جائے گی، کیونکہ اسلام سے دوری کے نتیجے میں ان کی زندگی کے تمام شعبوں خواہ ان کا تعلق معاشرت سے ہو یا معیشت سے، تجارت سے ہو یا دفاع سے پر کفار کا تسلط قائم ہو جائے گا، مزید برآں وہ سائنس و ٹیکنالوجی کے شعبے میں بھی پیچھے رہ جائیں گے اور قیامت کے دن انہیں اپنی کوتاہیوں کا حساب دینا ہوگا۔

تیرہ سو سال نہیں تو کم از کم ایک ہزار سال تو مسلمانوں کا عروج کا دور رہا ہے، جس میں وہ بام عروج تک پہنچے، خصوصاً خلفائے راشدین کے دور میں تو ان کی ترقی کی رفتار غیر معمولی

تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس دور کے بارے میں پہلے سے ہی بتا دیا تھا: ''ایک دور آئے گا جب لوگ جنگ کے لیے جائیں گے اور ان سے پوچھا جائے گا: ''کیا تم میں کوئی صحابی رسول ہے؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں ہے۔'' چنانچہ انہیں فتح نصیب ہو گی پھر وہ دوبارہ جنگ کے لیے جائیں گے اور ان سے پوچھا جائے گا: ''کیا تم میں کسی صحابی رسول کا صحبت یافتہ شخص ہے؟''لوگ اثبات میں جواب دیں گے، چنانچہ انہیں فتح نصیب ہو گی۔''(66)

ایک اور حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ ان تین بابرکت ادوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:''بہترین لوگ میرے دور کے لوگ ہیں پھر ان کے بعد کے اور پھر ان کے بعد کے۔''(67) تاریخ پر نظر ڈالنے سے اس حدیث مبارک کی صداقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

خلفائے راشدین کا زریں دور صرف تیس سال قائم رہا، لیکن اس کے باوجود حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مسلمان دنیا کے کونے کونے میں پہنچ چکے تھے۔ ارضروم سے لے کر بحیرہ آرال تک کا سارا علاقہ ان کے زیر نگین تھا۔ یہ سب جذبہ جہاد کا نتیجہ تھا، جس سے ان کے سینے سرشار تھے۔ براعظم افریقہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک مفتوح ہو چکا تھا، پہلے مسلمان سپہ سالار حضرت عقبہ بن نافع افریقہ کے آخری سرے تک جا پہنچے۔ وہ پچاس برس کی عمر میں سارا افریقہ فتح کرتے ہوئے بحر اٹلانٹک جسے عرب بحر ظلمات کہتے تھے تک جا پہنچے اور یہ کہتے ہوئے اپنا گھوڑا سمندر میں داخل کر دیا:''اے پروردگار! اگر یہ سمندر حائل نہ ہوتا تو میں تیری راہ میں مسلسل جہاد کرتا رہتا۔''

وہ بربر قوم کو اپنے ساتھ جہاد میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس دور میں ان کے پاس ہوائی جہاز تھے، نہ جہاز بردار بحری بیڑے تھے اور نہ ہی سمندری طوفانوں کا مقابلہ کر سکنے والی کشتیاں تھیں، بلکہ وہ ان تمام ممالک تک اونٹوں پر سوار ہو کر پہنچے تھے اور اگر کسی سمندر پار علاقے میں جانے کی ضرورت پیش آتی تو سمندر کو چھوٹی چھوٹی کشتیوں کے ذریعے عبور کرتے، لیکن ان مشکلات کے باوجود انہوں نے تھوڑے سے عرصے میں مشرق و مغرب کے بہت سے ممالک فتح کر لیے تھے۔ اگر ہم اس موضوع پر حساب و کتاب کے پہلو سے روشنی ڈالیں تو ثابت

ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین کے دور میں فتح کیے جانے والے علاقے نہ صرف امویوں، عباسیوں، سلاجقہ اور عثمانیوں کے ادوار کے مفتوحہ علاقوں کے مساوی ہیں، بلکہ ان سے زیادہ ہیں، باوجود اس کے کہ خلفائے راشدین کے دور میں پہلی ترجیح دلوں کو جیتنے اور اسلام کی اشاعت کو دی جاتی تھی۔

یہ بھی تقدیر کا ایک دلچسپ پہلو ہے کہ دور حاضر میں مسلمان جن جن علاقوں میں آباد ہیں وہ سب کے سب صحابہ کرام کے دور میں فتح ہوئے تھے۔ اگرچہ اندلس پر مسلمانوں نے آٹھ سو برس تک حکمرانی کی، لیکن آج وہاں کوئی ایسی چیز موجود نہیں، جو مسلمانوں کے لیے باعث مسرت ہو، لیکن دوسری طرف ترکستان، داغستان، منگولیا اور ازبکستان میں اب بھی مساجد اور دینی مدارس قائم ہیں، کیونکہ ان علاقوں کو صحابہ کرام نے فتح کیا تھا۔ ان علاقوں میں بخاری، مسلم، ترمذی، ابن سینا اور فارابی جیسی بڑی بڑی ہستیاں پیدا ہوئیں، جنھوں نے علم اور اسلام کی خدمت کی۔ ان ممالک میں اسلام بجا طور پر زندہ رہا۔

ہمیں امید ہے کہ صدق و اخلاص کی بنیادوں پر قائم کیے گئے یہ ممالک جن کی سرزمین خونِ صحابہ سے رنگین ہوئی ان شاء اللہ ایک مرتبہ پھر اسلام کے زیر نگیں آئیں گے۔(68) ہم سب اس دن کے منتظر ہیں اور اپنے آپ کو ان ریاستوں میں چلتے پھرتے محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جو اسلام آج ان ریاستوں سے رخصت ہو چکا ہے وہ موجِ مسلسل کی مانند ایک دن پھر آئے گا۔ یہ ایک مستقل اور زندہ موضوع ہے، جسے اب ہم زیر بحث نہیں لائیں گے، بلکہ اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں۔

اگر صحابہ کرام مختصر سی مدت میں ایک جہاں کو فتح کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں تو اس کے ضرور کچھ اسباب و محرکات ہوں گے۔ صحابہ کرام میں سے ہر ایک عشق و جنون کی حد تک دعوتِ اسلام سے محبت کرتا تھا۔ جو لوگ صحابہ کرام کے صرف ظاہری حالات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اصل حقیقت سے بے خبر ہیں وہ انھیں جنون کی حد تک نڈر خیال کرتے ہیں، کیونکہ ان کے کارنامے واقعۃً حیرت انگیز ہیں۔

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ ہجرت کی رات رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سوئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پہلے دن سے ہی تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کے لیے تیار تھے، تاہم جب مشرکین مکہ کو پتا چلا کہ بستر پر سونے والا شخص رسول اللہ ﷺ کی بجائے ان کے چچا زاد بھائی حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں تو مارے حیرت کے ان کے ہاتھ ہوا میں اٹھے کے اٹھے رہ گئے، کیونکہ یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ ایک سترہ سالہ نوجوان ایسی قربانی کیسے پیش کر سکتا ہے، جس میں اس کی جان کا بدترین انداز سے خاتمہ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر بشمول ابو جہل مشرکین ششدر رہ گئے پھر ابو جہل حضرت عبد اللہ بن جحش کے گھر کی چھت پر چڑھا، جہاں بکریوں کے ممیانے کی آواز سن کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، کیونکہ گھر میں کوئی بھی شخص موجود نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ کی طرف ہجرت فرمانے کے بعد کسی نے بھی ہجرت میں تاخیر نہ کی۔

ایک دن مکہ کے بالائی حصے کی طرف جاتے ہوئے عتبہ بن ربیعہ، عباس بن عبد المطلب اور ابو جہل بن ہشام بنو جحش کے گھروں کے پاس سے گزرے۔ عتبہ بن ربیعہ نے دیکھا کہ وہ اپنے باسیوں سے خالی پڑا ہے اور اس کے دروازے کھڑ کھڑا رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا:

وکل دار وان طالت سلامتها　　　یوماً ستدرکها النکباء والحوب

”کوئی گھر خواہ کتنا ہی عرصہ محفوظ کیوں نہ رہے، ایک نہ ایک دن اس پر مصیبت اور تباہی آکر رہتی ہے۔“

اس کے بعد عتبہ نے کہا: ”آہ! بنو جحش کا گھر اپنے باسیوں سے خالی ہو گیا۔“ (69) صحابہ کرام اسلام کی خاطر اپنا گھر بار، اہل و عیال اور مال و اسباب سب کچھ چھوڑ دیتے تھے اور یہ بات مشرکین کے لیے ناقابل فہم تھی۔

جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو انہوں نے اپنے والد اور بیوی بچوں میں سے کسی کو بھی ساتھ نہ لیا، بلکہ انہوں نے سب کو مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر تن تنہا ہجرت کی۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ

عنہا جو گوشۂ جگرِ رسول اور نورِ چشم نبوی تھیں کو بھی اپنے ساتھ نہ لیا۔ اگر ہم سے کہا جائے کہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو ہماری جانوں کی قربانی کی ضرورت ہے تو ہم میں سے ہر ایک ان کی خاطر اپنی جان پیش کرنے کی کوشش کرے گا، لیکن اس کے باوجود وہ مکہ میں رہیں اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تنہا مدینہ کی طرف ہجرت کی۔

یہ دور صدق و اخلاص کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے وابستہ لوگوں کا دور تھا۔ وہ حیرت انگیز حد تک آپ ﷺ کی پیروی اور آپ سے محبت کرتے تھے حتی کہ بعد میں جب عروہ بن مسعود صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے ملا اور آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام کے طرز عمل کو دیکھا کہ آپ ﷺ وضو فرماتے ہیں تو صحابہ وضو کے پانی کی طرف لپکتے ہیں، آپ تھوک پھینکتے ہیں تو صحابہ آپ کے لعابِ دہن کو اٹھانے کے لیے دوڑتے ہیں اور آپ ﷺ کا کوئی مو مبارک گرتا ہے تو وہ اسے اٹھالیتے ہیں تو اس نے مکہ واپس جا کر کہا: ”اے قوم! میں بادشاہوں کے پاس گیا ہوں اور میں قیصر و کسری اور نجاشی سے بھی ملا ہوں، لیکن بخدا میں نے کوئی ایسا بادشاہ نہیں دیکھا، جس کے لوگ اس کی اتنی تعظیم کرتے ہوں جتنی تعظیم محمد کے صحابہ محمد کی کرتے ہیں۔ بخدا! اگر وہ تھوکتے ہیں تو ان کا لعاب ان کے صحابہ میں سے کسی نہ کسی کے ہاتھ پر گرتا ہے، جسے وہ اپنے چہرے اور بدن پر مل لیتا ہے۔ وہ انہیں کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ اسے فوراً بجا لاتے ہیں۔ جب وہ وضو کرتے ہیں تو ان کے صحابہ ان کے وضو کا پانی حاصل کرنے کے لیے مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو سب خاموش ہو جاتے ہیں اور ان کی عظمت کے سبب کسی کی ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔“(70)

صحابہ کرام اس قدر رسول اللہ ﷺ کا احترام اور آپ سے محبت کرتے تھے۔ اگرچہ آپ ﷺ ان سے فرماتے تھے: ”میرے لیے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو جیسے عجمی لوگ ایک دوسرے کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔“(71) لیکن صحابہ کرام اس کے باوجود آپ ﷺ کی خاطر کھڑے ہوا کرتے تھے، کیونکہ جس قدر آپ ﷺ صحابہ کرام کے سامنے تواضع اختیار فرماتے اسی قدر آپ ﷺ کا مقام ان کی نظروں میں بڑھ جاتا اور وہ آپ سے پہلے سے زیادہ

محبت کرنے لگتے۔ روایت کیا جاتا ہے کہ زمانہ نبوت کے آغاز میں جب رسول اللہ ﷺ نے پہلی مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دیکھا تو آپ اچھل پڑے، لیکن ایک عاشق رسول کا کہنا ہے: "اگر حضرت جبرائیل علیہ السلام حقیقت محمدیہ کو پردوں کے پیچھے سے بھی دیکھتے تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے۔" جس قدر آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ سے رابطہ مضبوط ہوتا گیا، اسی قدر آپ کی عظمت میں اضافہ ہوتا گیا، لیکن جس قدر آپ ﷺ کی عظمت میں اضافہ ہوا اسی قدر آپ ﷺ کی تواضع بڑھتی چلی گئی۔ آپ ﷺ اپنے آپ کو ایک عام انسان سمجھتے تھے اور اپنے ساتھ اس حیثیت سے بڑھ کر کیے جانے والے برتاؤ کو پسند نہ فرماتے، بلکہ اس پر تنگدل ہوتے تھے۔

یہ وہ دور تھا جس میں صحابہ کرام دل و جان سے رسول اللہ ﷺ سے اس قدر وابستہ ہو گئے تھے کہ آپ ﷺ نے ان سے فرما دیا تھا: "میرا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہے۔"(72) آپ ﷺ نے یہ بات صرف ان کی دلجوئی کے لیے نہیں فرمائی تھی، بلکہ یہ ان کے ساتھ قلبی اور روحانی وحدت کا اظہار تھا، یہی وجہ تھی کہ جب وہ دن آیا جب ان سے اشاعت اسلام کے لیے اللہ کی وسیع و عریض زمین کی طرف ہجرت کرنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے کوئی اعتراض کیا اور نہ ہی حجت بازی کی، بلکہ ہجرت کر کے اسلام کی خاطر دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے اور اپنے قدیم وطن کی طرف واپسی کا کبھی سوچا بھی نہیں، بلکہ اپنے اِنہی نئے وطنوں میں مرنے کو ترجیح دی تاکہ ان کی ہجرت کے بارے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

جب حضرت سعد بن ابی وقاص مکہ مکرمہ میں بخار میں مبتلا ہوئے تو وہ بہت غمزدہ ہو گئے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ان سے غمزدہ ہونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے عرض کی: "یارسول اللہ! کیا مجھے اپنے ساتھیوں سے پیچھے چھوڑ دیا جائے گا؟" ایک دوسری روایت کے الفاظ میں: "کیا میں ہجرت سے پیچھے رہ جاؤں گا؟"(73) دراصل وہ اپنے اس اندیشے کا اظہار کر رہے تھے کہ کہیں میری موت مکہ میں نہ واقع ہو جائے اور میں اس مدینے میں نہ مر سکوں، جس کی طرف میں نے ہجرت کی تھی اور جو آپ ﷺ کے وجودِ میمون سے بابرکت شہر بن گیا ہے، جس کے نتیجے میں کہیں میری ہجرت میں کمی نہ واقع ہو جائے۔ مدینہ منورہ سے صحابہ کرام کے تعلق کا سبب رسول اللہ ﷺ کی محبت ہی تھی، کیونکہ آپ ﷺ

نے اسے اپنا مسکن بنایا تھا۔ ان کی یہ وابستگی اور وارفتگی بجا تھی، لیکن جب انہیں اسلام کی اشاعت کے لیے دنیا کے اطراف میں ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا تب بھی انہوں نے کسی قسم کے تردد، انکار یا ناخوشگواری کا اظہار نہ کیا، کیونکہ وہ اسلام کی صورت میں جلوہ گر ہونے والی حقیقت کے سچے عاشق تھے۔ جس طرح لیلیٰ کا مجنوں ہمیشہ لیلیٰ کے گرد گھومتا تھا، اسی طرح یہ صحابہ کرام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی کے حصول کی خاطر اسلام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے کے جذبے سے ہر دم سرشار رہتے تھے، چنانچہ جونہی انہیں حکم ملا وہ دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے۔ بعض تبوک کی طرف چلے گئے، بعض نے یمن ہجرت کی اور بعض حضرموت روانہ ہوئے۔ ان کے جوش و خروش کی مثال ملنا مشکل ہے۔

جب مختلف ممالک اور سلطنتوں نے اسلام کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے، اسے پھیلنے سے روکنے اور امام المجاہدین کے سامنے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو مسلمان بھی تلواریں نکالنے پر مجبور ہو گئے، کیونکہ ان کے کندھوں پر دنیا میں روشنی پھیلانے کی مقدس ذمہ داری کا بوجھ تھا اور جب دشمن نے انہیں روکنے کے لیے مادی طاقت کا استعمال کیا تو انہیں بھی اس کے خلاف طاقت استعمال کرنی پڑی۔

اب جہاد و قتال کا وقت آ پہنچا تھا، چنانچہ وہ اس سے بھی پیچھے نہ رہے، بلکہ میدانِ جنگ کی طرف لپکے، جنگ کی اور قتل ہوئے، لیکن کسی نے بھی میدان سے راہِ فرار اختیار نہ کی۔ وہ ہر جنگ میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے چین تک جا پہنچے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایسی بہادری اور شجاعت کا نمونہ تھے، جس کی مثالیں صرف افسانوی داستانوں میں ہی ملتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کسی بھی شخص کو اس کی استطاعت سے زیادہ ذمہ داری نہ سونپتے تھے، لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام اپنی استطاعت سے زیادہ ذمہ داریاں اٹھانے میں ایک دوسرے سے مسابقت کرتے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی طرف پیش قدمی کرنے کا ارادہ فرمایا تو اس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ آشوبِ چشم میں مبتلا تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے انہیں مدینہ منورہ میں چھوڑنے کا ارادہ فرمایا، لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ بات پسند نہ آئی اور روتے ہوئے آپ ﷺ سے عرض کی: "یارسول اللہ! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں کے درمیان چھوڑ کر

جا رہے ہیں؟ یا رسول اللہ! میری تمنا ہے کہ آپ جہاں بھی جائیں میں آپ کے ساتھ رہوں۔"(74)
چنانچہ انہوں نے غزوہ خیبر میں شرکت کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ پر خیبر فتح کرایا۔

ایک مرتبہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے عزیز حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ کی امارت سونپی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایسے نابینا اور معذور لوگوں کو میدانِ جہاد میں شرکت سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا تھا۔ اگر وہ ساری زندگی جہاد میں شرکت نہ کرنا چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے، لیکن وہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے اور کوئی بھی انہیں نابینا ہونے کی بنا پر جہاد کے ارادے سے باز نہ رکھ سکا، چنانچہ پیرانہ سالی کے باوجود انہوں نے قادسیہ کی طرف جانے والے لشکر میں شرکت کی۔ تاریخی روایات سے پتا چلتا ہے کہ جنگ کے وقت لوگوں نے انہیں پچھلی صفوں میں رکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور ان سے اصرار کے ساتھ پرچم اٹھانے کی اجازت کی درخواست کی۔ ایک روایت کے مطابق وہ اسی معرکے میں شہید ہوئے۔(75)

یہ ان لوگوں کا نمونہ ہے، جنہوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ خدا کے راستے میں اپنی جانیں لٹائیں۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ کی عدم موجودگی حضرت ابن ام مکتوم کے لیے بہت بڑا موقع غنیمت تھا، کیونکہ اگر رسول اللہ ﷺ باحیات ہوتے تو آپ ﷺ انہیں معذور ہونے کی بنا پر جہاد میں شرکت سے روک دیتے، لیکن اب انہیں کوئی بھی روکنے والا نہ تھا، اس لیے وہ اگلی صفوں میں شرکت کا موقع ملنے پر بہت مسرور تھے۔

حضرت ابو طلحہ بہت بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ ایک دن وہ سورت براءت کی تلاوت کرتے ہوئے آیت مبارکہ ﴿انفِرُواْ خِفَافاً وَثِقَالاً﴾ (التوبۃ:41) "تم ہتھیار تھوڑے رکھتے ہو یا بہت گھروں سے نکل آؤ۔" پر پہنچے تو انہوں نے اپنے گھر والوں اور بیٹوں کو بلا کر کہا: "میرے خیال میں میرا پروردگار مجھ سے جوانی اور بڑھاپے دونوں میں جہاد کے لیے نکلنے کا مطالبہ کر رہا ہے، لہٰذا مجھے جہاد کے لیے تیار کرو۔" ان کے بیٹوں نے ان سے کہا: "آپ نے رسول اللہ ﷺ

کی وفات تک ان کے ہمراہ جہاد کیا پھر آپ نے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی معیت میں جہاد کیا اور اب ہم آپ کی طرف سے جہاد کر رہے ہیں۔" لیکن حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اپنے تیار کیے جانے پر اصرار کرتے رہے اور کسی کی بھی بات یا اصرار کو خاطر میں نہ لائے۔ چار و ناچار ان کے بیٹوں نے انہیں گھوڑے پر اچھی طرح بیٹھا دیا، لیکن ان کا ناتواں جسم طویل سفر کی مشقت برداشت نہ کر سکا اور سمندر عبور کرتے ہوئے ان کی روح پرواز کر گئی۔(76) شاید انہوں نے وفات سے کچھ دیر پہلے اس موقع کے ملنے پر اپنے پروردگار کا شکر ادا کیا ہو گا۔

حضرت خالد بن زید (ابو ایوب انصاری) رضی اللہ عنہ نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود یزید بن معاویہ کی قیادت میں قسطنطنیہ کی فتح کے لیے روانہ ہونے والی مہم میں حصہ لیا اور طویل مسافت طے کر کے قسطنطنیہ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ نبی اکرم ﷺ کی ہجرت کے وقت حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ شادی شدہ اور صاحب اولاد تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں یزید بن معاویہ کی زیر قیادت قسطنطنیہ کی فتح کے لیے اسلامی لشکر کی روانگی کا واقعہ ہجرت سے تقریباً پچاس سال بعد پیش آیا، اس اعتبار سے اس لشکر کے ساتھ نکلنے کے وقت حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی عمر تقریباً اسی برس ہو گی۔ انہوں نے مدینہ منورہ سے لے کر استنبول تک کا یہ طویل سفر گھوڑے کی پشت پر طے کیا۔ یہاں میرا دل چاہتا ہے کہ یہ سوال پوچھوں: "ان صحابہ کرام اور ان کے ساتھیوں کی ساری جدوجہد کا مقصد کیا تھا؟" ان کی مدح بہت سی آیات اور احادیث میں ہوئی ہے، قرآن کریم نے انہیں انصار و مہاجرین کے القاب سے یاد کیا ہے اور تورات و انجیل میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ، لیکن انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سن رکھا تھا: "تم قسطنطنیہ کو ضرور فتح کرو گے۔ وہ لشکر اور اس کا سپہ سالار کیا ہی خوب انسان ہوں گے۔"(77) یہی وجہ تھی کہ ایسے مبارک لشکر میں شامل ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنا ان کا منتہائے مقصود تھا، ورنہ اس قدر شدید خواہش اور مشقت اٹھانے کا کیا محرک تھا؟ وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے قسطنطنیہ فتح کرنے والے لشکر کے بلند مقام کی طرف اشارہ فرمایا تھا اور صحابہ کرام اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے خواہاں تھے۔

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے پیش نظر یہی ہدف تھا، چنانچہ وہ اٹھے اور مدینہ منورہ سے قسطنطنیہ تک کا تھکا دینے والا طویل سفر کیا۔ کئی ماہ گزر گئے، لیکن فتح نصیب نہ ہوئی۔ اس صحابی پر بیماری نے حملہ کر دیا اور تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ وہ عموماً پوچھتے رہتے: "کیا فتح نصیب ہو گئی؟" جب ان کی وفات کا وقت قریب آگیا تو سپہ سالار یزید بن معاویہ نے ان سے ان کی آخری خواہش پوچھی۔ انہوں نے فرمایا: "میری خواہش یہ ہے کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے سوار کر کے دشمن کی زمین میں جہاں تک جا سکو جاؤ اور مجھے وہاں دفن کر کے لوٹ آؤ۔" چنانچہ جب ان کی وفات ہوئی تو یزید انہیں سوار کر کے دشمن کے علاقے میں جہاں تک جا سکتا تھا گیا اور انہیں قسطنطنیہ کے قلعے کی بنیادوں کے قریب دفن کر کے لوٹ آیا۔(78)

اس واقعے کے تقریباً چھ سو سال بعد اللہ تعالیٰ نے اس بشارت کو پانے کا شرف بائیس سالہ سلطان محمد فاتح کو عطا فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کی اس بشارت اور خوشنودی کو پانے، ایک دور کو ختم کر کے ایک دوسرے دور کا آغاز کرنے کا عظیم کارنامہ سرانجام دینے اور یورپ کے دروازے پر اسلامی روح کو پیش کرنے کی سعادت اس ہیرو کے نصیب میں آئی۔ تقدیر الٰہی کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ اس ہیرو کا نام بھی آپ ﷺ کے نام کی طرح محمد تھا۔ فاتح کا لقب تو اسے استنبول کی فتح کے بعد ملا۔ جب سلطان محمد فاتح فتح پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہوئے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر شہر میں داخل ہو رہے ہوں گے تو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی روح بھی خوش ہو رہی ہو گی۔ بلاشبہ وہی فاتح تھا اور اس کا لشکر (خوش نصیب) لشکر تھا۔

جن لوگوں نے اپنے آپ کو اس قسم کے جہاد و قتال یا دعوت و ارشاد کے میدان میں جد و جہد کے لیے وقف کر رکھا تھا ان کے ہاتھوں جو ممالک فتح ہوئے وہ صدیوں ان کے زیر نگین رہے، لیکن جب مسلمانوں کے دلوں میں وہن یعنی موت کا خوف پیدا ہو گیا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے تو ایک ایک کر کے یہ علاقے ان کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔

دو تین صدیاں پہلے ہم انسانی تاریخ میں امتیازی مقام اور بین الاقوامی امور میں کافی وزن رکھتے تھے، لیکن آج ہم اپنا یہ مقام اور وزن کھو چکے ہیں۔ اس صورتحال کی صرف ایک ہی توجیہہ

ممکن ہے وہ یہ کہ ترقی کے دور میں ہم اسلامی روح کے حامل، اللہ تعالیٰ کے فرمانبر دار اور اس کے احکام پر سنجیدگی کے ساتھ عمل پیرا تھے، جبکہ پستی اور انحطاط کے دور میں ہمارے دلوں میں وہن یعنی موت کا خوف، کمزوری، دنیا کی محبت اور مستقبل کے بارے میں اندیشے داخل ہو چکے ہیں۔ دنیا کے جن علاقوں کو مسلمانوں نے حیرت انگیز تیزی سے فتح کیا تھا ان پر مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال تک عمدگی سے حکومت کی۔ کیا اس عظیم کامیابی کا سبب اس کے سوا کچھ اور بتایا جا سکتا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں نے اپنے تمام مادی اور روحانی وسائل کو راہ خدا میں وقف کر رکھا تھا۔

ہم عالم اسلام کے تمام مجاہدوں اور ہیروؤں میں یہی روح کار فرما دیکھتے ہیں۔ وہ دنیا کے پیچھے پڑے اور نہ ہی اس سے اپنا تعلق مضبوط کیا، بلکہ ہمیشہ دوسروں کو زندگی کا تحفہ دینے کو پسند کیا۔ روئے زمین پر خدا کے دین کی سربلندی ان کا واحد ہدف تھا۔

یہ بات ہمیں الپ ارسلان، کلج ارسلان، سلطان مراد اول، سلطان محمد فاتح، یاووز سلیم اور دیگر بہت سی ہستیوں میں نظر آتی ہے۔ "مالازغیرت" کے معرکے میں الپ ارسلان نے سفید عبا پہن کر اپنے لشکر کے سامنے ایک پر جوش تقریر کرتے ہوئے کہا: "میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ یہ سفید عبا میرا کفن بن جائے۔" اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ فتح سے زیادہ شہادت کے طلبگار تھے، چنانچہ وہ کفن پہن کر بغیر کسی تردد کے اپنے لشکر کے ہمراہ اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر میں گھس گئے اور دن ڈھلنے تک فتح سے ہمکنار ہوئے، لیکن شہادت نہ ملنے کی وجہ سے فتح ان کے لیے باعث رنج تھی۔

اسی طرح سلطان مراد اول نے بھی ایک معرکے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی تھی کہ مسلمانوں کو فتح اور اسے شہادت نصیب ہو، چنانچہ ان کی یہ دعا قبول ہوئی۔ مسلمانوں کو فتح اور انہیں شہادت نصیب ہوئی۔(79) اور جب سینے پر خنجر کے وار سے وہ زمین پر گر پڑے تو لوگوں نے ان سے ان کی آخری خواہش پوچھی۔ انہوں نے کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد آخری بات یہ کہی کہ "گھوڑوں کی پشتوں سے نہ اترنا۔"

ان لوگوں نے جس سلطنت کی بنیادیں رکھی تھیں اسے ہر دور میں بین الاقوامی سطح پر اہمیت حاصل رہی اور وہ ہمیشہ دشمنوں کی آنکھوں میں کھٹکتی رہی۔ بلاشبہ انہی بہادرانِ قوم کی پیش کردہ قربانیوں اور رضائے الٰہی کو پہلی ترجیح دینے کی بدولت ہم عزت سے جیتے رہے اور ہماری سرحدیں محفوظ رہیں، لیکن جب ہم میں یہ روح ختم ہوگئی تو دشمنوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیر لیا اور بتدریج ہمیں نگلنے لگے۔ سب سے پہلے ہماری روحانی موت واقع ہوئی پھر ہم سے ہماری عزت چھن گئی اور پھر مادی طور پر بھی ہم شکست خوردہ ہوگئے۔ اب ہم عالمی طاقتوں کی امداد کے منتظر رہتے ہیں اور ان ممالک کی طرف سے اپنے قرضوں کی قسطوں کی ادائیگی میں مہلت مل جانے کو بہت بڑی کامیابی تصور کرتے ہیں۔

اگر یہ امت اپنی عظمت رفتہ کو بحال کرنا چاہتی ہے تو بغیر کسی کوتاہی کے ان تمام اسباب کو اختیار کرے، جن کی بدولت وہ ماضی میں ترقی کی بام عروج پر پہنچی تھی۔ کیونکہ ﴿وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾ (النجم:۹۳) "اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے، جس کے لیے وہ محنت کرتا ہے۔"

دورِ فترت کیا ہے؟ کیا ہم دورِ فترت میں رہ رہے ہیں؟

دورِ فترت دو نبیوں کی بعثت کے درمیانی عرصے کو کہتے ہیں۔ عام طور پر اس کا اطلاق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے کے دور پر ہوتا ہے۔ اس دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات مٹ گئیں اور ان کی لائی ہوئی روشنی رسول اللہ ﷺ کے دور تک نہ پہنچ سکی، جس کے نتیجے میں لوگ جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں رہے یا اس سے مراد وہ دور ہے، جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی روشنی اور رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی روشنی میں اتصال نہ ہو سکا، جس کے نتیجے میں ایک تاریک خلا وجود میں آیا، جسے دور فترت سے تعبیر کرتے ہیں اور اس دور کے لوگوں کو اہل فترت کہتے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں، جن تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی خبر پہنچی نہ وہ ان کے انوار و اسرار سے استفادہ کر سکے اور نہ ہی وہ رسول اللہ ﷺ تک رسائی پا سکے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ایسے لوگوں نے بت پرستی کا ارتکاب نہ کیا تو اللہ تعالیٰ ان کی بخشش و مغفرت فرما دیں گے، گو انہیں معرفت الٰہیہ اور ایمان نہ بھی نصیب ہوا ہو، اسی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ کے والدین کی ان شاء اللہ مغفرت ہو جائے گی، کیونکہ وہ اہل فترت میں سے تھے۔

اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے والدین کے زندہ ہو کر آپ ﷺ پر ایمان لانے کے بارے میں ایک حدیث ہے، لیکن اصولِ حدیث کی روشنی میں یہ حدیث ضعیف ہے، گو امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ جیسے امام اور مجدد اسی حدیث کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ کے والدین کی نجات اور مغفرت کے قائل تھے۔ اگرچہ یہ بات درست ہے کہ جب عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے والد حضرت حصین رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا تھا: "آپ بہتر ہیں یا آپ کے والد؟" تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا تھا: "تمہارا اور میرا باپ جہنم میں ہے۔" لیکن یہ جواب اسی وقت تک درست تھا، کیونکہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے والدین کی قبروں پر جا کر اللہ تعالیٰ سے

دعا کی کہ انہیں میری امت میں قبول فرمالیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دعا کو قبول فرمایا اور آپ کے والدین آپ ﷺ پر ایمان لاکر آپ کی امت میں شامل ہو گئے۔

درحقیقت اس حدیث کی بنیاد پر اس سوال کا جواب دینے کی چنداں ضرورت ہی نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے محترم والدین میں سے کسی کے بھی بت پرستی میں مبتلا ہونے پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ تاریخی حقائق سے پتا چلتا ہے کہ اس دور میں دین ابراہیمی کے ماننے والے ایسے بہت سے موحدین موجود تھے، جنہوں نے بتوں کی پوجا نہیں کی تھی، مزید برآں وہ اہل فترت میں سے تھے اور اہل فترت اہل نجات ہیں۔ جب اہل فترت نجات پانے والے ہیں تو رسول اللہ ﷺ کے والدین نجات سے کیسے محروم ہو سکتے ہیں؟

جیسا کہ ہم پہلے بھی اس طرف اشارہ کر چکے کہ اللہ اس دور کے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے چچا زید بن عمرو اور ورقہ بن نوفل جیسے موحدین کے ایمان کو ضائع نہیں فرمائیں گے۔ یہ لوگ دل سے اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ ممکن ہے وہ لفظ "اللہ" سے ناآشنا ہوں، اس لیے وہ "یا اللہ" نہ پکار سکے ہوں، لیکن وہ ایک معبود کے وجود پر ایمان رکھتے تھے اور اسی سے دعا مانگتے تھے، یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے کچھ عرصہ پہلے فضا سازگار ہو گئی تھی اور حساس طبیعتیں رحمت الٰہیہ کے نزول کے قرب کو محسوس کر رہی تھیں اور اپنے آس پاس کے لوگوں کو اس کی بشارت سنا رہی تھیں۔ ہمیں امید ہے کہ شفاعت کبری کا حق رکھنے والے ہمارے رسول ﷺ اپنی آمد کا ذوق و شوق اور بے صبری سے انتظار کرنے والوں کو نہیں بھولیں گے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنے سایۂ رحمت میں لے لیں گے، نیز ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ اس دور میں بت پرستی سے دور رہنے والے دیگر افراد بھی نجات پائیں گے۔

یہ تو اس سوال کا دینی پہلو ہے، لیکن اس کا ایک پہلو دور حاضر سے بھی متعلق ہے اور میرے خیال میں سوال سے مقصود یہی دوسرا پہلو ہے۔

اگر ہم علم کلام کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو ان کی رو سے دور حاضر کے لوگوں پر اہل فترت کا اطلاق کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے، تاہم مکمل تحقیق کے بغیر یقینی حکم صادر کرنا جہاں اہل السنت والجماعت کے مزاج کے خلاف ہے، وہیں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کے عدم احترام کے بھی مترادف ہے۔

ہمارے اس دور میں بہت سے علاقوں میں اسلام کی شمع بجھ چکی ہے، دلوں سے اللہ اور اس کے رسول کا نام مٹ چکا ہے اور سائنس کو خالق کائنات کے انکار کے لیے غلط طریقے سے استعمال کیا جارہا ہے۔ بجائے اس کے کہ علم و عرفان کے اس دور میں خدا کے دین کا بول بالا اور معرفت الٰہیہ کا دور دورہ ہو، کفر کے بدنما چہرے کو نمایاں کیا جا رہا ہے اور سائنس اور فلسفے کو وصول الی اللہ کی اساس کے طور پر استعمال کرنے کی بجائے ایمان کے قلعے کو گرا کر ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کرنے کے لیے بطور ہتھیار کے استعمال کیا جارہا ہے۔ کفر و گمراہی کے اس پر آشوب دور میں بہت سے نوجوان مسجدوں کا راستہ تک بھول چکے ہیں۔

علمی محافل پر متمکن لوگوں نے اپنی نظریں اپنی قابل فخر تاریخ سے پھیر کر مغرب پر مرکوز کرر کھی ہیں۔ ان میں سے بعض نے دور حاضر کے انسان کا ایمان نظریہ ارتقا سے خراب کیا ہے، بعض نے فرائیڈ کے نظریات کی روشنی میں امت کے افکار و اذہان کو جنسی خواہشات سے جوڑ کر پراگندہ کیا ہے اور تمام مسائل کا حل جنسی اور شہوانی پہلو سے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، نیز بعضوں نے لاقانونیت پسندانہ رجحانات پھیلا کر قوم کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ رجحانات ہماری قوم اور ہمسایہ قوموں کو فکری طور پر تباہ اور مسموم کر کے انہیں اپنی اساس اور شناخت سے دور کر رہے ہیں۔ بہت سے اخبارات، رسائل اور کتابیں ملک کے طول و عرض میں سالہا سال سے اس قسم کے رجحانات پھیلا رہی ہیں، لہذا دور حاضر کے انسان کو بالکلیہ زمانۂ فترت سے خارج سمجھنا ممکن نہیں، ورنہ ہمارا اپنے گرد و پیش کے حقائق سے صرف نظر کرنا لازم آئے گا۔ میں یہاں اپنی نسل کے روحانی افلاس کے اظہار کے لیے دور حاضر ہی کے ایک واقعے کا تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔

ہمارا ایک بھائی نوجوانوں کے ساتھ کسی محفل میں دین کے عالی حقائق کی وضاحت کر رہا تھا کہ روئے سخن حالات حاضرہ کی طرف پھر گیا اور اشتراکی دنیا میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے

والے مظالم اور ان کے آئندہ کے شیطانی منصوبوں کا تذکرہ چل نکلا، جسے سن کر ایک نوجوان کی غیرت کو جوش آیا اور وہ کہنے لگا: "چونکہ کمیونسٹ قاتل اور مجرم ہیں، اس لیے ہمارے ملک میں جتنے بھی کمیونسٹ ہیں انہیں قتل کر دینا چاہیے۔" لیکن کمرے کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اس محفل کی گفتگو کو ذوق و شوق سے سننے والے ایک نوجوان جس نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسی مبارک فضا میں سانس لیا تھا، نے اسے اسی جوش و جذبے سے جواب دیا: "اے دوست! آپ قتل و غارت کی بات کر رہے ہیں۔ اگر آپ اپنے عزائم پر کل تک عمل کر چکے ہوتے تو میں بدقسمت اس کی بھینٹ چڑھ چکا ہوتا، کیونکہ کل تک میں بھی انہی میں شامل تھا، لیکن آج آپ مجھے نوجوانوں کے اس مبارک گروہ میں دیکھ رہے ہیں۔ میں نے کل سے آج تک گویا صرف ایک دن میں زمین و آسمان جتنی مسافت طے کی ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ جن لوگوں کے لیے آپ "مخالفوں" اور "دشمنوں" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، ان میں میرے جیسے ہزاروں لوگ نجات کے منتظر ہیں۔ وہ تھپڑ کے نہیں بلکہ محبت و شفقت کے منتظر ہیں۔ اگر آپ ان کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے تو وہ بھی آپ جیسے بن جائیں گے۔ اصل ذمہ داری قتل کرنا ہے یا زندگی بخشنا؟" ان پرخلوص اور سچے الفاظ کا حاضرین پر اس قدر اثر ہوا کہ بعض کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے۔

یہ وہ نسل ہے جو ہمارے سامنے ہے اور جس کی گمراہی دیکھ کر ہمیں رونا آتا ہے۔ ان کی بڑی تعداد بے قصور ہے، کیونکہ وہ صرف اس وجہ سے گمراہ ہوئے کہ وہ حق کو نہ پہچان سکے۔ میرے خیال میں انہیں اہل فترت میں شمار نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کے منافی ہو گا۔ بخاری اور مسلم میں درج ذیل واقعہ بیان ہوا ہے: "ایک دفعہ کچھ قیدی لائے گئے، جن میں ایک عورت بھی تھی۔ وہ عورت دائیں بائیں دوڑتی پھرتی تھی اور کوئی بھی بچہ دیکھتی تو اسے اپنی گود میں اٹھا لیتی، لیکن جب وہ دیکھتی کہ جس بچے کی اسے تلاش تھی یہ وہ بچہ نہیں ہے تو اسے چھوڑ کر دوبارہ تلاش شروع کر دیتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ پرنم آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آخرکار اس عورت کو اپنا بچہ مل گیا اور اس نے شدید محبت سے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کی طرف اشارہ کر کے اپنے اردگرد موجود صحابہ کرام سے پوچھا: "کیا تم

سمجھتے ہو کہ یہ عورت اپنے بچے کو آگ میں پھینک دے گی؟" صحابہ نے عرض کی: "ہمارا نہیں خیال کہ اگر اس کے بس میں ہو تو وہ ایسا کرے گی۔" اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اس عورت کے اپنے بچے پر رحم کرنے کی بہ نسبت زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔" (80)

لہٰذا ہمیں زیادہ مبنی بر تسامح سوچ رکھنی چاہیے، لیکن اس سے کسی کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم رحمت الٰہیہ سے زیادہ جھوٹی رحمت کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں یا اپنے آپ کو جنت کے ٹکٹ بانٹنے والے سمجھتے ہیں، ایسی بات ہر گز نہیں، تاہم ہم اہل السنت والجماعت کے زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں، جس کا حدیث قدسی "میری رحمت میرے غضب پر حاوی ہے۔" (81) پر ایمان ہے۔

اس مسئلے کا ایک اور اہم پہلو بھی ہے، جس کا تعلق ہم سے ہے۔ ہم اپنے نوجوانوں کے سامنے صحیح انداز سے حقائق پیش نہیں کر سکے۔ ہم نے نہ صرف مسلمان بلکہ ساری دنیا کے نوجوانوں کو نظر انداز کر رکھا ہے، حالانکہ وہ ہمارے پاس موجود پیغام کے ہوا اور پانی سے زیادہ محتاج ہیں۔ جب ہم اپنی حالت کا مختصر سی مدت میں دنیا بھر میں ہدایت کی مشعل لے کر پھرنے والے صحابہ کرام کی حالت اور ان کے بعد آنے والے تابعین کی جدوجہد کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو ہماری سستی، کاہلی اور جمود واضح نظر آتا ہے۔ ہدایت اور روشنی کے محتاج دلوں کی تلاش صحابہ کرام اور تابعین کی نہ صرف عادت تھی، بلکہ انہوں نے اس روشنی کو ساری انسانیت تک پہنچانے کو اپنا مقصد زیست بنا رکھا تھا۔

ساری دنیا کو ہماری ضرورت ہے۔ ان کی پکار پر لبیک کہنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس مسئلے کا یہ پہلو ہم سے متعلق ہے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے: "کیا ہم نے مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس ذمہ داری کو ادا کیا ہے؟" اگر ہم نے اسے ادا نہیں کیا تو ہمیں بہت سے سوالوں کا جواب اور بہت سی باتوں کا حساب دینا ہو گا۔

دنیامیں ہماری آزمائش کیسے ہوتی ہے؟وحدت سے یاافتراق سے؟کیاصحابہ کرام کی بھی ایک دوسرے کے ذریعے آزمائش کی گئی؟

ایک آیت مبارکہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ﴾ (الأنعام:۵۳)"اور اسی طرح ہم نے بعض لوگوں کی بعض سے آزمائش کی ہے۔"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کو ایک دوسرے کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔اس موضوع پر ہم درج ذیل نقاط کی صورت میں روشنی ڈال سکتے ہیں :

اول: انسانوں میں سے ہی بعض افراد کو نبی کی حیثیت سے مبعوث کیا جاتا رہا ہے۔نبی اپنے معاشرے کے لوگوں کے لیے آزمائش ہوتا تھا،یہی صورتحال ہمارے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت پیش آئی۔اس دور کے بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا کہ ابوطالب کے یتیم اور فقیر بھتیجے جس کے پیروکاروں میں صاحب حیثیت لوگ بھی شامل نہیں کو کیوں نبی بناکر بھیجا گیا؟اگر کسی نبی کی بعثت ناگزیر تھی تو طائف کے مسعود بن عروہ یامکہ کے ولید بن مغیرہ کو نبی بناکر بھیجا جاتا،نیز اگرچہ قریش ایک ممتاز قبیلہ ہے،لیکن طاقتور ترین قبیلہ نہیں،جبکہ نبی کو طاقتور ترین قبیلے میں مبعوث ہونا چاہیے تاکہ اس کے قبیلے کے لوگ اس کا دفاع اور حفاظت کر سکیں۔انہوں نے یہ اعتراض بھی اٹھایا کہ نبی کو فرشتہ ہونا چاہیے تھا۔جو شخص ہماری طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے،بھلا وہ نبی کیسے ہو سکتا ہے؟آج بھی بعض ان لوگوں کے لیے اس میں آزمائش کا پہلو ہے،جو یہ کہتے ہیں کہ جس شخص کی نو بیویاں ہوں بھلا وہ نبی کیسے ہو سکتا ہے؟

اوپر ذکر کردہ اعتراضات سے جو بات مجموعی طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے آزمایا جاتا ہے۔اس عالم رنگ و بو میں حضرت انسان کی آمد کا مقصد ہی آزمائش ہے،تاکہ آزمائش کے مرحلے سے گزرنے کے بعد اچھے برے اور کھرے کھوٹے میں تمیز ہو جائے۔صرف اسی صورت میں دنیا کی تخلیق کے مقصد کی تکمیل ہو سکتی ہے۔اگر دنیامیں اس

قسم کی آزمائش نہ ہوتی تو حضرت ابو بکر صدیق کی ہیرے کی طرح کی روشن شخصیت ابو جہل کی کوئلے کی طرح کی سیاہ شخصیت سے کیسے ممتاز ہوتی؟ دوسرے لفظوں میں اگر یہ امتحان نہ ہوتا تو "حقیقت احمدیہ" کا ظہور ہوتا اور نہ ہی وہ خیرہ کن آفتاب کی صورت میں جلوہ گر ہو کر ضیا پاشی کرتی۔

رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے انہیں معدنیات سے تشبیہ دی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "دورِ جاہلیت کے بہترین لوگ اگر دین کی سمجھ سے بہرہ مند ہو جائیں تو وہ دورِ اسلام میں بھی بہترین کہلائیں گے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام لوگوں کے مزاجوں کو پگھلا کر مخصوص مدت کے لیے مخصوص سانچوں میں ڈھال دیتا ہے اور پھر ان کی شخصیتوں کو نکھارنے کے لیے انہیں ان کی روحوں کے ساتھ یک جان کر دیتا ہے، گویا ان کی فطرت میں حقیقت کی طرف جو میلان پنہاں ہوتا ہے اسے عیاں کر دیتا ہے، تاہم معدنیات اپنی خصوصیات کو ہمیشہ برقرار رکھتی ہیں، چنانچہ سونا سونا، چاندی چاندی اور تانبا تانبا ہی رہتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ یہ معدنیات کھوٹ سے پاک ہو کر صاف ستھری ہو جاتی ہیں، چنانچہ آزمائشیں اور امتحانات ان معدنیات کو کھوٹ اور ملاوٹ سے پاک کر کے صاف کرنے کے طریقے ہیں۔

دوم : شیطان کو جن لوگوں کے گمراہ ہونے کی توقع نہیں ہوتی انہیں گمراہی کا شکار کرنے کے لیے بعض بری چیزوں کو خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے۔ شیطان کے ہاتھ میں کھلونا بننے والے ایسے لوگوں میں بعض اوقات اچھی خاصی روحانیت کے حامل لوگ بھی شامل ہوتے ہیں۔ برائی کو مزین کر کے اور اچھائی کو بدنما اور ناپسندیدہ صورت میں پیش کرنا بسا اوقات معمولی کام دکھائی دیتا ہے، لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے اور اس کے نتائج اس قدر تباہ کن ہیں کہ اس کی نسبت شیطان کی طرف بھی کی جا سکتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے شیطان کے لیے "المزیّن" (خوبصورت بنا کر پیش کرنے والا) کا نام استعمال کیا ہے۔

نیز ہماری آزمائش کا ایک پہلو وہ مسابقتی جذبات بھی ہیں، جنہیں شیطانی نفوس اور نفسانی خواہشات ہمارے دلوں میں بھڑکاتی ہیں حتی کہ رشک کا احساس جو بظاہر ایک پاکیزہ جذبہ دکھائی

دیتا ہے اور لوگوں کو دینی خدمات سرانجام دینے میں مسابقت پر ابھارتا ہے اگر محض منافست کے جذبے میں بدل جائے تو اس میں آزمائش کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً اگر لوگوں کی ہدایت کے سلسلے میں ایک شخص کی کوششیں کسی دوسرے شخص کی کوششوں کی بہ نسبت زیادہ ثمر آور ثابت ہوں تو اگر مؤخر الذکر شخص اول الذکر شخص سے حسد کرنے لگے تو یہ اس کے لیے آزمائش بن جائے گی۔

اگرچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَإِنَّکَ لَتَهْدِیٓ إِلَیٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِیمٍ﴾ (الشوری:۵۲) ''اور بیشک اے نبی تم سیدھا رستہ دکھاتے ہو۔''لیکن ایک دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّکَ لَا تَهْدِی مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَکِنَّ اللّٰهَ یَهْدِی مَن یَشَاءُ﴾(القصص:۵۶) ''اے نبی تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ مرشد صرف سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا اور اس پر روشنی ڈالتا ہے، تاکہ انسانیت اس صراط مستقیم پر چل کر حق سبحانہ و تعالیٰ کو پالے اور گمراہی سے بچ جائے، لیکن نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اور وہی دلوں کو ایمان کی دولت سے سرفراز فرماتے ہیں۔ اس کا کوئی خارجی وجود نہیں، یعنی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ قدرت اور ارادے کے دائرے میں موجود ہے، بلکہ اس کا وجود محض علمی اور اضافی ہے۔

آزمائش کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو فصاحت اور تقریر کا ایسا ملکہ عطا فرماتے ہیں، جس کی بدولت وہ قرآنی حقائق پر بہترین اور خوبصورت انداز میں روشنی ڈالتا ہے۔ اسے دیکھ کر کسی اور کو اس سے حسد ہونے لگتا ہے اور وہ حسرت سے کہنے لگتا ہے: ''مجھے بھی اس طرح کی صلاحیت کیوں نہ دی گئی؟'' یہ بھی ایک طرح کی آزمائش ہے، جس کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔

یہ درست ہے کہ تمام رسول اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے تھے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو دوسروں پر فضیلت عطا کی ہے: ﴿تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ

عَلَى بَعْضٍ﴾ (البقرة:۲۵۳)"یہ پیغمبر جو ہم وقتاً فوقتاً بھیجتے رہے ہیں ان میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔" اس آیت مبارکہ سے ہماری اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بعض رسولوں کو خاص خاص فضائل عطا فرمائے ہیں اور انہیں ایسے مقامات عطا فرمائے ہیں، جن تک دیگر انبیائے کرام کی رسائی نہیں ہوئی، تاہم مجموعی طور پر نبوت ایسی فضیلت ہے کہ دنیا کی کوئی اور فضیلت اس کی ہم پلہ نہیں اور بعض انبیائے کرام میں بعض مخصوص فضائل کے نہ پائے جانے سے ان کی نبوت پر کسی بھی طرح آنچ نہیں آتی۔

حسد اور شکایت کے احساس پر مشتمل "کیوں" کے سوال کی اور بھی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں: "میں دعوت کے سلسلے میں اِس سے زیادہ خدمات کیوں نہیں پیش کر سکتا؟" "میں دوسروں کی اِس سے زیادہ مالی مدد کیوں نہیں کر سکتا؟" "اِس سے زیادہ لوگ میری بات کیوں نہیں سنتے؟" اس طرح کے سینکڑوں سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں۔ درحقیقت اس قسم کے سوالات مسلمانوں کی وحدت کے لیے انتہائی مضر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آغاز سے ہی مسلمانوں کو اختلاف کا باعث بننے والے تمام اسباب سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ آیت مبارکہ ﴿وَلاَ تَنَازَعُواْ فَتَفْشَلُوا﴾ (الأنفال: ۴۶)"اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا کہ ایسا کروگے تو تم بزدل ہو جاؤ گے۔" میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ آیت مبارکہ اہل ایمان کو مخاطب کر کے انہیں تاکید کرتی ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے مادی یا روحانی اختلافات میں نہ پڑیں، بلکہ مشترکہ نقاط پر متحد رہنے کی کوشش کریں اور مثبت پہلوؤں کے بارے میں بھی اختلاف کرنے سے گریز کریں۔ حسد، منافست اور رشک کو نزاع کا باعث نہ بننے دیں، ورنہ ان کی ہوا اکھڑ جائے گی اور قوت ختم ہو جائے گی۔ انفرادی کاموں کے ثمرات انفرادی سطح تک محدود رہتے ہیں، جبکہ جماعتی سطح پر کیے جانے والے کاموں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ کا نزول ہوتا ہے اور ہر فرد کو پوری جماعت جتنا اجر وثواب ملتا ہے۔

انفرادی عبادت کا ثواب ہر فرد کو علیحدہ علیحدہ ملتا ہے، لیکن اس کے برعکس اجتماعی عبادت میں دعا کے لیے آسمان کی طرف ہاتھ بلند کرنے، دلوں کے ایک ساتھ دھڑکنے، اجتماعی طور پر

مشقت اٹھانے اور ایک ہی چیز کو مل کر مانگنے کے نتیجے میں پوری جماعت پر بھرپور رحمت الٰہیہ کا نزول ہوتا ہے۔ یہ بات انفرادی طور پر حاصل نہیں ہو سکتی۔ انفرادی جدوجہد سے انسان زیادہ سے زیادہ اپنے کنبے کا سربراہ بن سکتا ہے، لیکن اگر پوری جماعت کی صفیں سیدھی ہو جائیں اور وہ ایک دوسرے سے تعاون کریں تو پورے معاشرے کی سطح پر ایک مؤثر قوت وجود میں آئے گی اور اس جماعت کے زیر سایہ رہنے والے لاکھوں افراد میں سے ہر ہر فرد اپنے آپ کو اپنی قوم کی طاقت کا نمائندہ تصور کرے گا اور اس طاقت کی بدولت انہیں بیرونی طاقتوں سے تحفظ ملے گا۔ اگر کسی فرد نے اس وحدت اور صف سے نکل کر کوئی انفرادی پناہ گاہ تلاش کرنے کی کوشش کی تو اس کے سر سے جماعت کا سایہ اٹھ جائے گا اور اس کے اوپر ایک چھوٹی سی چھتری رہ جائے گی۔ ایسی صورتحال میں حدیث مبارک ”جیسے تم ہوگے ویسے ہی تمہارے حکمران ہوں گے۔“(82) کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور جلد ہی قوم کو اس کے نتائج بھگتنے پڑتے ہیں۔

اگر معاشرے میں بھلائی ہو اور اس کا اپنے خالق کے ساتھ تعلق مضبوط ہو تو دوسرے معاشرے اس کا احترام کرتے ہیں۔ غارِ ثور میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہی صورتحال پیش آئی تھی، لہٰذا اگر ہم دو ہوئے تو تیسرے اللہ تعالیٰ، تین ہوئے تو چوتھے اللہ تعالیٰ، چار ہوئے تو پانچویں اللہ تعالیٰ اور چھ ہوئے تو ساتویں اللہ تعالیٰ ہوں گے ... کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے ساتھ نصرت کا وعدہ فرمایا ہے۔

لیکن اگر ہم نے انفرادی طور پر اپنا اپنا کردار ادا کیا اور ایک دوسرے کے ساتھ کماحقہ تعاون نہ کیا تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس برکت سے محروم فرما دیں گے، جس سے وہ جماعت کو نوازتے ہیں، دوسرے لفظوں میں ایسی صورتحال میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی معیت اور حمایت حاصل نہ ہوگی۔ اگر معاشرے کے افراد صالح ہوں تو ان سے صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسے معاشرے کی مدد فرماتے اور اسے اپنی خصوصی حفاظت اور رحمت میں لے لیتے ہیں، جس کے نتیجے میں فرد کو اپنی مخصوص چھتری کے ذریعے اپنی حفاظت کرنے کے بوجھ سے چھٹکارا مل جاتا ہے، کیونکہ اسے آسمانی امن کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے۔

بلاشبہ توفیقِ الٰہی کے حصول کے لیے جماعت ایک اہم اور فعال ذریعہ ہے۔ اگر کوئی انسان ساری زندگی کہیں گوشہ نشین رہے، اپنے اوقات صوم و صلوٰۃ کی ادائیگی میں صرف کرے، اپنی ساری دولت مساکین پر لٹادے، حج ادا کرے، حجر اسود پر آنسو بہائے اور مکہ معظمہ یا روضہ شریف میں جہاں نماز کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے نماز ادا کرے تب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے ملنے والا اجر و ثواب انفرادی سطح تک ہی رہے گا، لیکن جونہی وہ اپنا ہاتھ جماعت کے ہاتھ میں دے گا اس کے دل میں اس کی قوم جتنی وسعت پیدا ہو جائے گی۔ قرآن کریم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کہتا ہے: ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً﴾ (النحل: ۱۲۰) "بیشک ابراہیم لوگوں کے امام تھے۔" گویا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولوالعزمی کی تصویر پیش کرنے کے لیے انہیں ایک فرد کی بجائے پوری قوم کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔

اولوالعزم اور بلند حوصلہ افراد پر مشتمل معاشرے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت و حمایت ہوتی ہے۔ اگرچہ اہل ایمان کی ہمتیں عام طور پر بلند ہوتی ہیں، لیکن اکثر اوقات ایک دوسرے کے ذریعے آزمائے جانے کے وقت بہت کم لوگ آزمائش پر پورے اترتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات چھوٹے چھوٹے اور سادہ سے تخمینے خانہ کعبہ جیسے تقدس کی حامل وحدت، اتفاق اور شیرازہ بندی کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں اور یہ صورتحال ہر دم متوقع عنایت الٰہیہ کے متوجہ ہونے سے مانع بن جاتی ہے۔

پہلے لوگوں کا کہنا ہے: "بقدر الكدّ تكتسب المعالی" (محنت کی بقدر بلندیاں ملتی ہیں۔) اگرچہ یہ حدیث نبوی نہیں ہے، لیکن جوامع الکلم میں سے ضرور ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ جس قدر مشقت اٹھائی اور جدوجہد کی جائے گی اسی قدر مادی اور روحانی کامیابیاں نصیب ہوں گی۔ کون جانتا ہے کہ ایک بیج کو مٹی سے اپنی کونپل نکالنے کے لیے زیر زمین کس قدر تکلیف اور مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ وہ پھٹتا ہے، زمین کو پھاڑنے کی تکلیف برداشت کرتا ہے اور سورج کی

تمازت کا سامنا کرنے کے لیے اپنے اندر استعداد پیدا کرتا ہے۔ چونکہ یہ تمام جدوجہد اور مشقتیں وجود اور نئی زندگی حاصل کرنے کی خاطر ہوتی ہیں، اس لیے ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ جس قدر ہم پر اللہ تعالیٰ کی توفیق اور انعامات کی بارش ہوتی ہے اسی قدر ہم پر ذمہ داری کا بوجھ زیادہ ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے ہمیں جو عالی مقام عطا فرمایا ہے اس میں ہماری ذاتی قابلیت یا فضیلت کا کچھ بھی دخل نہیں۔ ہمیں اسے لطفِ الٰہی سمجھنا چاہیے۔ جب بھلائی اور جمال کے مختلف مظاہر کا ہمارے پاس سے گزر ہوتا ہے تو وہ ہمارے دروازوں پر دستک دیتے جاتے ہیں، کیونکہ ہمیں ان کی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ضرورت ہے۔ ہم خود اس جمال کا مظہر کسی صورت نہیں بن سکتے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ جو لطف الٰہی ہمارے سروں پر برستا اور ہمارے سارے وجود میں سرایت کرتا ہے وہ جماعت کی برکت ہے۔ کوئی بھی شخص انفرادی طور پر اپنے آپ کو اس کا باعث نہیں قرار دے سکتا۔

سوم: جماعت کے وجود کے لیے مادی مفاد بھی آزمائش کی ایک صورت ہے۔ سیاست دانوں کے اختلافات کے پیچھے یہی محرک کارفرما ہوتا ہے۔ یہ اختلافات مادی مفادات سے متعلق نزاعات پر مبنی منفی اور تخریبی فکر کا نتیجہ ہوتے ہیں، کیونکہ مخصوص عہدوں پر بہت سے لوگوں کی نظریں جمی ہوتی ہیں اور نہ ختم ہونے والی خواہشات کے بندے اپنے ذاتی مفادات اور مصلحتوں کے پیچھے دوڑتے ہیں، جس کے نتیجے میں اختلاف اور نفاق جنم لیتا ہے اور قوم کی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے، حالانکہ کسی سے صلے یا شکریے کی توقع رکھے بغیر ہر قسم کی ذمہ داری اور قربانی صرف رضائے الٰہی کے حصول کے لیے پیش کی جانی چاہیے تھی۔ اگر ایسا ہو جائے تو اختلافات اور جھگڑوں کا باعث بننے والے مادی مفادات کے امتحان میں بہت سے لوگ سرخرو ہو جائیں۔ ہم نے یہ ساری گفتگو وحدت اور شیرازہ بندی سے متعلق سوال کے جواب میں کی ہے، ورنہ انسان کو پیش آنے والی آزمائش کی صورتیں بہت زیادہ ہیں۔ ان کی تحدید ممکن نہیں۔ چونکہ سوال کا ایک حصہ

اس قسم کی آزمائش کے صحابہ کرام کو پیش آنے سے متعلق ہے، اس لیے ہم اس بارے میں بھی کچھ معروضات پیش کرنا مناسب خیال کرتے ہیں۔

صحابہ کرام کے اس قسم کی آزمائش سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، چونکہ وہ روحانیت کے بلند ترین مقام پر فائز تھے، اس لیے ان کا سخت ترین آزمائشوں میں گرفتار ہونا خصوصاً ان ادوار میں جب امورِ سلطنت چلانے کے طریقِ کار کے بارے میں مختلف اجتہادی آراء سامنے آرہی تھیں امر لابدی تھا، لیکن آزمائش کی شدت و سختی کے باوجود کسی ایک صحابی نے بھی راہِ حق کی تلاش نہ چھوڑی۔ جب ان میں سے کسی کو احساس ہوا کہ وہ حق پر نہیں ہے تو اس نے ایسے حالات میں اپنی تلوار نیام میں ڈال لی جب ایسا کرنا آسان نہ تھا۔

جب ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مقابلے کے لیے نکلیں تو انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انہیں اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بھی یاد آگئی چنانچہ وہ اپنے اس اقدام پر سخت نادم ہوئیں اور واپس لوٹ آئیں۔(83)

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بہادر اور خوددار انسان تھے۔ وہ نو برس کی عمر میں اسلام لائے۔ ان کا چچا انہیں چٹائی میں لپیٹ کر اسے آگ لگا دیتا اور ان سے اسلام کو چھوڑنے کا مطالبہ کرتا، لیکن یہ ایذا رسانی اور تعذیب انہیں کسی بھی چیز سے دستبردار ہونے پر مجبور نہ کر سکی۔ رسول اللہ ﷺ ان کی شجاعت اور خودداری کی طرف توجہ دلانے کے لیے فرمایا کرتے تھے: "ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری ہوتا ہے۔ میرا حواری زبیر بن عوام ہے۔" (84)

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے تھے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیر بن عوام اور اپنے داماد اور چچازاد بھائی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مدینے کی گلیوں میں اکٹھے جاتے ہوئے دیکھا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو آپس میں محبت کرنے والے ان نوجوانوں کے مستقبل کے حالات کے

بارے میں بتا دیا تھا، اس لیے آپ ﷺ کو علم تھا کہ میرا پھوپھی زاد بھائی زبیر ایک دن میرے داماد اور چچازاد بھائی علی کے مدمقابل کھڑا ہوگا، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "بخدا تم ضرور اس سے ایسی حالت میں لڑوگے کہ تم ظالم ہوگے۔" اس بات پر سالوں گزر گئے اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو یہ بات بالکل بھول گئی۔ زمانہ بدل گیا اور ایک دن جنگ جمل میں حضرت زبیر نے اپنے آپ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے آمنے سامنے پایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اے زبیر! میں تمہیں خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں یاد نہیں کہ ایک دفعہ ہم دونوں ایک جگہ جمع تھے کہ رسول اللہ ﷺ تمہارے پاس سے گزرے اور تم سے فرمایا: "اے زبیر! کیا تم علی سے محبت نہیں کرتے؟" تم نے کہا: "کیا میں اپنے خالہ زاد، پھوپھی زاد اور اپنے ہم مذہب سے محبت نہیں کرتا؟" اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اے زبیر! ایک دن تم ضرور اس سے ایسی حالت میں جنگ کروگے کہ تم ظالم ہوگے۔" اس پر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "بلاشبہ آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی، لیکن میں اسے بالکل بھول گیا تھا آج مجھے یہ بات یاد آگئی ہے۔ بخدا! میں تم سے جنگ نہ کروں گا۔"[85]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ بات حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے سر پر بجلی بن کر گری۔ انہیں آپ ﷺ کی کئی سال پہلے کی ارشاد فرمودہ حدیث یاد آگئی اور انہوں نے اپنی تلوار فوراً نیام میں ڈال لی، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گلے ملے اور معافی و درگزر کی درخواست کی۔ اس کے بعد وہ گھوڑے پر سوار ہوئے اور جنگ سے علیحدگی اختیار کرلی، لیکن ایک بدبخت نے پیچھے سے وار کر کے انہیں شہید کر دیا اور ان کا سر کاٹ کر انعام کی امید سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خیمے میں لے آیا۔ جب خیمے کے پہرے دار نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو واقعے کی اطلاع دی تو انہوں نے فرمایا: "حضرت زبیر کے قاتل کو جہنم کی بشارت سنادو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: "ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری ہوتا ہے۔ میرا حواری زبیر ہے۔"[86]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے پاس سے کوئی بات ارشاد نہ فرماتے تھے، بلکہ وہی بات ارشاد فرماتے جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوتی تھی۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا صحابہ کرام کو بھی آزمایا گیا، لیکن ان کی آپس کی لڑائی اجتہاد کی بنیاد پر حق کی خاطر ہوتی تھی اور جب انہیں معلوم ہوتا کہ وہ حق پر نہیں ہیں تو فوراً جنگ چھوڑ کر صلح کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی تقدیر پر اعتراض نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرتے تو مصیبت دہری ہو جاتی۔ وہ جب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی آزمائش میں مبتلا ہوئے، انہوں نے قرآن کی روشنی میں اپنی فراست کو استعمال کرتے ہوئے حق تک پہنچنے کی کوشش کی۔

ایک دفعہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کسی بات پر ناراض ہو گئے اور اٹھ کر چلے گئے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ معذرت کرنے کے لیے ان کے پیچھے پیچھے گئے، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی معذرت قبول نہ کی اور اپنے گھر کا دروازہ بند کر دیا، تاہم تھوڑی ہی دیر بعد انہیں اپنے رویے پر ندامت ہوئی اور حضرت ابو بکر رضی اللہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ دوسری طرف حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کو واقعے سے آگاہ کیا تاکہ آپ ﷺ اس کا کوئی حل نکالیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حاضرین مجلس سے ارشاد فرمایا: "تمہارے یہ ساتھی بھلائی میں سبقت لے گئے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد انہوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو آتے ہوئے دیکھا تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ سے اپنے طرزِ عمل کے بارے میں پوچھیں تاکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ان کی گفتگو سے جو تکلیف پہنچی ہے وہ اس سے درگزر فرمائیں۔ انہیں دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کو غصہ آ گیا، جبکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کہنے لگے: "بخدا یا رسول اللہ! زیادتی میری طرف سے ہوئی تھی۔" اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے دنیا کو اپنے ہاں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقام سے آگاہ کرنے کے لیے فرمایا: "کیا تم میری خاطر میرے ساتھی کو چھوڑو گے نہیں؟ کیا تم میری خاطر میرے ساتھی کو چھوڑو گے نہیں؟ جب میں نے کہا تھا: "اے لوگو! میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم سب کی طرف رسول ہوں تو تم نے میری تکذیب کی، لیکن ابو بکر نے میری تصدیق کی۔" (87)

یہاں ہم جس بات پر زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام ہر حال میں حق پر قائم رہتے، اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے، حق کی جستجو میں رہتے، اسے دوسری ہر چیز پر ترجیح دیتے اور اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے۔

حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے چھ ماہ تک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی اور ان کے گرد چاہنے والوں کا ایک ایسا حلقہ موجود تھا، جو ان سے خلافت کے مطالبے پر اصرار کا خواہاں تھا۔ چھ ماہ کے بعد جبکہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کی وفات کو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا وہ مسجد نبوی میں تشریف لائے اور مسجد میں موجود لوگوں سے فرمایا: ''میرے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت سے چھ ماہ تک رکنے کا باعث ان کی مخالفت تھی اور نہ ہی آج میرے آنے کا سبب کسی قسم کا خوف ہے، بلکہ چونکہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ خلافت و امارت ان کا حق ہے، اس لیے میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے آگیا ہوں۔''

انسان کو ''الوقاف عندالحق'' (حق کی شدت سے پاسداری کرنے والا) ہونا چاہیے۔ صحابہ کرام حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ''الوقاف عندالحق'' (حق کی شدت سے پاسداری کرنے والے) کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ کسی بھی مسئلے میں وہ اپنی رائے کو اہمیت نہ دیتے تھے، کیونکہ کسی بھی معاملے میں ان کی رائے کی تصحیح کے لیے کسی آیت مبارکہ یا حدیث نبوی کا حوالہ دیا جاتا تو وہ فوراً اپنی ذاتی رائے سے رجوع کر کے حق بات کو قبول فرما لیتے تھے۔

ایک مرتبہ اپنے دورِ خلافت میں منبر پر خطبہ دیتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں کو عورتوں کو زیادہ مہر دینے سے منع فرمایا تاکہ نوجوانوں کا بوجھ کم ہو اور ان کے لیے شادی کرنا آسان ہو، لیکن جب وہ منبر سے اترے تو ان سے ایک قریشی خاتون ملی اور کہا: ''اے امیر المؤمنین! اللہ کی کتاب پیروی کی زیادہ حقدار ہے یا آپ کی بات؟'' انہوں نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب، لیکن بات کیا ہے؟'' اس خاتون نے کہا: ''آپ نے ابھی لوگوں کو عورتوں کو زیادہ مہر دینے سے منع کیا

ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَاراً فَلاَ تَأْخُذُواْ مِنْهُ شَيْئاً ﴾ (النساء: ۲۰) "اور اگر تم ایک عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت کرنی چاہو اور پہلی عورت کو ڈھیر سامال دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ مت لینا۔" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پورے احترام سے اس کی بات سنی۔ اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نصیحت غلط نہ تھی، لیکن اپنی حساس مزاجی اور ادب کی بناپر انہوں نے فرمایا: "ہر ایک عمر سے زیادہ سمجھ دار ہے۔" یہ کہہ کر وہ واپس منبر پر گئے اور لوگوں سے کہا: "میں نے تمہیں عورتوں کو زیادہ مہر دینے سے منع کیا تھا، لیکن (میں اپنی بات سے رجوع کرتا ہوں) آدمی اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے۔"(88)

یہ بات نہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دین سے ناواقف تھے، لیکن ان کا حق کے بارے میں ادراک اس قدر گہرا اور اس کے ساتھ تعلق اس قدر مضبوط تھا کہ انہوں نے اس عورت کے سامنے تاویل یا اعتراض کا راستہ اختیار کرنا پسند نہ کیا، بلکہ سادگی سے حق کو قبول کر لیا۔ بڑے بڑے اہم کارنامے ایسی ہی عظیم ہستیوں نے سر انجام دیئے ہیں۔ جس قدر ہم صحابہ کرام جیسے مزاج کو اپنانے کی کوشش کریں گے، اسی قدر اللہ کی توفیق ہمارے شامل حال ہو گی۔ مناسبت علت کے قاعدے سے اگر ایک دور میں ایک مخصوص وزن کو اٹھانے کے لیے مضبوط پٹھوں کی ضرورت ہو تو کسی دوسرے دور میں اس وزن کو اٹھانے کے لیے بھی اتنے ہی مضبوط پٹھے درکار ہوں گے۔ کمزور بازؤں کے ذریعے اسے اٹھانا ممکن نہ ہو گا۔ جس طرح ایک کلوگرام کا صحیح وزن کرنے کے لیے ترازو کے دوسرے پلڑے میں بھی ایک کلوگرام وزن رکھنا ضروری ہے، اسی طرح جن عظیم حقائق کی فتح یابی کے لیے صحابہ کرام جیسے حضرات درکار تھے، غلبے اور نصرت کے لیے آج بھی ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔ کمزور و ناتواں لوگوں کے ہاتھوں ان حقائق کے غلبہ و فتح کی امید کرنا لاحاصل ہے، لہٰذا دشمنوں کی فتنہ انگیز سازشوں کو ناکام بنانے کی خاطر ہمارے لیے صحابہ کرام کی طرح حق کو تھامنے اور یکجہتی اور صف بندی کرنا ناگزیر ہے۔ ہمارے جذبات کو

عروج پر دیکھ کر ان پر مایوسی کے تاریک بادل چھا جائیں گے، لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب ہم نفس پرستی چھوڑ کر حق کے دامن کو مضبوطی سے تھام لیں۔ یکجہتی اور مضبوط صف بندی کے حصول کی صرف یہی صورت ہے۔

موجودہ حالات میں دنیا کا صحیح مقام کیسے متعین کیا جا سکتا ہے؟ ہم سے دنیا اور آخرت میں صحیح توازن قائم نہیں ہوتا؟ دور نبوی اور اس کے بعد صحابہ کرام اس میں کیسے کامیاب ہوئے تھے؟

بہت سی قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہمارے راستے کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ انسان عالم ارواح سے رحم مادر میں آتا ہے اور وہاں سے دنیا کی طرف منتقل ہوتا ہے، جہاں بچپن، جوانی، کہولت اور بڑھاپے کے مراحل سے گزر کر عالم برزخ میں چلا جاتا ہے اور وہاں سے حشر کی طرف منتقل ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی پالے گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس طویل سفر کے دوران میں انسان اس دنیا میں صرف چند دن قیام کرتا ہے۔ دنیا انسان کی بہت سی منزلوں میں سے صرف ایک منزل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انسان کو ایک ایسے مسافر سے تشبیہ دی ہے، جو دن کا کچھ حصہ کسی درخت کے سایے میں گزار کر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔(89) انسان کا سفر بہت لمبا ہے۔ وہ سفر کے دوران میں کچھ دیر ستانے کے لیے تھوڑی دیر کسی درخت کے سایے میں گزارتا ہے، لیکن دنیا اس کا ہمیشہ کا ٹھکانہ یا دائمی منزل نہیں ہے، بلکہ تھوڑی دیر آرام کرنے کی جگہ ہے۔

ہمارا اصلی گھر عالم اروح ہے۔ ہم اپنی ابدی زندگی کو تشکیل دینے کے لیے وہاں سے جسمانی لباس میں اس دنیا میں آئے ہیں اور پھر واپس اپنے اصلی وطن کی طرف لوٹ جائیں گے، لہٰذا ہمیں اسی پہلو سے دنیا کی قدر و منزلت کا تعین کرنا چاہیے۔

چونکہ مؤمن ایک متوازن انسان ہوتا ہے، اس لیے اسے اپنے آپ کو اس بارے میں افراط و تفریط کا شکار ہونے سے بچانا چاہیے۔ اس بارے میں واجب الاتباع معیار یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں سے ہر ایک کو اسی قدر اہمیت دی جائے، جس قدر اس میں انسان کو رہنا ہے، قرآنِ کریم سے ہمیں یہی روشنی ملتی ہے: ﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (القصص: ۷۷) ”اور جو مال تم کو اللہ نے عطا فرمایا ہے اس سے آخرت کی بھلائی طلب کیجیے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھلائیے۔“

اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیا دیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عقل، دل، روح، جسم، صحت، جوانی اور دوسری بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ یہ سب سرمایہ ہے، جس سے ہم آخرت کو خرید سکتے ہیں۔ ایک دوسری آیت مبارکہ میں اس موضوع پر درج ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الجَنَّةَ ﴾ (التوبہ: ۱۱۱) "اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں اور اس کے عوض ان کے لیے بہشت تیار کی ہے۔"

اس سودے میں انسان فانی اور زائل ہونے والا سامان پیش کرتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ لازوال اور ہمیشہ برقرار رہنے والی چیزیں مرحمت فرماتے ہیں۔ اس عقد کے ذریعے قرآنِ کریم ہمیں آخرت کو خریدنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لیے ہمیں اپنی ہر ہر حرکت اور کام میں آخرت کو پیش نظر رکھنا چاہیے، کیونکہ وہاں ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے، جبکہ دنیا آخرت تک پہنچانے کا واحد راستہ اور اسے حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

اگرچہ آیت مبارکہ ہمیں دنیا میں سے اپنے حصے کو فراموش نہ کرنے کی تاکید کرتی ہے، لیکن اپنے اسلوب سے ہمیں اس بات کا احساس بھی دلاتی ہے کہ اصل ہدف اور مقصد آخرت ہی ہے، جس کا انتخاب کر کے ہمیں اس کے لیے تگ و دو کرنی چاہیے، کیونکہ آخرت میں انسان کی تمام پہلوؤں سے ترقی اور بلندی ہوگی۔ اگر دنیوی زندگی کو بیج سے تشبیہ دی جائے تو آخرت اس بیج سے پھوٹنے والا بلند و بالا درخت ہے۔

وہاں انسان کے تمام حواس اور احساسات غیر محدود طور پر بڑھ جائیں گے اور دیکھنے، چکھنے اور سننے وغیرہ کی صلاحیتوں میں دنیا کے مقابلے میں تقریباً ایک ہزار گنا تک اضافہ ہو جائے گا۔ اہل ایمان جمالِ خداوندی کا دیدار بھی کریں گے۔ اس جمال کی تھوڑی دیر کے دیدار کی لذت جنت کے ہزاروں سال کی لذتوں کے برابر ہوگی، لہٰذا جب انسان دنیا اور آخرت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے لگے تو اسے یہ ساری باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ کیا کوئی بھی انسان اپنے خالق و مالک کے دیدار کی سعادت پر کسی دوسری چیز کو ترجیح دے سکتا ہے؟ جبکہ یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے

کہ رضائے الٰہی کا مل جانا ایک ایسی نعمت ہے، جس کے مقابلے میں کسی بھی منصب و عزت کی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ جنت اور اس کی تمام نعمتیں اور زیب و زینت اس کے سامنے ہیچ ہے۔

قرآنِ کریم اس نعمت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتا ہے: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ (التوبۃ:۷۲) "اور اللہ کی رضامندی تو سب سے بڑھ کر نعمت ہے۔" ایک حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو جنت میں اور کافروں کو دوزخ میں بھیجنے کے بعد اہل ایمان سے فرمائیں گے: "اے اہل جنت!" وہ کہیں گے: "اے ہمارے پروردگار! ہم دل و جان سے حاضر ہیں اور ہر قسم کی بھلائی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔" اس پر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: "کیا تم راضی ہو گئے ہو؟" وہ جواب میں کہیں گے: "اے پروردگار! بھلا ہم راضی کیوں نہ ہوں؟ آپ نے تو ہمیں وہ کچھ عطا کیا ہے، جو آپ نے اپنی کسی دوسری مخلوق کو نہیں دیا۔" اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: "کیا میں تمہیں اس سے بھی بہتر چیز نہ دوں؟" اہل ایمان پوچھیں گے: "اے پروردگار! بھلا اس سے بہتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟" اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے: "میں تمہیں اپنی خوشنودی عطا کرتا ہوں اور آج کے بعد میں تم سے کبھی ناراض نہ ہوں گا۔"(90)

اگر ہم زندگی کے لیے یہ معیار مقرر کریں تو اسے کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس صورت میں اس سے محبت اس کی ذات کی بجائے آخرت کا راستہ اور پل ہونے کی حیثیت سے ہوگی۔ اس قسم کے تعلق میں کوئی ممانعت نہیں پائی جاتی۔ حدیث شریف میں دنیا کو واضح الفاظ میں "آخرت کی کھیتی" قرار دیا گیا ہے، بلکہ ہم اس سے بڑھ کر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم میں جنت کے حصول کی اہلیت دنیا کے واسطے سے ہی پیدا ہو سکتی ہے، کیونکہ یہاں ہمارے تمام حواس، احساسات، لطائف اور صلاحیتوں میں اضافہ اور وسعت پیدا ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں ہم جمالِ خداوندی کے دیدار کے اہل بنتے ہیں۔

دنیا میں انسان کے اللہ تعالیٰ کو نہ دیکھ سکنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اس کی اہلیت ہے اور نہ ہی اس میں اس کے لیے مطلوبہ استعداد پیدا ہوئی ہے۔ اس مسئلے کا تعلق زمان و مکان کے ابعاد سے ہے اور نہ ہی کسی اور قسم کے ابعاد سے۔ اللہ تعالیٰ ہم سے ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب

ہیں۔ وہ ہمیں اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں، ہمارے معاملات میں بالارادہ مداخلت اور اپنی لامحدود قدرت سے تصرف کرتے ہیں۔ اس مفہوم کو صوفیاء کی اصطلاح میں یوں تعبیر کیا جاسکتا ہے: "اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی چیز عیاں نہیں ہے، لیکن بے نور آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔" اگر ہم اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے تو اس کا سبب ہماری کمزوری ہے۔ اس کمزوری کو دور کرنا اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے زائل کر دیں گے، جس کے نتیجے میں اہل ایمان جمالِ خداوندی کا دیدار کر کے اپنی مراد پالیں گے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا ایک ایسا کھیت ہے، جس سے ہمیں اتنے اچھے نتائج اور ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ جب انسان دنیا سے آخرت کی طرف منتقل ہوگا تو ایک ایک کر کے نور کے پردے اٹھ جائیں گے، جس کے نتیجے میں وہ اپنے پروردگار کو دیکھ سکے گا۔ دنیا اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی تجلیات کا مظہر ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم دنیا کی کسی بھی چیز کو حقیر نہیں سمجھتے، کیونکہ اشیاء کے حقائق اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کی تجلیات ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی کے الفاظ میں ہمیں اور ہمارے ارادوں کو جو کچھ پیش آتا ہے، وہ بہت بلند بانس پر نصب پرچم کی مانند ہے۔ اس لہراتے پرچم پر تحریریں لکھی ہوئی ہیں۔ ازل و ابد کے مالک اللہ تعالیٰ اس پرچم کو حرکت دیتے اور لہراتے ہیں، لہٰذا ہم اشیاء اور واقعات کو ایسے باغات کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات جلوہ گر ہیں۔ دنیا کی ہر چیز اور واقعہ اللہ تعالیٰ کے تصرف اور ارادے سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ہم ہر پھول اور اس پر موجود شبنم کے ہر قطرے میں اس کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی نے اسی بات کو قدرے مبہم الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

آن خیالاتی کہ دام اولیاست   عکسِ مہرویانِ بستانِ خداست

"وہ خیالات جو اولیائے کرام کا جال ہیں، درحقیقت اللہ تعالیٰ کے باغ کے خوبصورت چہروں کا عکس ہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے اپنی احدیت کی بعض تجلیات کی جلوہ نمائی کی اور پھر اپنے لطف و کرم سے اپنی احدیت کے اسرار کے مطابق ہمیں اپنی بعض نعمتوں کو اپنے فہم کے مطابق

سمجھنے کی توفیق بھی دی۔ میں اس پیچیدہ مسئلے کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، البتہ چونکہ بالواسطہ طور پر اس موضوع کو چھیڑ بیٹھا ہوں، اس لیے اتنا کہوں گا کہ دنیا اللہ تعالیٰ کا باغ ہے اور چودھویں کے چاند کی مانند روشن ہستیوں کے انوار ہمارے دلوں کے آئینوں پر منعکس اور ان میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم جو دنیوی کام سرانجام دیتے ہیں دراصل وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی تجلی کی چھوٹی بڑی لہروں سے عبارت ہیں۔

یاد رہے کہ ہم اس موضوع پر وحدت الوجود یا وحدت الموجود کے قائلین کے نقطہ نظر سے گفتگو نہیں کر رہے، بلکہ ہم امام ربانی شیخ احمد سرہندی کی اس رائے کی تائید کرتے ہیں کہ حقیقی اشیاء کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ سے عبارت ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم دنیا کو نہیں چھوڑ سکتے، کیونکہ اسی کے ذریعے ہم آخرت کی نعمتوں کو حاصل کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ دنیا گندگی اور نجاست کا ڈھیر ہے، لیکن حقائق کے بہت سے نفیس جواہر اسی گندگی میں پوشیدہ ہیں۔ مثنوی میں محمود غزنوی سے متعلق ایک قصہ مذکور ہے۔ اس قسم کے قصے تمثیلی ہوتے ہیں۔ لافونٹن سے بھی پہلے ایک ہندوستانی دانشور "بیدبا" نے جانوروں کی زبانی قصے اور پرحکمت باتیں بیان کی تھیں۔ اس کے بعد بہت سے مسلمان علماء نے اس کی پیروی میں اسی اسلوب پر کتابیں لکھیں۔ مولانا جلال الدین رومی بھی ایسے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے محمود غزنوی اور ان کے کتے کی زبانی ایک قصہ بیان کیا ہے۔ ان کا کتا روزانہ محل کے سامنے موجود کوڑے کے ڈھیر پر جاتا، اسے نوچتا اور اس میں کھانے کی کوئی چیز تلاش کرتا، لیکن اسے کوئی چیز نہ ملتی، لیکن اس کے باوجود وہ دوسرے دن بھی جاتا اور شام تک کھانے کی کوئی چیز تلاش کرتا رہتا تھا۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ ایک دن محمود غزنوی نے اس سے کہا: "کئی دنوں سے تم کوڑے کے اس ڈھیر کو الٹ پلٹ کر رہے ہو۔ تمہیں اس سے کوئی چیز بھی نہیں ملتی، لیکن اس کے باوجود تم ادھر جانا ترک نہیں کرتے۔ کیا تم اس بے فائدہ جستجو سے بیزار نہیں ہوتے؟" کتے نے جواب دیا: "مجھے کوڑے کے اس ڈھیر سے ایک دن ایک ہڈی ملی تھی۔ میں اس امید سے روزانہ وہاں جاتا ہوں کہ شاید مجھے کوئی اور ہڈی مل جائے۔"

اہل حق کی نظر میں کوڑے کے اس ڈھیر کی طرح دنیا بھی گندگی کا ایک ڈھیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں خیر اور شر اور اچھائی اور برائی کو ساتھ ساتھ رکھا ہے اور اشیاء کے قبح کو براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیے جانے سے روکنے کے لیے ان پر اسباب کے پردے ڈال دیئے ہیں، چنانچہ اشیاء کا ظاہری قبح پس پردہ رہتا ہے، تاہم ہر چیز کے خالق اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ دنیا میں بہت سی ایسی چیزوں کا بھی ظہور ہوتا ہے، جنہیں ہم جانتے نہیں یا جنہیں ہم اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں شمار کرتے ہیں۔ "اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ لامحدود ہیں۔ ان کی تعداد کا صرف اسے ہی علم ہے۔ بہت سے اسماء کا صرف اللہ تعالیٰ کو علم ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا مقرب فرشتے کو ان کے بارے میں نہیں بتایا۔" ہم اس دنیا میں حقیقت کو اس امید پر تلاش کرتے ہیں کہ شاید کوئی حقیقت ہمارے ہاتھ لگ جائے۔ بسا اوقات ہم ایسی جگہ سے حقائق تلاش کرتے ہیں، جسے دوسرے لوگ کوڑے کا ڈھیر خیال کرتے ہیں۔

دنیا کا ایک اور پہلو بھی ہے، جس سے ہم نفرت کرتے اور اس سے دور بھاگتے ہیں۔ یہ پہلو دنیا کو مقصد بنا کر اس کی طرف متوجہ ہونے سے عبارت ہے۔ دنیا فانی اور زوال پذیر ہے۔ یہ بہت سے تھپڑ رسید کرنے کے بعد ہی اپنی شیرینی کا کچھ حصہ تمہیں دی گی۔ یہ لہو ولعب اور فریب پر مشتمل پہلو ہے۔ اہل دنیا اسی پہلو سے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک برا اور قابل نفرت پہلو ہے۔ اس سے جتنا دور رہا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔

ہم اس پہلو سے دنیا اور آخرت کے درمیان توازن قائم کرسکتے ہیں۔ دنیا زوال پذیر ہے، جبکہ آخرت کو بقا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دنیا کو خیر آباد کہا اور نہ ہی لوگوں سے علیحدگی اختیار فرمائی، لیکن دل ہمیشہ حق تعالیٰ سے لگائے رکھا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "جو مؤمن لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کرتا ہے وہ اس مؤمن سے زیادہ اجر و ثواب پاتا ہے، جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور نہ ہی ان کی ایذا رسانیوں پر صبر کرتا ہے۔" (91)

ہمیں بھی ایسا ہی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ بازاروں اور شاہراہوں کے گناہوں کی گندگی سے بھرے ہوئے ہونے کے باوجود ہم ان پر چل پھر سکتے ہیں۔ ہم اسکولوں اور جامعات میں طلبہ

اور اساتذہ کی حیثیت سے جاسکتے ہیں۔ ہم نہ صرف بہت سی روحانی اور جسمانی ایذائیں اٹھاتے ہیں، بلکہ بعض ربانی فیوض کے احساسات کو بھی قربان کرتے ہیں۔ بسا اوقات ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر ولایت اور قربِ خداوندی تک پہنچانے والے راستوں کی قربانی بھی پیش کرتے ہیں۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ معراج کی رات جنت سے لوٹ آئے اور اس کی زیب و زینت سے متاثر نہ ہوئے، بلکہ دنیا میں لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کے لیے واپس آنے کو ترجیح دی، اسی طرح ہم پر بھی لازم ہے کہ ہم نبوی اخلاق کو اپنائیں اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی حقیقت کبریٰ کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کریں۔ جو لوگ دنیا میں ایسے رہتے ہیں جیسے آگ کے انگاروں پر کھڑے ہوں وہ کبھی بھی دنیا کے فانی چہرے کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے دل اس میں مشغول ہو سکتے ہیں، بلکہ وہ مخلوق کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ہمیشہ معیت الٰہیہ سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی دنیا کی فکر نہ کی حتیٰ کہ جب آپ ﷺ پر دنیا کی فراوانی تھی اور آپ کے قدموں میں دنیا کے ڈھیر لگ گئے، اس وقت بھی آپ ﷺ کے دل میں اس سے فائدہ اٹھانے کا خیال تک نہ آیا۔ جس طرح آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے، اسی طرح دنیا سے رخصت ہو گئے۔ جب آپ ﷺ دنیا میں تشریف لائے تھے تو آپ ﷺ کو کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لپیٹا گیا تھا اور جب آپ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو اس وقت بھی آپ ﷺ کو ایک کپڑے میں لپیٹا گیا۔

رسول اللہ ﷺ اپنی پوری حیاتِ طیبہ میں ایک معتدل تمدن اور متوازن نظام قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور زندگی میں اپنی اس دعوت سے کبھی بھی دستبردار نہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے عمر بھر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیے رکھا، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ اطمینان سے رضائے الٰہی کے حصول اور انسانیت کی نجات کے لیے سرگرم عمل رہے اور آپ ﷺ کا قلبِ اطہر دنیا کی خواہشات و لذات سے آلودہ نہ ہوا۔

آپ ﷺ نے اسلام کا نظام متعارف کرایا اور اسے سب سے پہلے اپنے گھر میں نافذ کیا۔ جب آپ ﷺ کی بعض ازواجِ مطہرات کی طرف سے بعض دنیوی مطالبات ہوئے

تو آپ ﷺ نے ان سے علیحدگی اختیار فرمالی، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے انہیں اذنِ خداوندی سے ماحضر پر اکتفا کرتے ہوئے اپنے ساتھ رہنے اور خوش اسلوبی سے رخصت ہو جانے میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دے دیا، تاہم تمام ازواجِ مطہرات نے تنگدستی کو برداشت کرتے ہوئے آپ ﷺ کے ہمراہ رہنے کو دنیوی نعمتوں پر ترجیح دی۔ جن دنوں رسول اللہ ﷺ نے اپنے حجرے میں اپنی ازواجِ مطہرات سے علیحدگی اختیار کی ہوئی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جب انہوں نے آپ ﷺ کے جسم مبارک پر چٹائی کے نشان دیکھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے رونے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے عرض کی: "قیصر و کسریٰ تو دنیا کے مزے لوٹ رہے ہیں اور آپ رسولِ خدا ہونے کے باوجود اس حال میں ہیں۔" اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: "کیا تم اس پر راضی نہیں کہ ان کے لیے دنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت؟"(92)

رسول اللہ ﷺ نے دنیا کو چھوڑا نہیں، بلکہ آپ ﷺ نے کائنات میں جلوہ گر خدائی حقائق کو دیکھنے کے بعد ان کا اظہار کیا، ان کے بارے میں لوگوں کو بتایا اور دنیا کے کونے کونے میں اسلام کا پرچم لہرانے والے لشکر بھیج کر انہیں ساری دنیا میں پہنچایا۔ بعض ماہرین عمرانیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے دور تک انسانیت پچیس فیصد ارتقا کر چکی تھی، لیکن آپ ﷺ کی بدولت آپ کے مختصر سے دور میں اس کے ارتقا کی نسبت پچاس فیصد ہو گئی۔

آپ ﷺ کے عہد سے اب تک اس نسبت میں صرف پچیس فیصد اضافہ ہوا ہے اور باقی پچیس فیصد ترقی مستقبل میں ہو گی۔ ذرا سوچیں! آپ ﷺ نے مختصر سے عرصے میں وہ کامیابیاں حاصل کر لیں، جو انسانیت نے بہت لمبے عرصے میں حاصل کیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت تک آنے والی انسانیت کے لیے آپ ﷺ ہی اسوہ حسنہ ہیں۔ ہم دوبارہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے دنیا کو ترک نہیں فرمایا، البتہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ اپنی امت کو کیسے صحیح رخ پر ڈالنا ہے اور کس چیز کو کتنی اہمیت دینی ہے۔

مسلمان کے ہاں عفو و در گزر کا کیا معیار ہونا چاہیے؟

عفو و در گزر مسلمان کی اہم صفت ہے، جو ہر مسلمان میں پائی جانی چاہیے۔ عفو و در گزر سے دل نرم پڑتے ہیں اور اس کے ذریعے حقائق دلوں تک پہنچائے جاتے ہیں، تاہم یہ صفت خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو اس کے بارے میں معقول اور متوازن رویہ اپنانا اور افراط و تفریط کا شکار ہونے سے بچنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ ہر خطا سے در گزر فرماتے اور اپنے ساتھ کیے گئے ہر برے سلوک کو معاف فرما دیتے، لیکن اگر کسی معاملے کا تعلق کسی دوسرے شخص کے حق سے ہوتا یا اس کی زد دین کی کسی اساس پر پڑتی تو آپ ﷺ شیر کی طرح غضبناک ہو جاتے اور جب تک حقدار کو اس کا حق نہ دلوا دیتے اور اس بد معاملگی کا سد باب نہ فرما دیتے چین سے نہ بیٹھتے۔

جن صحابہ کرام نے غزوہ احد کے موقع پر آپ ﷺ کے حکم کو کما حقہ نہ سمجھنے کی وجہ سے اپنی جگہیں چھوڑ دی تھیں، جس کے نتیجے میں وہ مسلمانوں کے لشکر کی پسپائی کا باعث بنے، ان پر آپ ﷺ نے ذرہ بھر ناراضگی کا اظہار کیا اور نہ ہی ان میں سے کسی سے دارو گیر فرمائی۔ ایک درشت مزاج بدو نے آپ ﷺ سے سختی سے اپنے حق کا مطالبہ کیا تو اس کے مقابلے میں آپ ﷺ کا طرز عمل یہ تھا کہ آپ ﷺ نے مسکرا کر اپنے صحابہ سے فرمایا کہ اس بدو کو اس کی مانگی ہوئی چیز دے دو۔ آپ ﷺ کی اعلیٰ درجے کی عفو و در گزر کی متعدد مثالوں میں سے یہ صرف دو مثالیں ہیں۔ باقی فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کی عام معافی کے اعلان کا تو دورِ حاضر کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔

جن لوگوں نے پیکر عفت و عصمت ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بدنام کرنے کی کوشش کی، ان لوگوں کے پروپیگنڈے سے بعض مسلمان بھی جن میں شاعرِ اسلام حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی تھے، متاثر ہو گئے تھے۔ بعد میں جب ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت میں وحی نازل ہو گئی تو آپ ﷺ نے ان لوگوں پر

حد قذف جاری فرمائی۔ اس واقعے پر کئی سال گزر گئے، حضرت حسان بوڑھے ہو گئے اور ان کی بینائی جاتی رہی۔ مسروق بن اجدع کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کے پاس حضرت حسان بن ثابت درج ذیل اشعار پڑھ رہے تھے:

حصان رزان ما تزن بریبة   وتصبح غرثیٰ من لحوم الغوافل

"وہ عورتیں پاکدامن اور عقلمند ہیں۔ ان پر کسی بات کی تہمت نہیں لگائی جاتی اور وہ بے خبر عورتوں کی غیبت نہیں کرتیں۔"

میں نے حضرت عائشہ سے عرض کی: "آپ اسے اپنے پاس آنے کی اجازت کیوں دیتی ہیں، جبکہ اس کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ مِنْھُمْ لَہٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ﴾ (النور:۱۱) "اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس کو بڑا عذاب ہو گا۔" اس پر انہوں نے فرمایا: "یہ رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا کرتے تھے۔"(93)

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مسطح کا خیال رکھتے اور اس پر خرچ کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ بھی واقعہ افک میں ملوث لوگوں میں شامل تھا۔ جب بہتان باندھنے والوں میں اس کے بھی شامل ہونے کا پتا چلا تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ناراض ہو کر آئندہ اس کی معاونت نہ کرنے کی قسم اٹھالی، لیکن اس پر جلد ہی درج ذیل آیت مبارکہ کا نزول ہوا: ﴿وَلَا یَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن یُؤْتُوا أُولِی الْقُرْبَی وَالْمَسَاکِیْنَ وَالْمُھَاجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلْیَعْفُوا وَلْیَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّوْنَ أَن یَغْفِرَ اللّٰهُ لَکُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (النور: ۲۲) "اور جو لوگ تم میں صاحب فضل اور صاحب مال ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ رشتہ داروں اور محتاجوں اور وطن چھوڑ جانے والوں کو کچھ نہیں دیں گے۔ اور ان کو چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تم کو بخش دے؟ اور اللہ تو بخشنے والا ہے مہربان ہے۔" حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جونہی یہ آیت مبارکہ سنی فوراً اپنی قسم اور فیصلے سے رجوع

کر لیا، قسم کا کفارہ ادا کیا اور مسطح کی معاونت اور اس کے ساتھ احسان کا برتاؤ ایسے کرتے رہے جیسے کوئی ناگوار بات پیش ہی نہ آئی ہو۔(94)

اہل ایمان کی بعض ایسے گناہوں سے عفو و درگزر کرنے کی مثالیں ملتی ہیں، جن سے بڑھ کر کسی کے حق میں زیادتی کا مرتکب نہیں ہوا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس آزمائش میں سرخرو ہونے میں کامیاب ہو گئے اور دورِ حاضر میں دعوت کا کام کرنے والوں کے لیے ان اہل ایمان کے طرزِ عمل میں عبرت کا بہت سامان ہے۔

آج کے داعی حضرات کو چاہیے کہ اعلیٰ اخلاق اور عفو و درگزر کے ذریعے دلوں کو جیت کر انہیں حقائق سے روشناس کرائیں۔ سختی، تیز مزاجی اور درشتگی پہلے کبھی مفید ثابت ہوئی ہے اور نہ آج ہو گی، لیکن عفو و درگزر کی گرمی سے برف کے پہاڑ بھی پگھل سکتے ہیں۔ کتنے ہی دشمنوں نے نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، لیکن رسول اللہ ﷺ کے عفو و کرم کے صدقے نہ صرف ان کی جان بخشی کر دی گئی، بلکہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر آپ ﷺ کے مخلص ترین پیروکار اور ساتھی بن گئے۔ کیا رسول اللہ ﷺ کے اخلاق نے ہی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دل کو موم نہ کیا تھا؟ کیا آپ ﷺ کے اعلیٰ اخلاق ہی کے نتیجے میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا دل اسلام کے نور سے آشنا نہ ہوا تھا؟

درحقیقت اللہ تعالیٰ اپنے دین کی اشاعت میں سرگرم لوگوں سے ایسے ہی طرزِ عمل کا مظاہرہ چاہتے ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اپنے ازلی علم کی بنیاد پر علم تھا کہ فرعون کبھی بھی راہِ ہدایت پر نہ آئے گا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو اس کے پاس بھیجتے ہوئے انہیں اس سے نرم لہجے میں گفتگو کرنے کی ہدایت کی: ﴿فَقُولَا لَهُ قَوۡلاً لَّيِّناً لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوۡ يَخۡشَى﴾ (طٰہٰ: ۴۴) ”اور اس سے نرمی سے بات کرنا شاید وہ غور کرے یا ڈر جائے۔“

ہمارے مخالفین ہمارے ساتھ جس قدر بھی سختی اور تعصب کا برتاؤ کریں، ہمیں ان کے مقابلے میں نرمی اور خودداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔یہی بات اہل ایمان کے شایاں ہے۔ قرآنِ کریم ہمیں جس قسم کے اخلاق کی تعلیم دیتا ہے ان کا بھی یہی تقاضا ہے: ﴿وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾(الفرقان: ۷۲)"اور جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گذرنے کا اتفاق ہو تو شریفانہ انداز سے گذرتے ہیں۔" انفرادی سطح پر ایک مسلمان کو جو دستورالعمل اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے وہ حسبِ ذیل ہے: ﴿وَإِن تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾(التغابن: ۱۴) "اور اگر معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو تو اللہ بھی بخشنے والا ہے مہربان ہے۔"

لہٰذا جو مسلمان اس بات کا امیدوار اور آرزومند ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ رحمت و مغفرت کا برتاؤ فرمائیں اسے چاہیے کہ اِس خلق کو اپنائے اور اسے اپنے اخلاق کا لازمی حصہ بنائے۔جو لوگ اس زندگی میں آئندہ کی زندگی کو پیش نظر رکھتے ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ خاص صلاحیت اور دانائی سے سرفراز فرماتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کا مستقبل روشن اور تابناک ہوتا ہے۔

آیت مبارکہ ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ﴾ (البقرۃ: ۲۵۶) "دین اسلام میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔" کا کیا مطلب ہے؟

چونکہ جبر دین کی روح کے منافی ہے، اس لیے بنیادی طور پر دین میں کسی قسم کا جبر نہیں پایا جاتا۔ اسلام میں ارادے اور اختیار کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اس کی تمام تعلیمات کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہے، لہٰذا کوئی بھی عمل خواہ اس کا تعلق عقائد کے ساتھ ہو یا عبادات و معاملات کے ساتھ اگر اسے جبر کے تحت سر انجام دیا جائے تو اس کا کوئی اعتبار ہے اور نہ ہی وہ قابل قبول ہے، کیونکہ ایسی صورتحال میں کیا گیا عمل "انما الأعمال بالنیات"(95) (اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔) کے بنیادی اصول سے متصادم ہے۔

جس طرح اسلام اپنی تعلیمات کے بارے میں جبر اور زبردستی کو روا نہیں سمجھتا، اسی طرح وہ دوسروں کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے پر مجبور کرنے کو بھی جائز نہیں سمجھتا، کیونکہ وہ لوگوں کی آزادیوں کو برقرار رکھتے ہوئے ان سے خطاب کرنے کو پسند کرتا ہے، مثلاً جب اہل ذمہ جزیہ اور خراج کی ادائیگی کو قبول کر لیں تو اسلام انہیں زندگی کا تحفظ فراہم کرتا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عفو و درگزر کے سلسلے میں اسلام میں بہت وسعت ہے۔

دین کوئی ایسا نظام نہیں، جسے جبر اور طاقت کے بل بوتے پر نافذ کیا جا سکتا ہو، کیونکہ دین کا اہم ترین جزو ایمان ہے، جو کہ خالص قلبی اور وجدانی چیز ہے۔ کوئی بھی خارجی طاقت انسان کے قلب و وجدان پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ انسان صرف داخلی اور نفسیاتی محرک کے تحت ہی ایمان کو قبول کر سکتا ہے، لہٰذا اس حیثیت سے دین میں کسی قسم کا جبر نہیں پایا جاتا۔

ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے آج تک دین نے کسی پر بھی زبردستی نہیں کی، بلکہ اس کا ارتکاب ہمیشہ کفار کی طرف سے کیا گیا ہے، کیونکہ وہ لوگوں کو ان کے دین سے جبر اور طاقت کے ذریعے دور کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، لیکن کسی مسلمان نے کبھی بھی کسی

کافر کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا، تاہم بعض اوقات یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات مبارکہ میں جہاد و قتال کی ترغیب دی گئی ہے، کیا یہ ایک قسم کا جبر واکراہ نہیں ہے؟

ہر گز نہیں... اس میں کسی قسم کا جبر واکراہ نہیں، کیونکہ جہاد تو کفار کی طرف سے کئے جانے والے جبر واکراہ کے عمل کو روکنے کے لیے مشروع ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ جو شخص بھی دین اسلام کو قبول کرتا ہے وہ آزادانہ طور پر اپنی مرضی سے ایسا کرتا ہے۔ اسلام میں جہاد کی مشروعیت اس آزادی کی حفاظت کے لیے ہے۔ یہ آزادی جہاد ہی کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ ہم اس موضوع کی ایک دوسرے پہلو سے درج ذیل الفاظ میں وضاحت کرسکتے ہیں۔ بعض آیات کا حکم متعین ادوار کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ یہ ادوار ترقی و کمال اور تنزل و زوال کے یکے بعد دیگرے آنے والے مختلف مراحل کے درمیان بھی آسکتے ہیں، لیکن حکم انہی ادوار کے ساتھ مخصوص رہے گا۔ اس کی ایک مثال سورت کافروں کی درج ذیل آیات مبارکہ ہیں: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ ۝ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ ۝ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ ۝ وَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ (الکافرون) ”اے پیغمبر ﷺ! کہہ دو کہ اے کافرو! جن بتوں کو تم پوجتے ہو ان کو میں نہیں پوجتا اور جس معبود کی میں عبادت کرتا ہوں اس کی تم عبادت نہیں کرتے اور میں پھر کہتا ہوں کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو ان کی میں پرستش کرنے والا نہیں ہوں اور نہ تم اس کی بندگی کرنے والے معلوم ہوتے ہو جس کی میں بندگی کرتا ہوں۔ تمہارے لیے تمہارا رستہ میرے لیے میرا رستہ۔“ ان آیات کا حکم مخصوص دور اور زمانے کے لیے ہے۔

یہ وہ ادوار اور مراحل ہیں، جن میں مسائل کی وضاحت اور ان کا حل پیش کیا جارہا تھا، مسائل کی وضاحت، ان کے حل کی پیش کش اور دوسروں کو قائل کرنے کی کوشش جبر اور طاقت کے استعمال کے بغیر گفتگو، نصیحت اور ہدایات کی صورت میں کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں دوسروں کی گمراہی اور دشمنی کی پرواہ کئے بغیر اپنے نفس کی حفاظت اور ہدایت اور دین کو انفرادی

سطح پر اپنی ذاتی زندگی میں ڈھالنے پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ اس قسم کے ادوار سے متعلق احکام تمام ادوار کے لیے نہیں ہوتے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ یہ بعد کے کسی بھی دور میں قابل عمل نہیں۔ یہ ایک غلط فہمی ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس قسم کے ادوار بارہا آچکے ہیں اور آج کل ہم ایسے ہی دور سے گزر رہے ہیں۔

تاہم اسی آیت مبارکہ میں ایک اور حکم بھی ہے، جو ہر دور کے لیے ہے اور ہمیشہ واجب العمل ہے۔ اس کا تعلق اسلامی ریاست کی حدود میں بسنے والی اقلیتوں کے ساتھ ہے۔ انہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے کا کسی کو حق حاصل نہیں، بلکہ ہر کسی کو دینی عقائد اختیار کرنے کی آزادی فراہم کرنا ضروری ہے۔

اسلامی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی اور یہودی ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتے رہے ہیں اور اہل مغرب کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ یہود و نصاریٰ ان کے اپنے ممالک میں بھی اس قدر امن و سلامتی کے ساتھ نہیں رہے جس قدر امن و سلامتی انہیں عالم اسلام میں میسر رہی ہے۔ جب انہوں نے جزیے (96) کی ادائیگی کو قبول کر کے ہماری حفاظت میں رہنا منظور کیا تو ہم نے بھی ان کی حفاظت کی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا، لیکن کسی نے بھی انہیں دائرہ اسلام میں داخل ہونے پر مجبور نہیں کیا۔ ماضی قریب تک ان کے اپنے مخصوص مدارس تھے، وہ اپنے مخصوص شعائر پر قائم تھے اور ان کی پابندی کرتے تھے۔ ہمارے سنہرے ترین ادوار میں بھی اگر کوئی شخص ان کے علاقے میں جاتا تو یوں محسوس کرتا جیسے وہ یورپ میں رہ رہے ہوں۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہیں کس قدر آزادی میسر تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش نہ کریں ان پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی۔ انہیں مسلمانوں کو بہکانے کی اجازت نہ تھی اور یہ پابندی مسلمان معاشرے کی حفاظت کے لیے ناگزیر تھی۔

دین میں انحراف کے سدباب سے متعلق احکام کا جبر واکراہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا تعلق صرف ان لوگوں سے ہے، جنہوں نے اپنے پورے اختیار اور مرضی سے دین کو قبول کیا ہے اور اِن احکام کو قبول کر کے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے، مثلاً اگر کوئی شخص اسلام سے پھر جائے تو

اسے مرتد سمجھا جائے گا۔ اسے اسلام میں واپس آنے کی مہلت دی جائے گی اور اگر اس کے بعد بھی وہ اسلام کی طرف نہ لوٹے تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔ یہ دراصل اپنے عہد کو توڑنے کی سزا ہے جو کہ معاشرے کے نظام کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ ریاست مخصوص نظام کے تحت ہی چل سکتی ہے۔ اگر ہر فرد کی خواہشات کو بنیاد قرار دے دیا جائے تو ریاست کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، لہٰذا تمام مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے پیش نظر اسلام مرتد کی زندگی کو تحفظ فراہم نہیں کرتا۔

جو شخص بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ بعض کام سر انجام دینے اور بعض کاموں سے باز رہنے کا التزام کرتا ہے۔ اس کا جبر واکراہ سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح اگر کوئی عاقل بالغ شخص نماز میں ہنسے تو وضو کے ٹوٹنے اور نماز کو لوٹانے کی صورت میں اسے سزا دی جاتی ہے اور اگر کوئی حاجی حالت احرام میں سلے ہوئے کپڑے پہنے یا حشرات الارض کو مارے تو اسے مخصوص سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حالانکہ اگر وہی شخص نماز کے باہر ہنسے یا حج اور احرام کے اوقات کے سوا کسی اور وقت میں حشرات الارض کو مارے تو اسے کچھ بھی نہیں کہا جاتا، اسی طرح اگرچہ اسلام کسی کو دائرہ اسلام میں داخل ہونے پر مجبور نہیں کرتا، لیکن اپنے پورے اختیار سے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والوں کو بے مہار بھی نہیں چھوڑتا۔ بلاشبہ اسلام کے کچھ مخصوص اوامر و نواہی ہیں، جن کی پابندی کا وہ اپنے پیروکاروں سے مطالبہ کرتا ہے۔ وہ انہیں نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے اور انہیں شراب، جوئے، بدکاری اور چوری سے روکتا ہے۔ وہ ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ان کے جرم کے مطابق سزائیں بھی دیتا ہے، لیکن یہ سزائیں جبر واکراہ کے تحت آتی ہیں اور نہ ہی ان کا اس سے کسی قسم کا تعلق ہے۔

اگر ہم تھوڑا سا بھی غور و فکر کریں تو یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ اس قسم کی تدابیر میں انسانوں کا ہی فائدہ ہے، کیونکہ ان تدابیر کے ذریعے فرد اور معاشرہ دنیا اور آخرت کی سعادت پاتا ہے۔ دین میں صرف اسی قسم کا اکراہ پایا جاتا ہے، جسے دوسرے لفظوں میں جنت کے راستے میں موجود رکاوٹوں کو دور کرنے سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

قرآنِ کریم ہمیں اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیتا ہے۔ امام کی اطاعت کا کیا حکم ہے؟

بلاشبہ قرآنِ کریم اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَطِيعُواْ اللّهَ وَأَطِيعُواْ الرَّسُولَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ﴾(النساء: ۵۹)"مومنو! اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی۔" اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے احکام کی بجاآوری، حکم عدولی نہ کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دے رہے ہیں۔ "الرسول" کے لفظ کو معرف ذکر کیا گیا ہے، جس سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جس رسول کو تم اچھی جانتے ہو، یعنی محمد ﷺ ان کی اطاعت کرو۔ درحقیقت ہم دوسرے تمام انبیائے کرام اور رسولوں سے بھی محبت کرتے اور ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان سے محبت کرنے اور ان پر ایمان لانے کی تعلیم ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ہی دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے جس کا جو مقام ہمیں بتایا ہے، ہم اس کے مطابق ان کی عزت واحترام کرتے ہیں۔

ہمیں سیدنا مسیح علیہ السلام کے عالی مقام کا آپ ﷺ کے ذریعے ہی علم ہوا ہے، حالانکہ عقیدہ تثلیث اور کنیسہ نے ان کی سیرت کو مسخ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک کے تمام انبیائے کرام کا علم ہمیں آپ ﷺ کے واسطے سے ہوا ہے، لہٰذا دوسروں کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے آپ ﷺ کو پہچانیں، ان کی اطاعت کریں اور ان کے روشن مدار میں گردش کریں، جس کے نتیجے میں ہم پر ہر چیز کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

﴿وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان رسول اللہ ﷺ کے روشن راستے پر چلنے والے اپنے اولوالامر کی اطاعت کریں اور اپنے تمام چھوٹے بڑے قائدین اور زعماء کی اس وقت تک پیروی کریں جب تک وہ اللہ اوراس کے رسول کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں اور پوری سنجیدگی اور خلوص سے اس پر چلتے رہنے کے لیے پرعزم رہیں۔ اگرچہ متعین حدود اور معیارات میں رہتے ہوئے ایسے قائدین کے علاوہ دیگر قائدین کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے، لیکن مکمل اطاعت صرف رسول اللہ ﷺ کے راستے اور آپ کی سنت پر چلنے والے اولوالامر کا حق ہے۔

آیت مبارکہ میں اللہ، رسول اور اولو الامر کی اطاعت یعنی ایک دوسرے سے مربوط تین اطاعتوں کا ذکر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو عظمت اور عالی مقام اللہ تعالیٰ کا رسول ہونے کی وجہ سے حاصل ہے، اگرچہ آپ ﷺ ایک انسان ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ تک ہمارے پہنچنے کا اہم ترین وسیلہ ہیں۔ اپنے راستے پر چلتے ہوئے ہم اسی وسیلے کا سہارا لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں موجود یہ وسیلہ اللہ تعالیٰ کی ایسی مضبوط رسی ہے کہ اگر ہم اسے تھام لیں تو ہم اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتے ہیں، کیونکہ اس رسی کا دوسرا سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ قرآنِ کریم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اللہ کی کتاب آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی رسی ہے۔ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ یہ پُر حکمت نصیحت اور صراط مستقیم ہے۔ خواہشات اس میں کجی اور زبانیں اس میں التباس پیدا نہیں کر سکتیں اور علماء اس سے سیر نہیں ہوتے۔ بار بار پڑھنے سے یہ بوسیدہ ہو گی اور نہ ہی اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے۔"(97)

آپ ﷺ نبی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اوامر اور اللہ تعالیٰ کے حق میں ہماری ذمہ داریوں کے ساتھ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کا اس قدر ارتباط ہے۔ نعوذ باللہ آپ ﷺ معبود نہیں ہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی دائیں جانب تشریف فرما ہیں جیسا کہ عیسائیوں کا حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں عقیدہ ہے، بلکہ آپ ﷺ تجلیاتِ الٰہیہ کو منعکس کرنے والا شفاف آئینہ ہیں، لہٰذا اگر آپ اس آئینے میں نہ دیکھیں گے تو آپ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے راستے کو کبھی نہ دیکھ پائیں گے۔

یہ راستہ آج تک واضح اور روشن رہا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی رہے گا، تاہم جس طرح رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلے فرماتے تھے اور اہل ایمان کو اسی بنیاد پر اپنی اطاعت کرنے کا کہتے تھے، اسی طرح جن لوگوں کو ہم اولو الامر کہتے ہیں ان کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے راستے اور طریق کار کی پیروی کرتے ہوئے آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلیں۔

صدیقِ اکبر، عمر فاروق، عثمانِ ذوالنورین اور حیدرِ کرار رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پلک جھپکنے کی مقدار بھی رسول اللہ ﷺ کی مخالفت نہ کی۔ رسول اللہ ﷺ کی ادنیٰ سی نافرمانی کے

مقابلے میں زمین میں دھنسا دیا جانا ان کے لیے نسبتاً زیادہ قابل قبول تھا۔ اہل ایمان کو ایسے امراء اور قائدین کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ جس قدر اولوالامر رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کریں گے، اسی قدر وہ لوگوں کی اطاعت کے حق سے محروم ہو جائیں گے، خواہ ان کی خدمات کتنی ہی جلیل القدر کیوں نہ ہوں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محض امارت مکمل اطاعت کو ضروری قرار نہیں دیتی۔ اگر امیر اپنی امارت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا مطیع وفرمانبردار بھی ہو تو اس کی اطاعت واجب ہے اور ایسی اطاعت عبادت ہے، تاہم اگر اہل ایمان اوپر ذکر کردہ معیارات پر عملدرآمد نہ کر پائیں تو ان کے علاوہ بعض دوسری شرعی مصلحتیں اور ضروریات بھی موجود ہوتی ہیں، لہٰذا اگر دینی خدمت اور اسلام کی سربلندی صلح، اطاعت اور مثبت طرز عمل کی متقاضی ہو تو خواہ ساری دنیا ہی کیوں نہ امڈ آئے، انہیں کسی بھی قسم کے منفی طرز عمل سے گریز کرنا چاہیے۔

دوم: اطاعت کا دائرہ بہت وسیع اور باہم مربوط ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "جب تین شخص سفر پر نکلیں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔" (98) یعنی ان میں سے ایک امیر ہو گا اور باقی دو اس کی اطاعت کرتے ہوئے ہدایات کے مطابق عملدرآمد کریں گے۔ امیر سفر کی تمام سرگرمیوں مثلاً کھانے، پینے، جاگنے، سونے اور نشاط و تفریح وغیرہ کا ذمہ دار ہو گا۔ یہ اطاعت کے دائرے کا آغاز ہے۔

نماز بھی ہمیں اطاعت کرنا سکھاتی ہے، کیونکہ ہم امام کے رکوع کے ساتھ رکوع اور اس کے سجدے کے ساتھ سجدہ کرتے ہیں۔ جس طرح سپاہی کو نظم وضبط کی تربیت دی جاتی ہے، اسی طرح نماز اپنی اصل غرض وغایت کے علاوہ ہمیں نظم وضبط بھی سکھاتی ہے۔ باجماعت نماز کے ذریعے ہمیں غور سے سننے کی عادت پڑتی ہے۔

دل وجان سے دعوت کے کام سے وابستہ اہل ایمان سے یہ ممکن نہیں کہ وہ اسلام سے متعلق کسی کام کو انفرادی سطح پر سرانجام دیں، بلکہ وہ اسے اجتماعی حیثیت سے لیتے ہیں، اس کے بارے میں باہمی مشاورت کرتے ہیں اور جب ضرورت پڑتی ہے تو اس معاملے کو زیادہ قابل

بھروسا اور تجربہ کار لوگوں کے سپرد کر دیتے ہیں اور پھر جس بات پر اتفاق ہوتا ہے اس پر عملدرآمد کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں اطاعت و فرمانبرداری واجب ہے۔ در حقیقت شورائی انداز میں کام کرنے والے اولوالامر کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ حق اور اس کی سربلندی کی خاطر ہم پر لازم ہے کہ اگر امیر کشمش جیسے سر والا حبشی غلام ہو تب بھی ہم اس کی اطاعت وفرمانبرداری کریں۔ ارشادِ نبوی ہے: "سنو اور اطاعت کرو اگر چہ تم پر کشمش جیسے سر والے حبشی غلام کو امیر بنا دیا جائے۔" (99) اس دور کے رسم ورواج اور عرف کے مطابق یہ بات ناقابل فہم تھی کہ ایک قریشی سردار حبشی غلام کی اطاعت کرے، لیکن رسول اللہ ﷺ دورِ جاہلیت کی تمام جاہلانہ عادات کو ختم کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ اس حدیث سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ کیا امام وقت کا قریشی ہونا ضروری ہے یا کسی حبشی غلام کو بھی امام مقرر کیا جاسکتا ہے؟ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک حبشی غلام کو بھی مسلمانوں کا حاکم اور امام بنایا جاسکتا ہے۔

لہٰذا مسلمانوں کو اسلامی اور ایمانی خدمت سے متعلق ہر معاملے میں باہمی مشاورت کے بعد کسی نہ کسی فیصلے پر پہنچنا چاہیے یا جس شخص کی عقل، تجربے اور اخلاص پر انہیں بھروسا ہو اس کے فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیے اور اس کے بعد اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرنی چاہیے، لیکن اگر اس کے برعکس ہر شخص نے اپنی رائے پر عمل کیا تو نتیجہ اضطراب اور بدامنی کی صورت میں نکلے گا اور چونکہ دلوں میں اتفاق واتحاد نہیں ہوگا، اس لیے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اس فضل سے محروم فرما دیں گے جو وہ جماعت پر فرماتے ہیں۔

بعض اوقات کوئی شخص اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کی بنیاد پر کوئی مقصد متعین کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے مقصد کو پورا فرما کر وہ چیز اسے عطا فرما دیتے ہیں، لیکن بعض چیزیں اور نعمتیں ایسی ہیں، جو اللہ تعالیٰ صرف جماعت کو دیتے ہیں۔ اگر لوگ جماعت کے نظام کو درہم برہم کر دیں گے اور ہر کوئی انفرادی سطح پر امور سرانجام دینے لگے گا تو وہ ان انعامات اور رحمتوں سے محروم ہو جائیں گے، جو اللہ تعالیٰ صرف جماعت پر نازل فرماتے ہیں۔ نمازِ استسقاء، نمازِ کسوف و خسوف، نمازِ عید اور

جبل عرفات کا قیام سب اجتماعی سرگرمیاں ہیں اور بغیر جماعت کے ادا نہیں ہوتیں۔ یہ سرگرمیاں اسی وقت فرض قرار دی گئیں جب مسلمان جماعت تشکیل دینے کے قابل ہو گئے۔

نماز اگرچہ مکہ معظمہ میں فرض ہوئی تھی، لیکن نمازِ جمعہ مدینہ منورہ میں فرض ہوئی۔ چونکہ ہجرت کے بعد مسلمانوں کی جماعت بن گئی تھی اس لیے اس وقت نمازِ جمعہ فرض کی گئی، بلکہ مکہ سے پہلے ہی مدینہ منورہ میں یہ صورتحال پیدا ہو چکی تھی۔ اگرچہ ابھی تک نمازِ جمعہ فرض نہ ہوئی تھی، لیکن حضرت اسعد بن زرارۃ رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن مدینہ منورہ کے مسلمانوں کو جمع کر کے انہیں نمازِ جمعہ پڑھاتے، کیونکہ مدینہ منورہ کی فضا اجتماعی سرگرمیوں کے لیے مکہ معظمہ کی بہ نسبت زیادہ سازگار تھی۔

اجتماعی معاملات میں اطاعت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ جونہی لوگ اجتماعی سطح پر امور سرانجام دینے لگتے ہیں ہر چھوٹے بڑے شعبے میں اطاعت و فرمانبرداری کو مرکزی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مؤمن کو اطاعت اور اسے بجالانے کے مفہوم سے ضرور آگاہی ہونی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی اور اس احساس کو بڑھانے اور عام کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش فرمائی۔ ذیل میں ہم اس سلسلے کی دو ایک مثالیں ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے:

ایک مرتبہ حضرت عمار بن یاسر اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہما ایک سریے میں شریک ہوئے۔ کسی معاملے پر ان دونوں حضرات کے درمیان بات بڑھ گئی اور حضرت خالد نے حضرت عمار کو کوئی سخت بات کہہ دی۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے دونوں حضرات کے مناسبِ حال بات ارشاد فرمائی۔ حضرت عمار السابقون الاولون میں سے تھے اور حضرت خالد امیر لشکر تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت عمار سے اپنے امیر کی اطاعت کرنے کا کہا اور حضرت خالد کو حضرت عمار سے تعرض کرنے پر ملامت کی، کیونکہ ایمان لانے میں حضرت عمار کو حضرت خالد پر سبقت حاصل تھی۔

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر بھیجا اور اس کے شرکاء کو امیر کی اطاعت کرنے کی تاکید فرمائی۔ راستے میں امیر نے آگ جلا کر لشکر کے شرکاء کو اس میں داخل ہونے کا حکم

دیا۔ بعض شرکاء اس میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو گئے، جبکہ بعض نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم آگ سے ہی فرار ہوئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے سامنے اس واقعے کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے آگ میں داخل ہونے کا ارادہ کر لیا تھا، فرمایا: "اگر وہ اس میں داخل ہوتے تو قیامت تک اسی میں رہتے۔" اور دوسرے لوگوں سے فرمایا: "معصیت میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، اطاعت صرف نیکی کے کام میں واجب ہے۔"(100) کیونکہ خالق کی معصیت میں کسی مخلوق کی اطاعت کرنا جائز نہیں۔ اس سے یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ امیر کی اطاعت واجب ہے، بشرطیکہ اس میں خالق کی نافرمانی نہ ہوتی ہو۔

اطاعت کے مفہوم کو راسخ کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے "موتہ" کی طرف بھیجے جانے والے لشکر کی قیادت اپنے آزاد کردہ غلام اور لے پالک بیٹے(101) حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کی، حالانکہ اس لشکر میں کبارِ صحابہ میں سے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جیسی نابغہ روزگار شخصیات موجود تھیں۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے بہت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بھائی اور ان سے آٹھ سال بڑے تھے۔ وہ ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے۔ انہوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور نجاشی کے سامنے قرآن کریم پڑھا، جس کا اس پر گہرا اثر پڑا۔

ان کی گفتگو بڑی پُر تاثیر ہوا کرتی تھی، لیکن اب ان کی تلوار کے آزمائے جانے کا وقت تھا۔ وہ اس میدان میں بھی کسی سے کم نہ تھے، لیکن ان تمام خصوصیات کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو ان کا امیر بنایا۔ کتب مغازی میں لکھا ہے کہ غزوہ موتہ میں دشمن کے لشکر کی تعداد دو لاکھ سپاہیوں سے زیادہ تھی اور اس لشکر جرار کے مقابلے میں مسلمانوں کا لشکر صرف تین ہزار نفوس پر مشتمل تھا۔ ہر مسلمان سپاہی کے مقابلے میں دشمن کے کتنے سپاہی تھے، اس کا خود ہی اندازہ لگا لیجئے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے پاس موجود لوگ بیان کرتے ہیں کہ تلواریں ان پر برس رہی تھیں اور ہر وار پر ان کا کوئی نہ کوئی عضو کٹ رہا تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنا چہرہ نہیں پھیرا۔ رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں بیٹھ کر

صحابہ کرام کو مسلمانوں کے لشکر کو پیش آنے والی صورتحال اتنی تفصیل سے بتا رہے تھے، جیسے آپ واقعات کو کسی روحانی اسکرین پر رونما ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہوں، پھر آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو بتایا کہ میں نے جعفر کو جنت میں دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو پر عطا فرمائے ہیں، جن کی مدد سے وہ جہاں چاہتے ہیں اڑتے پھرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے تینوں قائدین کی شہادت کے بعد فرمایا: ''انہیں سونے کے تختوں پر جنت کی طرف لے جایا گیا۔ میں نے عبد اللہ بن رواحہ کے تخت میں ان کے دونوں ساتھیوں کے تختوں کی بہ نسبت کچھ ٹیڑھا پن دیکھا۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو مجھے بتایا گیا کہ وہ دونوں آگے بڑھے اور عبد اللہ بن رواحہ کو کچھ تذبذب ہوا اور پھر وہ بھی آگے بڑھ گئے۔''(102) حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی یہ شان تھی، لیکن اس کے باوجود انہیں فوج کا امیر نہیں بنایا گیا، بلکہ امیر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ تھے، جو پہلے غلام تھے اور اسلام نے انہیں آزادی عطا کی۔ سب ان کی اطاعت کرتے تھے۔

جب مسلمانوں نے دشمن کے لشکر کی تعداد دیکھی تو ان میں سے بعض نے کہا: ''ہم رسول اللہ ﷺ کو دشمن کی تعداد کے بارے میں لکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ یا تو ہمیں مزید آدمیوں کی کمک دیں گے یا کوئی اور حکم ارشاد فرمائیں گے، جسے ہم بجالائیں گے۔ یہ سن کر لشکر کے ایک بہادر سپہ سالار حضرت عبد اللہ بن رواحہ آگے بڑھے اور پر عزم لہجے میں کہا: ''اے قوم! جس چیز کو تم ناپسند کر رہے ہو، تم اسی شہادت کی تلاش میں تو نکلے ہو۔ ہم لوگوں سے قوت و کثرت یا تعداد کی بنیاد پر نہیں لڑتے، بلکہ ہم اس دین کی بنیاد پر لڑتے ہیں، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیں عزت بخشی ہے۔ آگے بڑھو، دو بھلائیوں یعنی فتح اور شہادت میں سے ایک تو تمہیں مل کر رہے گی۔'' یہ سن کر لوگوں نے کہا: ''بخدا! ابن رواحہ نے سچ کہا ہے۔'' غزوہ مؤتہ میں تینوں سپہ سالار شہید ہو گئے یہاں تک کہ قیادت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آگئی۔ وہ مسلمانوں کے خون کے سیلِ رواں سے سخت رنجیدہ تھے۔ اب اس سپہ سالار کی باری تھی، جس پر مسلمان ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے۔ انہیں اسلام لائے ہوئے ابھی صرف چند ماہ ہی گزرے تھے کہ وہ اس معرکہ کارزار میں شریک تھے، کیونکہ انہیں اس جنگ میں شریک ہونے کا

بے حد شوق تھا۔ بعض کتب مغازی میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابتدا میں ان کا اس جنگ میں شریک ہونا پسند نہ فرمایا، لیکن بعد میں انہیں اس میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ اس موقع پر ہم سوال کرتے ہیں: ''اس تھوڑی سی مدت میں حضرت خالد بن ولید نے قرآنِ کریم سے کیا کچھ سیکھا؟ اور رسول اللہ ﷺ سے کتنی آگاہی حاصل کی؟'' بلاشبہ انہیں رسول اللہ ﷺ سے اس قدر آشنائی ہو چکی تھی کہ انہوں نے اپنی معاشرتی حیثیت کو قربان کر کے ایک ایسے شخص کی قیادت قبول کر لی، جو پہلے غلام رہ چکا تھا پھر تقدیر کا ظہور ہوا اور وہ صف اول میں پہنچ گئے، کیونکہ جونہی پہلے سپہ سالار شہید ہوئے، فوج کی قیادت حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آگئی اور ان کے بعد فوج کی قیادت حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جس طرح وہ تلوار کے دھنی تھے، اسی طرح تقریر کے بھی شہسوار تھے۔ حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد قیادت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں آئی، جن کے مستقبل میں عظیم سپہ سالار کی حیثیت سے ظہور پذیر ہونے کے لیے تقدیر راہ ہموار کر رہی تھی۔ اب ہم اس موضوع پر اجتماعیت اور اطاعت کی روح کے پہلو سے روشنی ڈالتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ایک آزاد کردہ غلام کو لشکر کی قیادت سونپ کر اطاعت و فرمانبرداری کا درس دیا۔ ہمیں اِس بات پر موجودہ معیارات کے مطابق عملدرآمد کرنا چاہیے۔ اس دور میں غلام کے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ اسے اس قابل نہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے آقا کے برابر بیٹھے یا اس کے ساتھ کھانا کھائے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک آزاد کردہ غلام کو مسلمانوں کی فوج کا سپہ سالار بنا کر اطاعت و فرمانبرداری کی تعلیم دی۔ رسول اللہ ﷺ اس پہلو پر اس قدر توجہ دیتے تھے کہ آپ ﷺ نے اپنی وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے باز نطینیوں کو سبق سکھانے اور حضرت اسامہ کے والد حضرت زید کی شہادت کا بدلہ لینے کے لیے بھیجے گئے لشکر کی قیادت حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ کے سپرد کی، حالانکہ حضرت اسامہ اس وقت بیس سال کے نوجوان تھے اور حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اس لشکر کے عام سپاہی تھے۔ رسول اللہ ﷺ اس طرز عمل سے جاہلیت کی ایک اور رسم کا خاتمہ کرنا اور اطاعت و

فرمانبرداری کی روح پھیلانا چاہتے تھے، کیونکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ ایک آزاد کردہ غلام کے بیٹے اور ایک نادار شخص تھے۔ ایسے نادار نوجوان اور آزاد کردہ غلام کے بیٹے کی اطاعت کی تعلیم دے کر رسول اللہ ﷺ حقیقی اطاعت کے مفہوم کو راسخ اور صحابہ کی توجہ اس کی طرف مبذول کرنا چاہتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنی ساری حیاتِ طیبہ میں اطاعت کے پہلو پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔

جن جماعتوں نے دعوت اور خدمت اسلام کو اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا رکھا ہے اور وہ ایک نئے دور کا آغاز کرنے کے لیے تیار ہیں، ہم ان سے امید کرتے ہیں کہ وہ بھی اسی قسم کی فضا قائم کریں اور اطاعت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھیں گے، بصورتِ دیگر تفرقہ، انتشار، ہر قسم کی بدحالی اور بدبختی، اختلاف اور نافرمانی مسلمانوں کا انجام ہو گا۔

یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ دورِ حاضر کے انسان کے لیے زیادہ انتظار کرنا ممکن نہیں رہا، اس کی ہمت جواب دے رہی ہے اور اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، لہٰذا اس جماعت کے لیے حق پر قائم رہتے ہوئے اس بحران سے کم سے کم وقت میں نکلنا ناگزیر ہے، تاکہ وہ اب تک بہت زیادہ تکلیفیں اٹھا چکنے والی انسانیت کے دل میں اپنی اطاعت و فرمانبرداری کے ذریعے امید کا چراغ روشن کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

جب ہم تنہا ہوتے ہیں تو شیطان ہمارے دلوں میں مختلف قسم کے شکوک وشبہات ڈالتا ہے، ہمارا ارادہ احساسات کے ہاتھ میں کھلونا بن جاتا ہے اور ہم یوں محسوس کرتے ہیں جیسے گناہوں کے مقابلے میں ہمارے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹا ہی چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ ہماری کیا راہنمائی کریں گے؟

سب سے پہلے تو ہمیں شیطان کے وسوسوں اور حربوں اور اس کے برائیوں کو خوشنما بنا کر دکھانے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے اور اپنے غرور کو توڑنے کے لیے اپنی پیشانیوں کو زمین پر رکھ دینا چاہیے؟ کیونکہ انسان کو سب سے زیادہ قرب خداوندی سجدے کی حالت میں نصیب ہوتا ہے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت وحمایت میں آنے کے لیے یہ دعا مانگنی چاہیے: "اے اللہ! ہم آپ سے آپ کی پناہ مانگتے ہیں اور آپ کے جلال سے آپ کی رحمت وجمال کی پناہ میں آتے ہیں۔"

یہ بات بالکل درست ہے کہ جب ہم اکیلے ہوتے ہیں تو شیطان ہم پر مسلط ہو جاتا ہے۔ شیطان عام طور پر انہی لوگوں کے درپے ہوتا ہے، جو بے کار پڑے رہتے ہیں، وہ کسی دینی سرگرمی میں حصہ لیتے ہیں اور نہ ہی انہیں اللہ کی طرف دعوت دینے کی فکر ہوتی ہے، لہٰذا ہمیں اسی نقطے سے آغاز کرنا چاہیے، مشغولیت کو تلاش اور بے کار اور فارغ رہنے سے گریز کرنا چاہیے۔

چونکہ عام طور پر شیطان ہماری بے کاری اور فراغت سے فائدہ اٹھا کر ہمارے دلوں میں وسوسے ڈالتا، برائیوں کو ہماری نگاہوں میں خوشنما بنا کر کے دکھاتا اور ہمیں گناہوں کی ترغیب دیتا ہے، اس لیے ہمیں اپنے آپ کو ہمیشہ نیکی کے کاموں میں مشغول رکھنا چاہیے، ان راستوں کو بند کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، جن کے ذریعے شیطان ہمارے دلوں تک رسائی پاتا ہے اور فکری اور عملی اعتبار سے ہر دم بیدار رہنا چاہیے، تاکہ شیطان کو ہمارے دلوں میں کوئی راہ نہ ملے۔ شیطان اللہ کے ساتھ تعلق رکھنے اور انفس و آفاق پر غور کر کے ہمیشہ اس تعلق کی تجدید کرتے رہنے والے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ نہیں ڈال سکتا، نیز وہ موت کو ہر دم یاد رکھنے والوں کو اپنا آلہ کار بنا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں شکست دے سکتا ہے۔

شیطان کبھی بھی ایسے شخص پر تسلط قائم کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے دل میں وسوسے ڈال سکتا ہے، جس نے اسلام کی دعوت دینے، اس کی نصرت کرنے اور اس کے پرچم کو دنیا کے کونے کونے میں لہرانے کو اپنی زندگی کا مقصد اور ہدف بنا رکھا ہو۔ یقینی ایمان سے آباد اور مطمئن دل پر شیطان کبھی بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔

حاصل یہ کہ اگر ہمارا اپنے پروردگار سے رشتہ مضبوط ہو گا تو اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اور ہمارے مشترکہ دشمن شیطان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑیں گے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ان کے دین سے وفاداری کریں، لیکن وہ ہم سے وفا نہ کریں۔ ایسا ممکن نہیں، بلکہ وہ تو سب سے بڑھ کر باوفا ہیں، لہٰذا وہ ہمیں ہماری خواہشات کے حوالے کریں گے اور نہ ہی ہمیں خراب ہونے اور بگڑنے دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں: ﴿أَوْفُواْ بِعَهْدِىٓ أُوفِ بِعَهْدِكُمْ﴾ (البقرة: ۴۰)"اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا میں اس اقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا۔" لہٰذا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم تو ان کے دین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے اس کی سربلندی کے لیے جدوجہد کریں اور وہ شیطان کو ہم پر مسلط کر دیں؟ ایسا ہرگز ممکن نہیں، بلکہ اس کے برعکس ایسے حالات میں وہ کم از کم اپنی آیات میں سے کوئی نہ کوئی آیت ہماری زبان پر جاری کر کے ہمیں اپنے اوپر قابو پانے کی توفیق دیں گے، تاکہ ہم نصیحت حاصل کر کے شیطان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے سے بچ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے بعض صحابہ کرام کی بھی اس طرح حفاظت فرمائی تھی، بعض حالات میں بتقاضائے بشریت ان کی بھی آنکھیں پتھرا اور سر چکرا گئے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے دلائل اور نشانیاں دکھا کر ان کی نگاہوں کو دوبارہ آخرت پر مرکوز کر دیا۔

دعوت کے میدان میں کام کرنے والا کوئی بھی شخص اگر اپنی زندگی کا گہرائی سے جائزہ لے تو وہ دیکھے گا کہ کتنی ہی بار وہ سوئے نیت یا کسی غلطی کے نتیجے میں گہری کھائی میں گرنے لگا، لیکن عنایتِ الٰہیہ نے اس کی دستگیری کی اور اسے بچا لیا۔ آیت مبارکہ ﴿إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾(محمد: ۷)"اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد

کرے گا اور تم کو ثابت قدم رکھے گا۔" کے مطابق ہر انسان اپنے صدق و اخلاص کی بقدر اللہ کی مدد اور لطف و کرم کا مشاہدہ کرتا ہے۔

اگرچہ ہمارا ارادہ جزوی اور کمزور ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے شیطان کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے اس کے استعمال کو عمومی شرط قرار دیا ہے۔ اگر ہم شروع سے ہی شیطان اور نفسِ امارہ کے وسوسوں کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جائیں تو ہمیں بڑی حد تک معرکہ کارزار میں غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ بعض اوقات ہم پر خیالات کا ناقابل برداشت حد تک دباؤ بڑھ جاتا ہے، لیکن آخرکار ہم ان سے چھٹکارہ پانے اور ان سے دور ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات خیالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمارا عزم اور روحانی ولولہ کافی ثابت نہیں ہوتا، ایسی صورت میں ہم اللہ تعالیٰ سے گہرا تعلق رکھنے والے حضرات کا تعاون حاصل کرتے ہیں اور جونہی ان کی صحبت میں بیٹھتے ہیں ان سے روحانی قوت حاصل کرتے ہیں اور ہمیں ان کی گفتگو کی حرارت سے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے ہمارے دلوں پر جمی ہوئی برف پگھل رہی ہے۔ بسا اوقات ہم خود ان لوگوں میں شامل ہوتے ہیں، جو دوسروں کے دلوں کو گرما کر ان کی مدد کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطری طور پر ایسا پیدا کیا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ میل جول کو پسند کرتا ہے۔ انسان مادی اور روحانی طور پر اپنے معاشرے سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اچھے دوستوں سے دور نہ رہیں، کیونکہ مخلص دوست اپنی نصیحتوں کے ذریعے نہ صرف ہمارے دل کو ہمیشہ تروتازہ رکھتا ہے، بلکہ اس میں جوش اور ولولہ بھی پیدا کرتا ہے، لہٰذا مدرسہ ہو، بازار ہو یا کوئی طویل سفر ہو، ہمیں ایسی دوستی کے ہمہ وقت حصول کو یقینی بنانا چاہیے۔ ہمیں امید ہے اس قسم کی دوستی کا حصار شیطان کو ہمارے دلوں میں راہ پانے سے روکے گا۔

ایک دوسری بات دلوں کو نرم کرنے والی نصیحتوں کو باقاعدگی سے سننا ہے۔ ہمیں آخرت کی یاد دلانے اور ہمارے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرنے والی نصیحتیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس مفہوم کے لحاظ سے نصیحت دین کے بالکل مترادف ہے۔ ہمارے اسلاف جب

جامع مسجد میں خطبہ دیتے تو مسجد بھر جایا کرتی تھی۔ فلسفہ و علم کلام کے شناور امام رازی رحمہ اللہ جب منبر پر کھڑے ہو کر وعظ کہتے تو ان پر اس قدر گریہ طاری ہوتا کہ سامعین کو ان کی بعض باتیں سمجھ میں نہ آتیں۔ ایسے وعظوں سے محرومی ہماری بدقسمتی ہے۔ انسان ایسی مخلوق ہے کہ دل کا خشوع اور آنکھوں کے آنسو اس کی ضرورت ہیں۔ اپنے باطن میں گہرائی پیدا کرنے اور اسے ترقی دینے کے لیے ہر روز باطن پر توجہ دینا ناگزیر ہے۔ رونا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قرآنِ کریم نرم دل اور بکثرت رونے والے لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے: ﴿إِذَا تُتْلَى عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَن خَرُّوا سُجَّداً وَبُكِيّاً﴾ (مریم: ۵۸) "جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو سجدے میں گر پڑتے اور روتے رہتے تھے۔"

لہٰذا بہت ہی اچھا ہو گا اگر ہم صدقِ دل سے اسلام پر عمل کرنے والے صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے حالات سے متعلق چند صفحات روزانہ پڑھیں، اپنی زندگی ان کے رنگ میں رنگیں اور ان جیسی روحانیت لے کر شاہراہ یا بازار میں نکلیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہمیں نہ صرف اپنے باطن کو درست کرنا نصیب ہو گا، بلکہ صحابہ کرام اور تابعین و تبع تابعین جیسی روحانی ہستیوں کے ساتھ اپنا موازنہ کرنے کا موقع بھی ملے گا اور ہم اپنے آپ سے پوچھ سکیں گے وہ بھی مسلمان تھے اور ہم بھی مسلمان ہیں پھر ہم میں اور ان میں اس قدر فرق کیوں ہے؟

اس قسم کے ذاتی محاسبے اور مراقبے کے ذریعے ہم اپنی تجدید کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ہفتے میں چند بار بھی ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمیں امید ہے کہ اس سے ہمارے دلوں میں نرمی پیدا کرنے اور ان سے زنگ اتارنے میں مدد ملے گی، جس کے نتیجے میں ہمیں اپنے دلوں پر پوری آب و تاب سے منعکس ہونے والی تجلیات محسوس ہونے لگیں گی اور ہم شیطانی وساوس سے محفوظ ہو جائیں گے۔ یہ بات کسی انسان کی گفتگو سننے، قرآنِ کریم کی تلاوت کرنے یا تفاسیر کا مطالعہ کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہمیں تجدید کی ایسے ہی ضرورت ہے، جیسے ہمیں ہوا، پانی اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، تاہم تجدید کی صورتیں بے شمار ہو سکتی ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی شخص کی صحبت میں بیٹھنا ہمارے دلوں میں خشوع کے پیدا ہونے، اس سے نصیحت حاصل کرنے اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے اسوہ کو یاد رکھنے کا باعث بن سکتا ہے۔ یہ قوتیں ثابت قدم رہنے میں ہماری معاون ہوتی ہیں۔ الفت و عادت میں مبتلا ہو کر یہ نہیں کہنا چاہیے کہ جب مجھے یہ ساری باتیں پہلے سے معلوم ہیں تو انہیں دوبارہ پڑھنے یا سننے سے آخر کیا فائدہ؟ کیونکہ ایسی سوچ غفلت اور دھوکے کا نتیجہ ہے۔ جس طرح ہمیں بار بار کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح ہماری روحانی زندگی، دلوں، ضمیروں اور دیگر جذبات کو بھی بار بار غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کی غذا وہی ہے، جس کا اوپر ذکر ہوا ہے، لہٰذا ہمیں کسی ایسے شیخ کی صحبت کی ضرورت ہے جو اپنی روحانی طاقت سے ہر قسم کے شرور کو پگھلا دے اور ہمیں اپنی تجدید کرنے کا طریقہ سمجھائے۔ یہ مقصد بعض اوقات مطالعے، غور و فکر اور مراقبہ موت سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ جس قدر ہمیں اس میں کامیابی نصیب ہو گی، اسی قدر ہم انس و جن کے وساوس سے محفوظ رہیں گے۔ ہم ہر لحظہ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں نفس و شیطان کے شر سے محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ کی حفاظت و عنایت میں رہنے کے لیے ہمیں یہ دعا کرتے رہنی چاہیے۔

کیا سلطنت عثمانیہ کے سقوط میں دینی مدارس اور خانقاہوں کا ہاتھ ہے؟

دینی مدارس میں دینی اور عقلی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جن ادوار میں عقل کی نشو و نما اور قلب و ضمیر کی تہذیب پر توجہ دی جاتی تھی، ان میں یہ مدارس اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے ہیں۔ باقی خانقاہیں اللہ تعالیٰ کے وہ گھر ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی روحانی زندگی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان گھروں میں اللہ کو یاد کیا جاتا ہے اور غور و فکر کے دروازے اور خدا تک پہنچانے والے دریچے وا کئے جاتے ہیں۔ ان گھروں میں مادہ پرستانہ طبیعی نقطہ نظر کے بت کو پاش پاش کر کے نورِ الٰہی کی ضوافشانیوں سے متعارف کرایا جاتا ہے۔ یہ بہت اہم فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں اور آج بھی بعض مراکز یہ فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ مساجد نے بھی ان میں سے بعض ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اس سلسلے میں جلیل القدر اور مختلف الجہات خدمات سرانجام دی ہیں، لہٰذا امت مسلمہ کے لیے ان دو مبارک اداروں کی خدمات کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا پھر یہ ادارے اپنے اوپر منہدم ہونے والی دنیا کے ملبے کے نیچے کام کرتے رہے یا یوں کہیں دنیا ان کی خاکستر میں جیتی رہی۔ ہمارا المیہ سلطنت کا زوال نہیں ہے، بلکہ ہمارا اصل المیہ روحانی افلاس ہے۔

یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اربابِ سلطنت یہ بات نہ اس وقت سمجھ سکے اور نہ ہی اب یہ ان کی سمجھ میں آتی ہے، ورنہ ہمارے سقوط اور شکست کا سبب صرف دینی مدارس ہی نہیں ہیں، بلکہ اس کے برعکس جب مدارس زوال پذیر ہوئے تو امت کو بھی تنزل کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ ہماری تاریخ میں دینی مدارس وہی کردار ادا کرتے رہے ہیں، جو کردار آج متوسط اور ثانوی مدارس، جامعات اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا ہے۔

خلفائے راشدین رسول اللہ ﷺ کے مدرسے کے اولین فضلاء میں سے تھے۔ مسجد نبوی ہی وہ مدرسہ تھا جہاں ایسی عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں۔ اس پہلی مسجد سے اس سنت کا آغاز

ہوا کہ عبادت گاہوں سے مدارس کا کام لیا جائے۔ یہ سنت بعد کے ادوار میں بھی جاری رہی اور مساجد تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم کے مراکز بن گئیں، جہاں نہ صرف علم کلام پڑھایا جاتا، بلکہ کائنات سے متعلق تمام علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جس طرح یورپ میں عہدِ نشاۃ ثانیہ کو بحث و تحقیق اور روشن خیالی کے دور سے یاد کیا جاتا ہے، اسی طرح مسلمانوں کے ہاں ترقی کا دور حضرت محمد ﷺ سے شروع ہوا، خلفائے راشدین کے دور میں اس میں اضافہ ہوا اور چوتھی صدی ہجری میں تیزی سے عمودی ترقی کے مرحلے میں داخل ہوا۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ ابن سینا اور البیرونی جیسی شخصیات چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں پیدا ہوئیں۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے صرف چار صدیوں بعد اسلام کی عظیم شخصیات نے ایسی ایسی کتابیں لکھیں جو ان کے بعد صدیوں تک یورپ کی جامعات میں پڑھائی جاتی رہیں۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور صنعتی انقلاب بڑی حد تک انہی کتابوں کا مرہونِ منت ہے۔ یورپ نے انہی کتابوں سے استفادہ کرکے دنیا پر اپنی حکومت، طاقت اور غلبے کی دھاک بٹھائی۔ خاص طور پر ابن سینا، رازی اور زہراوی کی طبی کتابوں نے مغرب کی عقلی ساخت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مغرب کی کسی بھی علمی کتاب کو کئی صدیوں تک متداول رہنا نصیب نہ ہوا، لیکن ابن سینا کی کتابوں کو آٹھ سو سال اور زہراوی کی کتابوں کو ایک ہزار سال تک یورپ میں علم طب کے میدان میں سند کی حیثیت حاصل رہی۔

نظام الملک کے مدارس مساجد سے منسلک اہم ترین علمی مراکز تصور کئے جاتے تھے۔ ایک طرف وہ غزالی کی متعارف کردہ روحانیت کا نمونہ پیش کرتے تھے تو دوسری طرف ان میں عصری علوم کی تعلیم دی جاتی تھی، یعنی ذہنوں کو خالص علوم سے جلا ملتی تو دلوں کو دینی علوم سے روشنی حاصل ہوتی اور ذہن اور دل کے اس حسین امتزاج سے ابن سینا، رازی، البیرونی، بطانی اور زہراوی جیسی عظیم ہستیاں پیدا ہوتیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے میدان کا شہسوار تھا۔ کسی نے علم فلکیات پر خصوصی توجہ دی تو کسی نے علم فلکیات اور طبیعیاتی قوانین کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ بعض نے "علم مثلثات(Trignometry) "، "جیب (sin) "اور "جیب

تمام (cos)" کو اس دور کے غیر ترقی یافتہ آلات کے ساتھ استعمال کر کے زمین کے محیط کی پیمائش کرنے کی کوشش کی، نیز کوپر نیکس اور گلیلیو سے سات آٹھ سو سال پہلے وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ جب مغرب جہالت اور تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اس وقت ہم ہیڈرولک نظام (Hydraulic System) سے چلنے والے آلات اور گھڑیاں بنا رہے تھے۔ قرہ آمدی جزری نے آٹھ سو سال پیشتر ہیڈرولیک توانائی اور نظام سے چلنے والے بہت سے خودکار آلات ایجاد کئے تھے، بلکہ اتنے قدیم دور میں ہم حرکت کرنے والے مصنوعی گھوڑے بنانے میں بھی کامیاب ہو گئے تھے۔ اس وقت اہل مغرب کے لیے گھڑی کا طریقِ کار ناقابل فہم تھا۔ وہ گھڑی کو دیکھ کر حیرت سے پوچھتے: "کیا اس میں کوئی جن ہے؟" اس دور میں سائنسی ترقی کی قیادت دینی مدارس کے ہاتھ میں تھی۔

ان دینی مدارس کے پہلو بہ پہلو خانقاہیں تھیں، جو انسان کے سامنے عالم آخرت کا دریچہ کھولتیں اور دلوں کو نور سے منور کرتیں۔ اس دور میں بڑے بڑے صوفیائے کرام پیدا ہوئے، جن میں سے کسی کا یہ کہنا تھا کہ اگر میں ایک لمحے کے لیے بھی رسول اللہ ﷺ سے محروم رہوں تو میں مر جاؤں۔ یہ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام انسانیت کے لیے روشنی کے منارے تھے۔ جس طرح دریائے نیل نے اپنے اردگرد کی زمین کو سرسبز و شاداب اور پھلوں سے لدے باغات میں تبدیل کیا، اسی طرح ان عظیم ہستیوں نے دلوں کو محبت الٰہیہ کے جام پلا کر ان کی تربیت کی۔

خانقاہوں اور مدارس کا آپس میں حسین امتزاج تھا اور انہوں نے انسان کو انسان کامل کے مقام پر پہنچانے کے لیے اس کی روح، دل، ذہن اور دیگر تمام لطائف کی ترقی میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں مدارس اور خانقاہیں اپنے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کر رہی تھیں، لیکن پھر زمانے نے پلٹا کھایا، وہ سنہری دور ختم ہو گیا اور مدارس نئے حقائق کی دریافت کی بجائے پہلے لوگوں کی تحریروں کے نقل کرنے پر اکتفا کرنے لگے، مثلاً ابن سینا، بطائی اور غزالی وغیرہ کی تحقیقات کی تشریحات پر اکتفا کیا جانے لگا، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ غزالی اور بطائی

جیسی شخصیات پیدا ہونا بند ہو گئیں، ہر کوئی پہلے لوگوں کی تحقیقات کو طوطے کی طرح دہرانے لگا، حقیقی علماء کے پیدا نہ ہونے کی وجہ سے ہماری سوچ کے دائرے تنگ ہو گئے اور ہمارے سامنے راستے بند ہو گئے اور ہر طرف بلیک ہولز (Black Holes) پیدا ہو کر امت کو نگلنے لگے۔ یہ باتیں کہنا اور تاریخی اعتبار سے ہر چیز کو اس کا حق دینا ناگزیر ہے۔

خانقاہوں نے دس بارہ صدیوں تک اپنی ذمہ داریاں بخوبی سرانجام دیں، اناطولیہ کے کونے کونے میں ہدایت کی روشنی پھیلائی اور لوگوں کے دلوں کو آتشِ شوق و وجد سے گرمایا۔ یہ ایک سنہری دور تھا۔ میں نہیں جانتا کیا دینی مدارس اور خانقاہوں کا ایک ہی معیار تھا؟ کیا ان میں عظیم لوگ موجود تھے؟ یا وہ پہلوں کی باتوں کو دہرانے پر اکتفا کئے بیٹھے تھے اور ان کی کرامات کے ذکر سے اپنے دل کو تسلی دیتے تھے؟ اگر دینی زندگی ایک قسم کی لوک کہانی (Folklore) میں، مدارس قیل و قال کے مراکز میں اور خانقاہیں رسم و رواج کی جگہوں میں تبدیل ہو گئی تھیں تو اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ یہ ادارے اپنی افادیت کھو چکے تھے۔

ہم پورے اطمینان سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ دینی مدارس نے ایک مخصوص دور کے بعد اپنی افادیت کھوئی۔ ایک عرصے تک وہ اپنی ذمہ داریاں اور فرائض اسی طرح ادا کرتے رہے جیسے بکری چارہ کھا کر اسے لوگوں کے پینے کے لئے دودھ میں تبدیل کر دیتی ہے۔ مدارس ایک لمبے عرصے تک اپنی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے، تاہم جن ادوار میں یہ اپنا کردار اور ذمہ داری ادا کرنے میں ناکام ہو گئے تو دوسری ہر چیز کی طرح امت، سلطنت اور حکام کے لیے ایک آزمائش بن گئے۔

جو مدارس اور خانقاہیں دین اور دینی ریاست کے ساتھ ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتیں وہ حقیقت میں مدارس اور خانقاہیں کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہیں۔ جو ادارے علم کو پس پشت ڈال کر اپنے دین اور ریاست سے دشمنی کرنے لگتے ہیں وہ کسی بھی نام سے موسوم ہوں ان میں خرابی در آتی ہے اور جب تک ان کی تجدید کر کے انہیں پہلی حالت پر نہ لایا جائے ان کی خرابی نہ صرف یہ کہ برقرار رہتی ہے، بلکہ مزید پھیلتی ہے اور بنیادوں سے دیواروں اور چھت میں منتقل ہو جاتی

ہے۔ مدارس معاشرتی زندگی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اگر بنیاد ہی مضبوط نہ ہو تو ریاست اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ سلطنت عثمانیہ کے ساتھ بھی یہی المیہ پیش آیا۔ دینی مدارس اور خانقاہوں نے اسے نہیں گرایا، بلکہ وہ تو ان عوامل میں سے تھے، جنہوں نے اس کی حفاظت کی اور اسے سہارا دیا، لیکن جب یہ مدارس خود شکست و ریخت کا شکار ہو گئے تو ان پر قائم سلطنت کی عمارت بھی زمین بوس ہو گئی۔ یہ ایک المناک مگر فطری انجام ہے، جسے قرآن کریم نے درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ (الرعد: ۱۱) ”اللہ اس نعمت کو جو کسی قوم کو حاصل ہے نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت کو نہ بدلے۔“

آیت مبارکہ: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الأَمَوَالِ وَالأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ﴾ (البقرة: ١٥٥) "اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے اور صبر کرنے والوں کو بشارت سنادو۔" کا کیا مطلب ہے؟

اس آیت مبارکہ کی بہت سے تفصیلی تفسیریں ہیں۔ جو لوگ اس کی مفصل تفسیر جاننے میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ ان تفاسیر کا مطالعہ کر لیں، باقی یہاں ہم سائل کے سوال کے جواب میں اس کی مختصر وضاحت کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض احباب کے لیے ہماری یہ گفتگو تحصیلِ حاصل ہو، لیکن چونکہ قرآنِ کریم سے متعلق ہر بات ہمارے لیے اہمیت کی حامل ہے، اس لیے ہم اختصار کے ساتھ اس آیت مبارکہ کے مفہوم پر روشنی ڈالیں گے۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ قسم اٹھاکر فرماتے ہیں کہ ہم تم پر خوف مسلط کر کے تمہارا امتحان لیں گے اور تمہیں آزمائش میں مبتلا کریں گے اور تم میں سے ڈرنے اور نہ ڈرنے والوں میں امتیاز کرنے کے لیے تم پر دنیا پرستوں کو مسلط کریں گے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو ازل سے ہر چیز کا علم ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ڈرنے اور نہ ڈرنے والوں کو وجودِ خارجی میں لانا چاہتے ہیں، کیونکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور ارادہ وابستہ ہے۔ خوف بھی امتحان کی ایک صورت ہے۔ انسان زلزلوں، بھوک، پیاس اور مادی و روحانی دشمنوں سے ڈرتا ہے۔ یہ خوف اس کے لیے امتحان ہے۔ امتحان کی ایک صورت بھوک بھی ہے۔ بعض مخصوص ادوار میں امت محمدیہ اس آزمائش سے بھی گزری ہے۔ آج یہ امتحان تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اگرچہ بعض جگہوں پر بھوک اور تنگدستی کے مظاہر نظر آتے ہیں، لیکن عام طور پر اس کا سبب انسان کی فضول خرچی اور غلط استعمال ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت تنبیہی تھپیڑے ہوتے ہیں۔ پہلے لوگوں خصوصاً گزشتہ دو صدیوں کے انسانوں کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے تسلط کی بنا پر بھوک کی بدترین صورتوں کا سامنا کرنا پڑا، نیز بعض افریقی

ممالک میں وسائل کے غلط استعمال کی وجہ سے آج بھی بھوک کا دور دورہ ہے۔ یہ صورتحال دراصل ان کے لیے تنبیہی تازیانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ میں بعض دیگر مواقع پر اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈال چکا ہوں، اس لیے میں اسے یہاں دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

مال کا نقصان کبھی تو طبیعی آفات کا نتیجہ ہوتا ہے یا برکت کے اٹھ جانے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ بھی آزمائش کی ایک صورت ہے۔ مہنگائی بھی اسی ضمن میں داخل ہے۔ جانوں کے نقصان میں جس طرح قتل داخل ہے، اسی طرح انسانی احترام کی حامل زندگی سے محروم ہونا بھی اس میں شامل ہے، نیز جس طرح عالم اسلام کو بیرونی جارحیت روکنے کے لیے جہاد کے دوران جانی نقصان کی آزمائش کا سامنا ہو سکتا ہے، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اسلامی زندگی گزارنے والوں کو معاشرے سے کاٹ دیا جائے اور ان سے دوسرے یا تیسرے درجے کے شہریوں جیسا سلوک کیا جائے۔ یہ بھی ایک قسم کی آزمائش ہے۔ اہل ایمان پر یہ سارے امتحانات اور آزمائشیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتی ہیں۔

بعض اوقات اللہ تعالیٰ باغات کو پہنچنے والے نقصان کے نتیجے میں پھلوں میں کمی لا کر ہمیں آزماتے ہیں اور کبھی ہماری سعی و کاوش پر توقعات سے کم نتائج مرتب کر کے ہمارا امتحان لیتے ہیں۔ یہ امتحانات کبھی تو ہمارے گناہوں کا نتیجہ اور ہمارے لیے ایک قسم کی تنبیہ اور تازیانہ ہوتے ہیں اور کبھی اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے مقام و مرتبے کو بلند کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا مظہر ہوتے ہیں۔

صبر اور صداقت کا اظہار امتحان کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ جو لوگ ہر طرح کی مصیبت میں اللہ تعالیٰ کی چوکھٹ سے لپٹے رہتے ہیں وہی اس امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں اور جو لوگ تھوڑی سی آزمائش آنے پر اس در کو چھوڑ کر اپنا راستہ بدل اور رخ پھیر لیتے ہیں وہ اس امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

جب رسول اللہ ﷺ کو کسی مصیبت یا پریشانی کا سامنا ہو تا تو آپ ﷺ فوراً وضو فرما کر نماز میں مشغول ہو جاتے۔ آیت مبارکہ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اسْتَعِينُواْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ إِنَّ اللّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (البقرۃ: ۱۵۳) "اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔ بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" بھی ہمیں اسی حقیقت کی تعلیم دیتی ہے۔

اگر مصائب آپ کو گھیر لیں اور آپ پریشان ہو جائیں تو صبر اور نماز کا خصوصی اہتمام کریں، کیونکہ یہی نجات کا راستہ ہے۔ سب سے پہلے اپنے اوپر قابو رکھیں اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ اس کے بعد عبادت اور توجہ الی اللہ کا خصوصی اہتمام کریں۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ ان امتحانات کے ذریعے ہمیں اپنی اصل قدر و قیمت دکھانے اور ہمیں اپنے لطف و کرم کا مشاہدہ کرانے کے لیے ہم سے وفاداری، تحمل، صبر اور صداقت کا مظاہرہ کرانا چاہتے ہوں، گویا اس قسم کی آزمائشوں کے دوران ہمارے ردعمل اور برتاؤ کی بنیاد پر ہمارے صبر اور صداقت کو پرکھتے ہیں اور ہمیں اپنی ذات سے متعارف کراتے ہیں تاکہ انسانیت پر اتمام حجت ہو جائے، لہٰذا اس جانچ پرکھ اور اپنی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے بعد بندہ پکار اٹھتا ہے: "اے میرے پروردگار! میں کتنا متلون مزاج انسان ہوں کہ آپ نے ایک مرتبہ مجھے آزمایا اور میرے سامنے دروازہ بند کیا تو میں نے مایوس ہو کر آپ کے دروازے کو چھوڑ دیا، حالانکہ مجھے چاہیے تھا کہ بار بار کی آزمائشوں کے باوجود ثابت قدم رہتا اور آپ کے در کو نہ چھوڑتا۔ اگر میری فوج کو سو بار بھی شکست ہوتی تب بھی میں آپ کے دشمنوں سے لڑتا رہتا اور آپ کے سہارے کو مضبوطی سے تھام کر کہتا: "اے پروردگار! آپ ہی میرا مقصود و مطلوب ہیں۔" اگر میرا گھر مجھ پر گر جاتا اور میرا دل مال و اولاد کے کھونے پر شدتِ غم سے پھٹ جاتا تب بھی مجھے آپ کے در کو نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ اگر آپ مجھے سر کی چوٹی سے پاؤں کے ناخنوں تک بیماریوں میں مبتلا کر دیتے اور میں درد اور تکلیف سے کراہنے لگتا اور مجھ میں دو یا تین الفاظ سے زیادہ بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تب بھی مجھے یہ کہنا چاہیے تھا: "اے پروردگار! آپ ہی میرا مقصود و مطلوب ہیں۔" لیکن یہ کہنے اور ایسا طرزِ عمل

اختیار کرنے کی بجائے میں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھا، مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا اور آپ کا در چھوڑ کر لوٹ آیا۔ میرا گناہ کس قدر سنگین ہے اور میں کس قدر بے استقلال اور متلون مزاج انسان ہوں۔"

بہت سی صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدھے راستے پر چلنے والے حق پرست بندوں پر بھی آزمائشیں آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو گناہوں سے پاک صاف کر کے اپنے پاس بلانے اور جنت کے اعلیٰ مقامات کا مستحق بنانے کے لیے مصائب و مشکلات کے ذریعے آزماتے ہیں۔

ہمیں بھی بار بار پرکھا اور آزمایا جائے گا، جس کے نتیجے میں کوئلے اور ہیرے اور اچھے اور برے میں تمیز ہو جائے گی۔ آج کے دور میں خاص طور پر امتحان کی ضرورت ہے۔ مستقبل میں متلون مزاجی اور بے استقلالی کا سدباب دورِ حاضر میں آزمائشوں میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں ہو سکتا، لہٰذا اپنے آپ کو دعوت الی اللہ کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے وقف کرنے کا ارادہ رکھنے والوں کے لیے آزمائشیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ آزمائشیں آج بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آرہی ہیں اور آئندہ بھی اسی کی طرف سے آئیں گی۔ ہماری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ ہم صبر و استقلال کا مظاہرہ کریں اور صدقِ دل سے اس کی چوکھٹ سے لپٹے رہیں۔

ڈارون ازم کے غلط ثابت ہو چکنے کے باوجود اسے زندہ رکھنے کی کوششوں کے پیچھے کیا مقاصد کار فرما ہیں؟

ڈارون ازم واحد نظریہ ہے، جسے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا گیا ہے اور اب اس پر جان کنی کی کیفیت طاری ہونے کے بعد اسے زندہ رکھنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ ایک طرف بعض سائنس دان ڈارون کے نظریے کے دفاع کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں تو دوسری طرف بعض سائنس دان اس پر تنقید کے تباہ کن تیر پھینک کر اسے پرزہ پرزہ کر رہے ہیں اور یہ دعوی کرتے ہیں کہ اس نظریے کو تسلیم کرنا دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ یہ بین الاقوامی علمی محافل کا موجودہ منظر نامہ ہے۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ ایک مخصوص عرصے تک یہ نظریہ علمی دنیا میں اپنے وجود کو برقرار رکھے گا۔ ماضی میں اس موضوع پر مشرق و مغرب میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں، اب بھی لکھی جا رہی ہیں اور آئندہ بھی لکھی جاتی رہیں گی۔ ہمیں آغاز میں ہی اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ آج مشرق و مغرب کی تہذیب مادہ پرستانہ فلسفے پر قائم ہے۔ امریکہ کی مادہ پرستی روس کی مادہ پرستی سے کچھ کم نہیں ہے۔ آج کی مغربی تہذیب پر امریکی تہذیب کے گہرے اثرات ہیں۔ جب ہم مشرق کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ہمارا اشارہ جغرافیائی پہلو کی طرف ہوتا ہے۔ فکری پہلو مراد نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے سوال کے جواب میں ہم یہ بات کہہ چکے ہیں کہ آج مشرق و مغرب کے درمیان جغرافیائی حدود مٹ چکی ہیں، اسی لیے ہم روس کو بھی مغرب ہی کا حصہ سمجھتے ہیں۔

دین اور سائنس کے بارے میں فریقین کا نظریہ تقریباً ایک جیسا ہے۔ دین کے بارے میں مغرب کا نظریہ روسو اور رینان کا پیش کردہ نظریہ ہے، جس کے مطابق دین معاشرتی زندگی کی ایک چھوٹی مگر ناگزیر اکائی ہے، دوسرے لفظوں میں ان کے ہاں دین کو کبھی بھی مقصد اور ہدف کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی، بلکہ وہ اسے سعادت کے حصول کے متعدد ذرائع میں سے ایک ذریعہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے اسے اختیار کرنے کی اجازت بھی دیتے ہیں۔ آج روس بھی یہی نقطہ نظر اختیار کرنے پر مجبور ہو چکا ہے۔(103) اگرچہ اس نظریے کو روسی نظام کی ناکامی کا نقطہ آغاز قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن ہماری رائے میں یہ دین کا صحیح مفہوم نہیں ہے۔

علم اور اس کی تمام فروع کے بارے میں بھی ان کا نقطہ نظر ایک جیسا ہے۔ آج پوری دنیا کی یہی صورتحال ہے، لیکن اس کے باوجود یورپ اور امریکا میں مادہ پرستانہ نقطہ نظر کے حامل بہت سے سائنس دانوں نے ڈارون ازم پر شدید تنقید کی ہے اور اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جسے ہدفِ تنقید نہ بنایا ہو، تاہم روس میں ڈارون ازم پر تنقید کرنا بہت خطرناک اقدام سمجھا جاتا ہے اور اس قسم کی تنقید صرف خفیہ طور پر کی جاتی ہے۔

روس اور اس سے وابستہ ممالک اس نظریے پر اصرار اور اس کا دفاع کرتے ہیں۔ چونکہ ان ممالک کی فاسد نظریاتی بنیادیں تاریخی مادہ پرستی (Historical Materialism) پر استوار ہیں، اس لیے ان کے لیے نظریہ ارتقا کا درست ثابت رہنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جونہی مادہ پرستانہ فلسفہ اور تاریخی مادہ پرستی کی عمارت زمین بوس ہو گی فوراً ماورائے طبیعت مظاہر سامنے آ جائیں گے اور انسان معاشی اور مادی اقدار کی بہ نسبت روحانی اور معنوی اقدار کو زیادہ اہمیت دینے لگے گا، جس کا نتیجہ اس پر قائم فکری نظام کے ناکام ثابت ہونے کی صورت میں نکلے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تھوڑے عرصے کے بعد ڈارون ازم کو منظر عام پر لاتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہے گا۔

ترکی میں اس نظریے کا دفاع اور اسے عام کرنے والے جامعات کے بعض اساتذہ اور سررشتہ تعلیم کے بعض ارکان ہیں، جو "علم حیاتیات" کی تعلیم دیتے ہوئے اس نظریے کو ایک حقیقت کے طور پر پیش کر کے خام ذہنوں کو خراب کرتے ہیں۔

میں یہاں اس موضوع کا تفصیل کے ساتھ علمی جائزہ نہیں لوں گا۔ میں اپنے ایک لیکچر میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کر چکا ہوں نیز بعض دوستوں نے عقیدے کی رو سے بھی اس کا جائزہ لیا ہے اور ان کی یہ کاوش مختلف کتابوں کی صورت میں منظر عام پر آ چکی ہے، لہٰذا میں اس موضوع کی تفصیلات کے لیے ان کتابوں کی طرف مراجعت کا مشورہ دے کر یہاں صرف اسی پہلو کے ذکر پر اکتفا کروں گا جو سوال و جواب کی نشست کے لئے موزوں ہے۔

اس نظریے کے حامیوں کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے پانی میں موجود امینوں ترشے یک خلوی حیوانات مثلاً امیبا میں تبدیل ہوئے اور پھر ارتقا کے نتیجے میں مختلف شکلوں کے حیوانات وجود میں آئے پھر یہ حیوانات مزید ارتقائی مراحل سے گزر کر نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ جانوروں مثلاً بندروں یا جیسے کہ بعض کا خیال ہے کتوں کی صورت اختیار کر گئے اور پھر ارتقائی مراحل کی آخری کڑی کے طور انسان وجود میں آیا۔ یہ لوگ بعض مقامات سے دریافت ہونے والے بعض ڈھانچوں کو اس مفروضے کی صحت کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

نیز انہوں نے ان ڈھانچوں کو جانوروں کی مختلف انواع و اقسام کی ابتدائی کڑیاں اور ان کے اسلاف قرار دیا ہے، مثلاً انہوں نے ان میں سے بعض کو گھوڑوں کے اسلاف قرار دیا ہے تو بعض کو جیلی فش (Jellyfish)اور کائی (Algae) کے آباء واجداد ٹھہرایا ہے اور دعوی کیا ہے کہ ان حیوانات نے ہزاروں سال کے بعد موجودہ شکل و صورت اختیار کی ہے۔ لیکن جدید ترین سائنسی انکشافات اس خیال کی تردید کرتے ہیں، چنانچہ حشرات الارض جنہیں سائنس دان سخت جان حیوانات تصور کرتے ہیں ساڑھے تین سو ملین سال پہلے اپنے ظہور سے لے کر اب تک ایک ہی شکل و صورت کے حامل ہیں۔

حشرات، رینگنے والے حیوانات اور سمندری بچھوؤں کی آج بھی بالکل وہی شکل و صورت ہے، جو پانچ سو سال پہلے ان کے ڈھانچوں کی تھی۔ ماہرین حیوانات کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کے درمیان ذرہ برابر بھی فرق موجود نہیں۔ جب اتنے چھوٹے جانداروں میں بھی کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا تو ڈارون ازم کے حامیوں کا یہ دعوی کہ گھوڑے کے سموں میں تغیر ہوا ہے درست نہیں۔ انسان بھی اپنی تخلیق کے وقت سے آج تک اپنی شکل و صورت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ایک طرف ڈارون ازم کے حامی یہ دعوی کرتے ہیں کہ ہزاروں قسم کے جانداروں میں تغیر و تبدل ہوا ہے، لیکن دوسری طرف ہمارے سامنے پانچ سو ملین سال پرانے جاندار زندہ موجود ہیں اور ان لوگوں کے دعوے کو زبانِ حال سے جھٹلا کر کہہ رہے ہیں: "ہرگز نہیں... ہم میں کسی قسم کا تغیر و تبدل اور ارتقا نہیں ہوا۔"

نظریہ ارتقا کے حامی کہتے ہیں کہ حیوانات کا ارتقا اور ان میں تبدیلی مصادفت کے طور پر ایک لمبے عرصے میں بہت سست رفتاری سے رونما ہوتی ہے اور کسی بھی جاندار کا ارتقا اور تغیر اس کے ماحول اور حالات پر موقوف ہوتا ہے، مثلاً زمین کا سورج سے تعلق، اس سے دوری یا نزدیکی، اس کے گرد گردش اور اس گردش کے نتیجے میں پیدا ہونے والی موسمی تبدیلیاں فطرت پر مثبت یا منفی اثرات مرتب کرنے والے عوامل ہیں، لہٰذا حالات کے مطابق تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، مثلاً لاکھوں سال پہلے گھوڑا ایک چھوٹا سا جانور ہوتا تھا، جس کے پاؤں میں پانچ ناخن ہوتے تھے، لیکن مرورِ زمانہ سے اس کی جسامت بڑھ گئی اور اس کا ایک سم رہ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس اپنے دعوے پر کوئی معقول دلیل نہیں ہے۔ وہ زمانہ ماضی کی ایک مخلوق کے بارے میں گھوڑا ہونے کا دعوی کرتے ہیں، حالانکہ اس مخلوق کا گھوڑے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس مخلوق کو پیدا فرمایا اور پھر ایک مخصوص عرصے کے بعد اس کی نسل کو ختم فرما دیا، چنانچہ آج کل اس کی نسل کا کوئی جانور موجود نہیں ہے۔ ہم یہ بات کیوں تسلیم کریں کہ وہ مخلوق گھوڑا ہی تھی؟ اللہ تعالیٰ نے اُس دور میں اس حیوان کو پیدا فرمایا اور پھر اس کے صدیوں بعد گھوڑے کو پیدا فرمایا۔ آخر ہم ان دو مختلف حیوانوں کے درمیان تعلق جوڑ کر ان میں سے ایک کو دوسرے سے کیوں منسوب کرتے ہیں؟

دس کروڑ سال پہلے بھی شہد کی مکھی اور شہد کے پائے جانے کے شواہد مل چکے ہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ شہد کی مکھی دس کروڑ سال پہلے بھی اسی انداز سے شہد بناتی اور اسے مسدس ڈبوں میں محفوظ کرتی تھی جیسے آج کرتی ہے، دوسرے لفظوں میں دس کروڑ سال گزرنے کے باوجود شہد کی مکھی میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا اور وہ ایک ہی طریقے سے شہد بنا رہی ہے۔ اس دوران اس کے دماغ یا دیگر اعضاء میں کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ ہی شہد بنانے کا طریقِ کار بدلا۔ اگر تغیر ہوا ہے تو کہاں ہوا ہے؟ اس قسم کے تغیر کی نشاندہی ہونی چاہیے، جس کی ذمہ داری نظریہ ارتقا کے حامیوں پر عائد ہوتی ہے۔

کئی سال پہلے نیو ڈارون ازم کے ایک حامی نے دنیا کے سامنے یہ انکشاف کیا کہ اس نے ایک ایسی کھوپڑی دریافت کی ہے جس میں انسان اور بندر دونوں کے اوصاف پائے جاتے ہیں اور اس نے اس کھوپڑی کو بندر سے انسان کی طرف منتقلی کی دلیل کے طور پر پیش کیا، لیکن کچھ ہی سالوں کے بعد اس دعوے کی اصل حقیقت کھل گئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ اس کھوپڑی کا نیچے والا جبڑا در حقیقت کسی بندر کی کھوپڑی کا حصہ ہے، جسے کسی حقیقی انسان کی کھوپڑی کے ساتھ جوڑا گیا ہے، گویا دو کھوپڑیوں کو ملا کر ایک کھوپڑی تیار کی گئی تھی۔ اس کھوپڑی کو قدیم ظاہر کرنے کے لیے مخصوص مدت تک تیزاب میں رکھا گیا، اس کے دانتوں اور مسوڑھوں کو رگڑا گیا اور پھر اسے بندر اور انسان کی درمیانی کڑی کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ جعل سازی ایسی مہارت سے کی گئی تھی کہ قریب تھا کہ علمی حلقے اس کے دھوکے میں آجاتے۔(104) تاہم بعض سائنس دانوں کو اس جعل سازی کا علم ہو گیا اور انہوں نے اخبارات اور رسائل میں اس کی تشہیر کر دی۔ ترکی کے اخبارات پر بھی اس واقعے کے اثرات پڑے اور یہاں بھی اس موضوع پر مختلف مقالات شائع ہوئے۔

جہاں تک حسبی تغیر (Mutation) کا تعلق ہے تو اس نظریے کے مطابق اگر کسی جاندار کو حسبی تغیرات کا سامنا ہو تو ان کی نسل میں تبدیلی رونما ہوتی ہے اور یہی تبدیلیاں جانداروں کی مختلف انواع کی بنیاد فراہم کرتی ہیں، لیکن دورِ حاضر میں علم جینیات اور حیاتیاتی کیمیا (Biochemistery) کی ترقی کی بدولت یہ ثابت ہو چکا ہے کہ الل ٹپ اتفاقات پر مبنی حسبی تغیرات جانداروں کے ارتقا، تکمیل اور بہتری کا باعث نہیں بن سکتے، لہٰذا اس قسم کے دعوے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

برسہا برس تک کبوتروں اور کتوں کی مخلوط نسلیں پیدا کرنے کی کوششیں اور اس بارے میں تجربات کئے جاتے رہے، لیکن کتے کتے ہی رہے۔ اگرچہ ان میں بعض جسمانی تبدیلیاں رونما ہوئیں، مثلاً ناک یا منہ کی شکل تبدیل ہوئی، لیکن کتے گدھے نہیں بنے اور نہ ہی کبوتر کسی اور پرندے کی نسل میں تبدیل ہوئے، بلکہ کبوتر ہی رہے۔ سائنس دانوں نے اس سے پہلے پھلوں کی "ڈروسوفیلا" نامی مکھی پر بھی متعدد تجربات کیے، لیکن وہ مکھی ہی رہی اور جب ان تجربات کرنے والوں کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو انہوں نے مایوس ہو کر اس کوشش کو چھوڑ دیا۔

تاہم ان تجربات کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ سائنس دانوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ جانداروں کا ایک نوع سے دوسری نوع میں تبدیل ہونا ممکن نہیں، کیونکہ ان کے درمیان ناقابل عبور وسیع خلا ہے، نیز درمیانی کڑیاں ہمیشہ بانجھ ہوتی ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں کہ خچر نر ہوتا ہے اور نہ مادہ، یہی وجہ ہے کہ اس کے لیے اپنی نسل جاری رکھنا ممکن نہیں، لہٰذا اس طرح کی درمیانی کڑیوں سے حسبی تغیرات کے ذریعے انسان کا وجود میں آنا کیسے ممکن ہے؟ قیامت تک باقی رہنے والی ایسی ممتاز مخلوق کیونکر وجود میں آئی؟ یہ بات نہ صرف غیر معقول ہے، بلکہ دوراز قیاس بھی ہے اور اس کی کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔

سائنس دانوں کو جزیرہ مڈغاسکر کے قریب ایک مچھلی کا ڈھانچہ ملا۔ تحقیقات کے بعد ثابت ہوا کہ یہ ڈھانچہ چھ کروڑ سال پرانا ہے اور انہوں نے فوراً اسے معدوم النسل مچھلیوں میں سے قرار دے دیا، لیکن کچھ ہی عرصے بعد ایک مچھیرے نے اسی جزیرے کے پاس سے اسی مچھلی کی نسل کی ایک مچھلی شکار کی، جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اس کی نسل ناپید ہو چکی ہے۔ سائنس دانوں نے دیکھا کہ یہ مچھلی چھ کروڑ سال پہلے پائی جانے والی مچھلی سے سو فیصد مشابہت رکھتی ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی، یہاں بھی نظریہ ارتقا کے حامیوں کو خفت کا سامنا کرنا پڑا اور زندہ مچھلی نے مچھلی کے ڈھانچے سے متعلق نظریہ ارتقا کے حامیوں کے مفروضے کو غلط ثابت کر دیا۔

لیکن اس کے باوجود چونکہ نظریہ ارتقا تاریخی مادہ پرستی کی اہم بنیاد، اس کا لازمی عنصر اور مادہ پرستی کا سہارا ہے، اس لیے مارکس اور اینجلز کو اس نظریے کو قبول کرنے پر شدت سے اصرار ہے۔ یہی وجہ ہے سائنس سے متصادم ہونے کے باوجود مادہ پرست اس کی بے دھڑک حمایت کرتے ہیں اور وہ کبھی بھی اس سے دستبردار نہ ہوں گے۔

نظریہ ارتقا کے حامی ہر مسئلے کا مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے حل پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کبھی بھی اس بات کا اعتراف نہیں کرتے کہ چونکہ ہم اس مسئلے کی وضاحت نہیں کر سکتے، اس لیے ضرور کوئی خارجی روحانی طاقت موجود ہے۔ ان کی تمام تر کوششیں اس اعتراف سے بچنے کے لیے

ہیں، لیکن ان کی یہ مایوس کن کوششیں انہیں معقولیت، دانش مندی اور اعتدال پسندی سے اس قدر دور لے گئی ہیں کہ انہیں جعل سازی، دھوکا دہی اور سائنسی شعبدہ بازیوں کا راستہ اختیار کرنا پڑا، جو نہ صرف اہل علم بلکہ عام انسان کو بھی زیب نہیں دیتا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ جب بھی انہیں خفت اٹھانی پڑتی ہے تو وہ منہ چھپانے کے لیے کسی نہ کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ہوتے ہیں، تاہم افسوسناک بات یہ ہے کہ بعض خام ذہن ان کے فریب میں آجاتے ہیں، لیکن جھوٹ کا کوئی سر پاؤں نہیں ہوتا اور ان لوگوں کی حالت تو اس سے بھی گئی گزری ہے۔ کہاوت ہے کہ ایک بے وقوف کنویں میں پتھر پھینک کر چالیس عقلمندوں کو اسے نکالنے کی کوشش میں مصروف کر سکتا ہے، لیکن وہ پھر بھی اسے نہیں نکال سکتے۔ یہی بات نظریہ ارتقا کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

تاہم ڈارون نے غیر شعوری طور پر دنیائے علم کو فائدہ بھی پہنچایا ہے، کیونکہ جانداروں کی مختلف انواع کی تقسیم اور ترتیب کی دریافت اسی کی تحقیقات کا نتیجہ ہے اور یہ تقسیم دوسرے بہت سے دلائل کی طرح کائنات میں موجود حیرت انگیز ہم آہنگی اور نظم ونسق کی ایک دلیل ہے۔ اس سے کائنات کے بے مثال نظام کے خالق کی قدرت کی عظمت بھی ثابت ہوتی ہے۔ ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ڈارون کی تحقیقات سے ہمارے ایمان میں اضافہ ہوا، لیکن وہی تحقیقات اس کی گمراہی کا باعث بنیں۔

ہر دعوت کے ظہور کے وقت اس کے ماننے والوں کو مقدس سفر کا حکم دیا جاتا رہا ہے۔ کیا آج دین کی خدمت کے لیے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرنے کو مقدس عمل تصور کیا جا سکتا ہے؟

مقدس سفر سے مراد ہجرت ہے۔ ہجرت ایک اہم موضوع ہے، جس میں بہت سے عظیم حقائق و معانی پنہاں ہیں۔ اس لفظ کے مفہوم میں جس طرح ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف ہجرت کرنا شامل ہے، اسی طرح ایک اصول اور عقیدے کو چھوڑ کر دوسرے اصول اور عقیدے کو اپنانا اور اپنے ایک وجود کو چھوڑ کر دوسرے وجود کو اختیار کرنا بھی داخل ہے۔ نہ معلوم میں اس لفظ کے مفہوم کی وسعت و گہرائی کا حق ادا کر پاؤں گا یا نہیں، تاہم میں اللہ تعالیٰ کے لطف و احسان کو پیش نظر رکھتے ہوئے نصرت خداوندی سے حتی الوسع اس کی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا۔

ہجرت ہر بڑی دعوت کی بنیاد ہے۔ یہ نقطہ اچھی طرح ذہن نشین ہونا چاہیے کہ کسی بڑی دعوت کا مبلغ، کسی عظیم فکر کا داعی یا کسی بڑی ذمہ داری کو اٹھانے والا کوئی ایسا شخص نہیں، جس نے ہجرت نہ کی ہو۔ ہر دعوت دینے والا اپنا آبائی وطن چھوڑ کر اپنی دعوت کی خاطر دوسرے شہر کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ ہجرت کا اہم ترین اور سب سے زیادہ بابرکت پہلو یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہجرت کے نتیجے میں ظہور پذیر ہونے والے بعض حقائق دعوت دینے والے مہاجر کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگرچہ کسی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو "سیاح نبی" نہیں کہا، لیکن یہ صفت ان پر بخوبی صادق آتی ہے۔ اُس دور میں جبکہ ذرائع نقل و حمل بہت مشکل تھے، ہم ان کی دعوت کی گونج سب سے پہلے بابل میں سنتے ہیں پھر ہم انہیں سرزمین کنعان میں دیکھتے ہیں اور اس کے بعد وہ فرعون کے ملک شام میں دکھائی دیتے ہیں۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ اس وقت وہاں "صادوق" نامی ایک ظالم بادشاہ کی حکمرانی تھی، یہی وہ مقام تھا، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ نے اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر اہل ایمان کی اس مختصر سی جماعت کو ظالموں کے ہاتھوں سے بچانے کی دعا مانگی تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی زوجہ محترمہ کے ہمراہ ہر ملنے والے کو اللہ کی طرف بلانے کے لیے زمین کے مختلف خطوں میں سفر کرتے رہے یہاں تک کہ ہم انہیں مکمل طور پر منہدم ہو چکنے والے حرم شریف کے پاس دیکھتے ہیں یعنی وہ مکہ معظمہ بھی گئے، جہاں سید المرسلین حضرت محمد ﷺ نے پرورش پائی تھی، جس نے قیامت تک کے لیے اہل ایمان کا قبلہ قرار دیا جانا تھا اور جس کی تباہی قیامت کی اہم ترین علامات میں سے ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام حرم شریف آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مادی اور غیر مادی سیلابوں نے اسے منہدم کر رکھا ہے، گویا گمراہی کے سیلاب نے وادی بطحا کے پہاڑوں سے آنے والے سیلاب کے ساتھ اتحاد کر رکھا تھا۔ یوں لگتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے اس تاریک دور میں کعبہ شریف کو مادی و روحانی ہر دو اعتبار سے اپنی طرف اٹھالیا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند کے ساتھ مل کر کعبہ شریف کے باقی ماندہ نشانات پر اس کی تعمیر نو کرنے کا فیصلہ کیا اور لوگوں کو اس کی طرف بلانے کے لیے اذان دی جسے سن کر زندہ ضمیر لوگوں نے لبیک کہا اور اس کی طرف دوڑ پڑے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اذانِ محمدی دراصل اذانِ ابراہیمی سے ماخوذ ہے: ﴿وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالاً وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ﴾ (الحج: ۲۷) "اور لوگوں میں حج کے لیے اعلان کر دو کہ تمہاری طرف پیدل اور دبلے دبلے اونٹوں پر جو دور دراز رستوں سے چلے آتے ہوں سوار ہو کر چلے آئیں۔"

حرم پاک کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ ایسا مقام ہے جہاں سے ہر انسان اپنے رب کے ساتھ تعلق قائم کر سکتا ہے۔ اس گھر کے گرد طواف تو ہر تصور سے ماورا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "جب امام ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّالِّينَ﴾ کہے تو تم آمین کہا کرو، کیونکہ جس کی آمین ملائکہ کی آمین سے ہم آہنگ ہو گئی اس کے سارے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔"(105)

کعبہ شریف سدرۃ المنتہیٰ تک تمام روحانی ہستیوں اور فرشتوں کی طواف گاہ ہے۔ جب ہم طواف کر رہے ہوتے ہیں تو ہم پر اللہ تعالیٰ کی نظر کرم اور رحمت ہو رہی ہوتی ہے اور ہم انبیائے کرام کے ساتھ طواف میں شریک ہوتے ہیں۔ ایسی مبارک سرزمین پر رسول اللہ ﷺ کی ولادت ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طویل ہجرت کے دوران یہ اہم ترین جگہ تھی اور ایک طرح سے انہوں نے اپنی ہجرت کو ختم کر کے یہیں سکونت اختیار کر لی اور یہیں وہ درخت برگ و بار لایا، جس کی خاطر انہوں نے ہجرت کی تھی۔ اس درخت سے دو شاخیں پھوٹیں۔ ایک شاخ پر تو بار بار پھل آیا، جبکہ دوسری شاخ جو شاخِ اسماعیلی کہلاتی ہے، نے صرف ایک ہی پھل دیا، لیکن وہ پھل ایسا تھا کہ اگر اسے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے تو وہ تمام انبیائے کرام پر بھاری ثابت ہو۔ وہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے قابل فخر ہے۔ اس ثمر سے عظیم فراست کے مالک، صادق و امین حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی مراد ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کا ثمر اور نتیجہ ہیں۔

نبی خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "مسیح" کا لقب کیوں دیا گیا؟ مسیح کا ایک معنی زمین کی سیاحت کرنے والا بھی ہے۔ یہ اسم فاعل کا صیغہ ہے یعنی بہت سیاحت کرنے والا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے زمین کے مختلف حصوں پر حق اور حقیقت کو قبول کرنے کی صلاحیت سے بہرہ مند دلوں کو تلاش کیا اور اپنی طویل سیاحت کے نتیجے میں بارہ حواریوں کو پایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان حواریوں کے ذریعے دنیا کو فتح کرنے، اپنے کندھوں پر موجود اہم امانت کی ادائیگی اور اپنی عظیم دعوت دوسروں تک پہنچانے کے لیے ان حواریوں کو اپنا شاگرد بنانا منظور کیا۔ اگر ہم اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ ان کے ایک طالب علم نے ان سے خیانت کی تھی تو اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ وہ گیارہ طلبہ کے ذریعے دنیا کو فتح کرنے نکلے۔ اگرچہ یہ بات تحقیق سے معلوم نہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کہاں پیدا ہوئے، لیکن ہمیں اتنا معلوم ہے کہ اپنی مقدس ہجرت کے دوران ان کا رخ کس سمت تھا۔ تاریخ کی بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہجرت اور سیاحت کے دوران اناطولیہ کے وسطی علاقے تک آئے۔ وہ فلسطین اور جزیرہ نمائے عرب کے

علاقے میں گھومے پھرے اور جب ۳۳ سال کی عمر کو پہنچے تو اس جہانِ فانی کو چھوڑ کر اپنے لیے مخصوص عالم بالا کی طرف کوچ کر گئے۔ وہ قلب سلیم کے مالک ایسے لوگوں کی تلاش میں جو ان کی دعوت کو غور سے سنیں، دنیا کے مختلف خطوں میں پھرے۔ ان کی سیاحت بہت سے سیاحوں کی سیاحت سے زیادہ ہو گی۔

اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل میں جوان ہوئے تھے اور وہ یک گونہ محل کی آسودہ زندگی کے عادی ہو چکے تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے بھی ہجرت کی۔ اگر ہم انبیائے کرام کی زندگیوں کا گہرائی سے جائزہ لیں تو ہمیں ان سب کے درمیان ہجرت قدرِ مشترک دکھائی دے گی۔

بلاشبہ ان مبارک مہاجرین میں سے سب سے بڑے مہاجر ہمارے رسول اللہ ﷺ ہیں، کیونکہ دیگر تمام امور کی طرح ہجرت بھی آپ ﷺ کے ہاں نقطہ کمال کو پہنچی۔ آپ ﷺ نے اپنی عبادت میں ابتدا اور انتہا دونوں کو جمع فرمایا یعنی آپ ﷺ نے کامل ترین صورت میں عبادت کا آغاز فرمایا اور کوئی بھی اس میدان میں آپ پر سبقت نہ لے جا سکا۔ آپ ﷺ آسمان پر حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سنگ ہوتے تو زمین پر ایک بدو کے ہمراہ بیٹھ کر ایک ہی دستر خوان پر کھانا تناول فرماتے۔

آپ ﷺ کی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت دشوار ضرور تھی، لیکن اس میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ تھیں۔ ہمیں دوسرے انبیائے کرام کے بارے میں نہیں معلوم کہ انہوں نے ہجرت کو کس قدر اہمیت دی، لیکن رسول اللہ ﷺ تو بیعت لیتے وقت ہجرت کرنے کو شرط قرار دیتے اور فرماتے: "علی أن تہاجر" (اس شرط پر کہ تم ہجرت کرو گے۔) بلکہ اس دور میں بغیر کسی سبب یا رکاوٹ کے ہجرت نہ کرنے والوں کو منافق سمجھا جاتا تھا۔ ولید بن ولید، عیاش بن ابی ربیعہ اور سلمہ بن ہشام بعض موانع کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکے تھے۔ چونکہ یہ تین نیک بخت مسلمان مہاجر نہ تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے چاہا کہ دعا کے ذریعے ان کی زندگی میں غیر ارادی

طور پر موجود کمی کو دور کرنے کی کوشش کی جائے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ رکوع کے بعد کھڑے ہو کر یہ دعا مانگتے تھے: "اے اللہ! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ابی ربیعہ اور کمزور اہل ایمان کو نجات دلا... اے اللہ! قبیلہ مضر پر اپنی پکڑ کو سخت فرما اور ان پر حضرت یوسف علیہ السلام کے دور کے قحط جیسا قحط نازل فرما۔" یہ آپ ﷺ کا معمول رہا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے درج ذیل آیت مبارکہ نازل فرمائی: ﴿لَيْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾ (آل عمران: ۱۲۸) "اے پیغمبر ﷺ اس کام میں تمہارا کچھ اختیار نہیں اب دو صورتیں ہیں یا اللہ ان کے حال پر مہربانی کرے یا انہیں عذاب دے کہ یہ ظالم لوگ ہیں۔"(106)

چونکہ یہ لوگ ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے اس لیے رسول اللہ ﷺ ان کے لیے اپنے پروردگار سے گڑگڑا کر دعا مانگتے تھے۔ حضرت عیاش رضی اللہ عنہ ابو جہل کے ماں شریک بھائی تھے، لیکن شہادتین کا اقرار کرتے ہی ان کے ہاتھ پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں، یہاں تک کہ فتح تک وہ بیڑیوں میں قید رہے اور اپنے بڑے بھائی ابو جہل اور بعد میں مشرف بہ اسلام ہونے والے اس کے بیٹے عکرمہ کے ہاتھوں اہانت آمیز سلوک اور تکلیفوں کا سامنا کرتے رہے۔ بعد میں وہ جنگِ یرموک میں بہادری سے لڑے۔ حضرت سلمہ بن ہشام ابو جہل کے باپ شریک بھائی تھے۔ انہیں بھی ہاتھ اور گردن میں بیڑیاں ڈال کر جکڑ دیا گیا تھا۔ حضرت ولید بن ولید حضرت خالد بن ولید کے سگے بڑے بھائی اور ولید بن مغیرہ کے بیٹے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان سب کا تعلق بنو مخزوم سے تھا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ تک پہنچنے اور آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کرنے کی پوری کوشش کی، لیکن وہ اپنے راستے کی رکاوٹوں کو عبور نہ کر سکے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نماز فجر میں رکوع سے کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا کر ان کے لئے دعا مانگتے، بلکہ بسا اوقات تو ظہر، مغرب اور عشاء کی نمازوں میں بھی ان کے لیے دعا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے نزدیک ہجرت کی اتنی زیادہ اہمیت تھی کہ آپ ﷺ جس سے بھی بیعت لیتے اسے ہجرت کرنے کی تاکید فرماتے اور جن لوگوں کے لئے ہجرت کرنا ممکن نہ ہوتا ان کے لیے ہجرت کی آسانی کی دعا فرماتے۔ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے

بعد مکہ مکرمہ میں بیمار پڑ گئے تو انہیں بہت قلق ہوا اور جب رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے تو انہوں نے آپ ﷺ سے بھی اپنے اس قلق کا درج ذیل الفاظ میں اظہار کیا: "یارسول اللہ ﷺ! کیا میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ جاؤں گا؟ کیا میں اپنی ہجرت سے رہ جاؤں گا؟"(107) اگرچہ مکہ مکرمہ بہت ہی مقدس اور بابرکت شہر ہے، لیکن وہ حضرات اپنی ہجرت کی سرزمین سے دور ہونے کے اندیشے پر بھی پریشان ہو جاتے تھے۔

ہجرت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث بننے والی نیکی ہے، کیونکہ ہجرت کرنے والا شخص اللہ کے راستے میں بہت بڑی قربانی پیش کرتا ہے۔ انسان اپنے خاندان، اولاد اور آبائی وطن سے محبت کرتا ہے۔ کتنے ہی شعراء نے اپنے اشعار میں اپنے وطن کے گن گائے اور فراق اور پردیس کی وحشت کا شکوہ کیا ہے۔ ہر انسان میں یہ جذبہ موجود ہے۔ چونکہ یہ ایک فطری چیز ہے اس لیے انسان اسے اپنے دل سے نکال نہیں سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ کی یاد میں رویا کرتے اور مدینہ منورہ کے حسن و جمال کے باوجود مکہ معظمہ کی یاد میں اشعار کہتے تھے۔ انہوں نے عقیدے اور دعوت کی خاطر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تھی، لیکن ان کے دل اپنے وطن کی محبت میں تڑپتے تھے حتی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسی ہستی جنہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی رسول اللہ ﷺ سے جدا ہونے کا نہیں سوچا مکہ مکرمہ کے لیے مشتاق رہتے اور جن مشرکین نے انہیں اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا ان کے اقدام پر افسوس کرتے۔ مکہ کو الوداع کرتے ہوئے آپ ﷺ نے اسے مخاطب کر کے کہا تھا: "بخدا! اگرچہ مجھے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ساری سرزمین سے تو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے اور اللہ کے ہاں بھی تیرا مقام ساری زمین سے زیادہ ہے، لیکن اس کے باوجود میں نکل رہا ہوں۔ اگر تیرے باسی مجھے نہ نکالتے تو میں نہ نکلتا۔"(108)

یہ شوق و اشتیاق کے جذبات ہیں، لہٰذا ہمیں ہجرت کے موضوع پر اس پہلو سے بھی گفتگو کرنی چاہیے۔ صحابہ کرام مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے۔ وہ اس شہر سے مانوس ہو چکے تھے۔ وہاں ان کے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر کردہ گھر بھی تھا، جس کی زیارت کے

لیے ہر سال دور دراز سے ہزاروں لوگ آتے تھے۔ وہ اس کعبہ کے متولی اور رکھوالے تھے۔ کسی نے اپنے ذمہ زائرین کو ہدایات دینا لے رکھا تھا تو کسی نے زائرین کو آبِ زم زم پلانے کی ذمہ داری اٹھا رکھی تھی اور بعض زائرین کی لائی ہوئی قربانیوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ غرض ان میں سے ہر ایک کوئی نہ کوئی ذمہ داری سر انجام دیتا تھا۔ انسان جس چیز سے مانوس ہو جاتا ہے عام طور پر اس کے لئے اسے چھوڑنا دشوار ہوتا ہے، مثلاً ہم ماہ رمضان میں روزے، افطاری اور نمازِ تراویح کے گہرے اثرات محسوس کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، اسی طرح حج کے لیے آتے جاتے ہمارے دلوں میں مختلف قسم کے جذبات موجزن ہوتے ہیں اور وقتی طور پر فراق کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگوں نے اس قسم کے جذبات بارہا محسوس کئے ہوں گے۔

صحابہ کرام نے اپنے وطن، گھر بار اور اہل و عیال سب کو چھوڑ دیا، مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی تو اپنے ساتھ بیویوں کو لے کر نہیں گئے اور ہجرت کے وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہمراہ ان کی بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نہیں تھیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نابینا باپ ابو قحافہ اور ان کی بیویاں جن کے نام بھی ہمیں معلوم نہیں کہاں ٹھہرے تھے۔ وہ ان سب کو چھوڑ کر کیسے گئے ہوں گے ؟ کیا وہ لوگ جو رحمت و شفقت کا نمونہ تھے، ہم انہیں سنگدلی کا الزام دے سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں ... وہ تو رحمت و شفقت کا مجسمہ تھے اور ان کے خاندانی تعلقات بہت مضبوط تھے، لیکن بات یہ تھی کہ راہِ حق میں ہجرت ہر چیز پر مقدم تھی۔

یہی وجہ تھی کہ ان حضرات نے اپنی تمام مملوکہ اشیاء مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر ہجرت کی۔ ان میں سے بعض نے دن کے وقت سر عام سب کو للکار کر ہجرت کی، جبکہ بعض کو سوائے اس کے کہ وہ خدا کی راہ میں ہجرت کر رہے ہیں، اپنے مستقبل کی کچھ خبر نہ تھی، گویا وہ ایک نامعلوم منزل کی طرف قدم اٹھا اور رخت سفر باندھ رہے تھے۔ جس وطن کو وہ چھوڑ کر جا رہے تھے وہاں انہیں گھر بار اور مال و اولاد غرض ہر شے میسر تھی، جبکہ دوسری طرف جس شہر کی طرف وہ جا رہے تھے وہاں غربت، وحشت اور تنہائی ان کا انتظار کر رہی تھی، کیونکہ انہیں اس

وقت اندازہ نہ تھا کہ مدینہ منورہ کے وفاشعار لوگ انہیں خوش آمدید کہہ کر اپنے سینے سے لگائیں گے، چونکہ وہ خود انسانیت کا اعلیٰ نمونہ تھے، اس لیے وہ انصارِ مدینہ جیسی ممتاز جماعت کے وجود میں آنے میں معاون ثابت ہوئے۔ اس طرح انصار مہاجرین کے بابرکت مقام کے حسبِ حال ان سے حوارین کے اوصاف اور مہاجرین انصار سے مدد اور نصرت کی صفات سیکھنے لگے۔ ان دونوں گروہوں کا طرززندگی ایک جیسا تھا اور نہ ہی ان کا طرز فکر آپس میں ملتا تھا، بلکہ ان کے باہمی مکالمے کا معیار بھی مختلف تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مہاجرین کرام کو بہت سی ناگوار باتیں برداشت کرنا پڑیں اور ان کی زندگی پوری طرح ہجرت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، لیکن اس کے باوجود ایک ضعیف الاعتقاد شاعر کے سوا کوئی بھی مکہ واپس لوٹ کر نہ گیا، بلکہ انہوں نے یہ خیال بھی دل میں نہ آنے دیا۔ جس ہجرت نے صحابہ کرام کے ایمان میں گہرائی پیدا کی اور مسلمانوں اور اسلام کو خصوصی مقام دیا وہ آج بھی ایک زندہ موضوعِ سخن ہے۔

ہجرت سے قرآن کے طالب علموں کو بہت کچھ ملتا ہے، کیونکہ جس شہر میں انسان کی پیدائش اور پرورش ہوئی ہوتی ہے وہاں سے ہجرت کر کے وہ مثبت اثرات کے ساتھ ساتھ بعض منفی اثرات سے بھی چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔ ہر انسان کی اپنے گاؤں، شہر اور ہم عمروں کے ساتھ بعض منفی یادیں وابستہ ہوتی ہیں، مثلاً کسی کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوا ہوتا ہے یا کسی سے وہ خلافِ مروت انداز سے پیش آیا ہوتا ہے۔ دعوت الی اللہ کی ذمہ داری اٹھانے کے بعد جس وقار سے متصف ہونے کی ضرورت ہوتی ہے، اس طرح کی باتیں اس سے میل نہیں کھاتیں۔ اس طرح کی بعض بچگانہ عادتیں جن سے عمر کے ایک خاص مرحلے تک چھٹکارا پانا ممکن نہیں ہوتا، بعض لوگوں کی یاداشت میں محفوظ رہتی ہیں، اس کی دعوت اور ذمہ داری پر منفی اثرات ڈالتی ہیں اور اس کی شخصیت کے بارے میں منفی رائے قائم کرنے کا باعث بنتی ہیں۔

مثلاً اہل مکہ فخر کائنات حضرت محمد ﷺ کو ابو طالب کا یتیم (بھتیجا) کہہ کر پکارتے تھے۔ اس سے ان کا مقصد آپ ﷺ اور آپ کی رسالت کی توہین کرنا ہوتا تھا اور آپ ﷺ کی یتیمی کو آپ ﷺ کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ وہ دراصل یہ کہنا چاہتے تھے:

"بھلا یہ شخص جو بچپن میں ہمارے ساتھ گلیوں میں بھاگتا پھرتا تھا اور بازاروں میں ہمارے ساتھ چلتا پھرتا ہے یہ دعوی کرتا ہے کہ وہ آسمان پر گیا ہے اور وہاں سے ایسی خبریں لایا ہے، جو ہمارے لیے ناقابلِ فہم ہیں؟" حالانکہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو شروع سے ہی نبوت و رسالت کی ذمہ داری کے لیے تیار فرما رہے تھے اور آپ کی ہر ایسی بات سے حفاظت فرماتے، جس کے آپ ﷺ کی ذمہ داری پر منفی اثرات پڑ سکتے تھے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے: نبی اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "میں نے اہل جاہلیت کے برے کاموں میں سے کسی کے کرنے کا صرف دو مرتبہ ارادہ کیا اور دونوں بار اللہ تعالیٰ نے میری ان سے حفاظت فرمائی۔ ایک بار میں نے اس قریشی نوجوان سے جو بالائی مکہ میں میرے ساتھ اپنے گھر والوں کی بکریاں چراتا تھا کہا: "میری بکریوں پر ذرا نظر رکھنا تاکہ میں آج رات مکہ میں دوسرے نوجوانوں کی طرح قصہ گوئی کی محفل میں شرکت کر آؤں۔" اس نے کہا: "ٹھیک ہے۔" چنانچہ میں نکلا اور جب میں مکہ کے سب سے قریبی گھروں کے پاس پہنچا تو میں نے گانے اور دف اور باجوں کی آواز سنی۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ تو لوگوں نے بتایا کہ فلاں شخص نے فلاں عورت سے شادی کی ہے (یہ اس کی تقریب ہے) میں بیٹھ کر اسے سننے لگا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے سلا دیا۔ بخدا! سورج کی تمازت سے میری آنکھ کھلی۔ جب میں اپنے ساتھی کے پاس لوٹ کر گیا تو اس نے مجھ سے کارگزاری پوچھی، میں نے اسے جو کچھ پیش آیا بتایا۔ دوسرے دن میرے ساتھ پھر یہی صورتحال پیش آئی۔"(109)

اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو ایک خاص مقصد کے لیے تیار فرما رہے تھے۔ کعبہ سیلاب کے باعث منہدم ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ نے اپنے بچپن میں اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ ایسے باعث شرف کام سے پیچھے رہنا آپ ﷺ کے لیے ممکن نہ تھا۔ کام کے دوران حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا: "اپنے آپ کو پتھر کی رگڑ سے بچانے کے لیے اپنا ازار کندھے پر ڈال دیجیے۔" جونہی آپ ﷺ نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا آپ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے اور آپ کی آنکھیں پلٹ گئیں۔ جیسے ہی آپ ﷺ کو افاقہ ہوا، آپ ﷺ زور زور سے پکارنے

لگے: "میرا ازار! میرا ازار!" آپ نے فوراً اپنا ازار باندھا اور اس کے بعد کسی نے کبھی بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برہنہ نہ دیکھا۔(110) چونکہ اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بڑے پیغام کے بوجھ کو اٹھانے کے لیے تیار فرمارہے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ ہر نامناسب بات سے آپ کی حفاظت فرماتے تھے، لیکن اس سب کچھ کے باوجود مشرکین مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوطالب کا یتیم (بھتیجا) کہہ کر پکارتے تھے۔ ایسے حالات میں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل مکہ سے تائید و نصرت نہیں مل رہی تھی انصارِ مدینہ نے اپنے دلوں، شہر اور گھروں کے دروازے کھول دیئے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر ان سے یہ کہہ کر بیعت لی: "تم مجھ سے نشاط و کسل کی حالت میں میری اطاعت و فرمانبرداری کرنے، تنگدستی و خوشحالی کی حالت میں میرے کہنے پر خرچ کرنے، نیکی کے لیے کہنے اور بدی سے روکنے، حق بات کہنے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہ کرنے اور جب میں تمہارے پاس آؤں گا تو میری مدد کرنے اور ہر اس چیز سے میری حفاظت کرنے پر بیعت کرتے ہو، جس سے تم اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔ (اس سب کے عوض) تمہارے لیے جنت ہے۔"(111) تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات کو تسلیم کیا۔

ہجرت کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو ایسے لوگوں کے درمیان پایا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام پہچانتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نصف النہار کے آفتاب کی مانند صاف اور روشن سمجھتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ چونکہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن نہیں دیکھا تھا، اس لیے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے دن سے ہی نبی کی حیثیت سے دیکھتے اور ایک نبی کی جتنی عزت کی جانی چاہیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتنی عزت کرتے تھے۔

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کے شہر مکہ میں تحقیر کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اہل مکہ کو بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت کا اندازہ فتح مکہ کے بعد ہوا، لیکن ہجرت سے پہلے مکہ میں حضرت بلال اور ان جیسے بہت سے پاکیزہ دلوں کے مالک صحابہ کرام کو رائج معاشرتی اقدار کے نتیجے میں طرح طرح کی اذیتوں اور اہانت کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن مدینہ منورہ میں یہی لوگ محترم اور معزز بن گئے، بلکہ انصار صحابہ ان مہاجرین کو اپنے گھر بار اور مال و دولت میں شریک

بنانے کے لیے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کرتے تھے۔ ان مہاجرین پر نبی مختار ﷺ نے خصوصی توجہ دی تھی اور اس ہجرت کی قیادت اس رسول نے کی جسے بچپن سے ہی اللہ تعالی کی خصوصی حفاظت میں رسالت کی ذمہ داری کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

ہمارے لیے دعوتی پہلو سے ہجرت بہت اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ تقاضائے بشریت کی وجہ سے ہم سب سے کچھ نہ کچھ غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں، جنہیں بعض اوقات ہمارے خلاف اچھالا جاتا ہے۔ اس لیے اپنے آبائی علاقے سے ہجرت کرنا بہتر ہوتا ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ انسان کی نیت چاہے کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو مخاطبین کے ذہنوں میں ہماری سیرت داغدار نہیں ہونی چاہیے، بلکہ انہیں ہم پر مکمل اعتماد اور اطمینان ہونا چاہیے، لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم ایسے لوگوں میں رہیں جو ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے واقف نہ ہوں، بلکہ عام کہاوت کے مطابق ان کے نزدیک آسمان سے اترے ہوں۔ یہ نقطہ بہت ہی اہم ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تمام مجددین اور مرشدین سے ہجرت کروانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت خدائی قانون ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے تمام مرشدوں اور مبلغوں کو اس قانون کے مطابق ہجرت کرنے پر مجبور کیا ہے، مثلاً ان میں سے کسی کا اناطولیہ کی مشرقی ریاستوں کے بلند و بالا پہاڑوں میں ظہور ہوتا ہے، لیکن اس کی آواز کی گونج مغربی اناطولیہ اور استنبول میں سنائی دیتی ہے۔ امام غزالی نے بکثرت سیاحت کی اور امام ربانی ہندوستان کے طول و عرض میں پھرتے رہے۔ جب ہم عظیم ہستیوں کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے ہاں ہجرت کی بڑی اہمیت دیکھتے ہیں۔

دورِ حاضر میں دعوتی پہلو سے مقدس سفر کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر کوئی مسلمان بھائی کسی کافر ملک کی طرف ہجرت کرے تو اسے تحقیر کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ آج ''مدینہ منورہ'' جیسا کوئی شہر موجود نہیں، لیکن بہت سے شہر اس کی تقلید کرنے کی کوشش کریں گے، دوسرے لفظوں میں ''مدینہ والے'' کے سامنے پیش ہونے کے لیے ہم پر ضروری ہے کہ ہم مدینہ منورہ جیسے شہر بسائیں تاکہ ہم بھی کہہ سکیں: ''یارسول اللہ ﷺ! ہم

آپ کے مدینے میں حاضر ہونے کے لیے اپنے شہروں کو چھوڑ کر آئے ہیں۔" ایسے شہروں کی ضرورت ہے، جن کی طرف ہجرت کی جائے، لہٰذا جن لوگوں نے اسلام کی اشاعت کی خاطر زمین کے مختلف خطوں کی طرف ہجرت اور سفر کیا ہے، ہمیں ان کے موقف کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، کیونکہ انہوں نے کسی مادی منفعت یا ذاتی مصلحت کے پیش نظر ایسا نہیں کیا، بلکہ ان کا مقصد اسلام کی اشاعت اور رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

جن لوگوں نے نہ صرف ترکی بلکہ عالم اسلام کے کسی بھی حصے سے حق کی دعوت کی خاطر ہجرت کی انہیں ان کی نیت کے مطابق اجر وثواب ضرور ملے گا، کیونکہ قاعدہ ہے: "اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی کچھ ملتا ہے، جس کا وہ ارادہ کرتا ہے۔" ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہیں کہ ایسے لوگوں کو پہلے مہاجرین کے پہلو میں جگہ ملے، یعنی اللہ تعالیٰ مہاجرین کو مہاجرین کے ساتھ اور انصار کو انصار کے ساتھ جمع فرمائیں اور جب روزِ محشر میں آواز دی جائے گی: "مہاجرین جمع ہو جائیں۔" تو ہمیں امید ہے کہ یہ لوگ صحابہ کرام میں سے اولین ہجرت کرنے والوں کے پیچھے جگہ پائیں گے۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس کے آگے کون ہو گا؟ کیا وہ اپنے سامنے ابو بکر رضی اللہ عنہ یا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو پائے گا یا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس کے سامنے ہوں گے؟

ضروری نہیں کہ ہم جس مقصد کے لیے ہجرت کریں ہمیشہ اسے حاصل بھی کر لیں، لیکن اگر ہجرت کرنے والوں کی نیتیں خالص ہوئیں تو وہ کامیاب وکامران ہی سمجھے جائیں گے۔ اس حقیقت کو درج ذیل حدیث نبوی کی روشنی میں سمجھنا چاہیے: "جس شخص نے صدقِ دل سے اللہ تعالیٰ سے شہادت مانگی تو اگرچہ اس کی موت بستر پر آئی، اللہ تعالیٰ اسے شہداء کا مقام عطا فرمائیں گے۔"(112)

اگر کوئی شخص اللہ کے دین کی خدمت اور اس کی دعوت کے شوق میں تڑپتا ہے، دین کو دنیا کے آخری گوشے تک پہنچانے کے لیے منصوبے بناتا ہے اور یہ دعوت دیتا ہے کہ اس ذمہ داری کو نبھانے کے لیے ہمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور فخر کائنات رسول اللہ ﷺ کے راستے کی پیروی کرتے ہوئے جانا، دیکھنا، مشاہدہ

کرنا، جاننا، راہنمائی کرنا اور چلنا چاہیے تو ایسا شخص اگر اپنے ہی شہر میں فوت ہو گیا تب بھی ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مہاجرین میں لکھا جائے گا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ جو لوگ اسلام اور عالم اسلام کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں مہاجرین اور شہداء کا ثواب عطا فرمائیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہترین کارساز اور مدد کرنے والے ہیں۔

کیا شفاعت برحق ہے؟ کون شفاعت کر سکتا ہے اور کس حد تک؟

یقیناً شفاعت برحق ہے اور اس کے برحق ہونے پر بہت سی آیات مبارکہ اور احادیث نبویہ شاہد ہیں، لیکن ہم ان آیات اور احادیث کو بعد میں ذکر کریں گے، پہلے ہم سوال کی دوسری شق پر گفتگو کریں گے، جس میں پوچھا گیا ہے کہ شفاعت کون اور کس حد تک کر سکتا ہے، کیونکہ اس دوسری شق کے جواب کے ضمن میں پہلی شق کا جواب خود بخود آ جائے گا۔

انبیاء، اولیاء اور شہداء اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ مقام و مرتبے کے مطابق شفاعت کر سکتے ہیں اور وہ شفاعت کریں گے، لیکن شفاعت کا کامل ترین درجہ عظیم فراست کے مالک ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ کو حاصل ہو گا۔ ہر نبی کو ایک مستجاب دعا اور شفاعت دی گئی تھی، جسے اس نے دنیا میں ہی استعمال کر لیا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اسے آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیا، لہذا آپ ﷺ آخرت میں "شفاعت عظمیٰ" کے مالک ہوں گے۔ آپ ﷺ کی امت کے "حمادین" "لواء الحمد" کے نیچے جمع ہوں گے تاکہ "صاحب مقام محمود" وہ شفاعت کریں، جس میں سے امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کو اس کے استحقاق کے مطابق حصہ ملے گا۔

دنیا فانی ہے، اس نے ہمیشہ نہیں رہنا اور اس میں پیش آنے والی مشکلات اور مصائب کسی نہ کسی طرح گناہوں کا کفارہ بھی بن جاتے ہیں، لیکن انسانیت پر ایک ایسا خوفناک اور برا دن بھی آنے والا ہے، جس دن نجات کے لیے کوئی عمل کرنے کی فرصت نہ ہو گی۔ اس دن کو آخرت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دن شفاعت عظمیٰ کا حق رکھنے والے رسولِ خدا ﷺ ساری انسانیت کی شفاعت کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے، تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شفاعت کی بھی کچھ حدود ہیں اور یہ شفاعت اللہ تعالیٰ کے اذن و اجازت سے ہی ہو گی: ﴿مَن ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ﴾ (البقرۃ: ۲۵۵) "کون ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس سے کسی کی سفارش کر سکے؟"

یہ بالکل فطری بات ہے، کیونکہ شفاعت کنندگان بسا اوقات جذبات سے مغلوب ہو کر حد سے تجاوز کرنے لگتے ہیں اور رحمت خداوندی سے زیادہ رحمت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ایسا طرز عمل اللہ تعالیٰ کے شایان ادب کے مناسب نہیں، اسی لیے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے ایک معیار اور میزان مقرر فرمایا ہے، جس کے ذریعے واضح ہو جاتا ہے کہ کون کس کے لیے اور کس حد تک شفاعت کر سکتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے دیگر تمام افعال و اقدامات میں عدل اور توازن پایا جاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جس شفاعت کا حق دیں گے اس میں عدل اور توازن پایا جائے گا۔ اگر اس قسم کی حدود مقرر نہ کی جاتیں تو بعض لوگ شفاعت کے حق کو بے اعتدالی سے استعمال کرتے۔ اگر شفاعت کے حق کی حدود نہ ہوتیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ بعض لوگ انسانوں کو جہنم میں جلتا ہوا دیکھ کر رحمت و شفقت کے جذبات سے اس قدر مغلوب ہو جاتے کہ وہ تمام کافروں، منافقوں اور مجرموں کو جنت میں داخل کرنے کا مطالبہ کرتے، لیکن ایسا مطالبہ اربوں اہل ایمان کے حقوق پر ڈاکہ سمجھا جاتا۔

اگر شفاعت کے معاملے کو لوگوں کے جذبات پر چھوڑ دیا جاتا تو اس سے کافروں، گنہگاروں اور گمراہوں کے استفادہ کرنے کا احتمال بھی ہوتا، جس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ کفار جو اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے ہر نظام، حکم اور جمال کا انکار کرنے، ان کی اہانت کرنے اور انہیں جھٹلانے جیسے گناہوں کا ارتکاب کرتے رہے ہیں وہ بھی رحمت کے زیرسایہ آجاتے۔ کافر اپنی زندگی کے ہر لمحے میں اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے کہ جسے چھپانے کے لیے کائنات کی وسعت بھی تنگدامنی کی شکایت کرنے لگتی ہے، لہٰذا ایسی روسیاہ اور تاریک روحوں والے لوگوں پر رحم کھانا خود رحم کی تذلیل ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی شفاعت کو اپنی امت کے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے ذخیرہ قرار دے کر اپنے ہر عمل کی طرح یہاں بھی اعتدال کا راستہ اختیار فرمایا ہے۔ اس حدیث میں ساری امت کے لیے تسلی کا سامان ہے اور وہ آپ ﷺ کی شفاعت کی امیدوار

ہے۔ ایک دن اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے حلاج پر جذب کی کیفیت طاری ہو گئی اور وہ اپنی حد سے تجاوز کر کے ایسی بات کہہ گیا جس کا حاصل یہ ہے کہ اے سلطان الانبیاء! آپ نے یہ حدود کیوں مقرر کیں؟ آپ نے ساری انسانیت کے لیے شفاعت کیوں نہ مانگی؟ اگر آپ اپنے پرورد گار سے اس کی درخواست کرتے تو وہ آپ کی درخواست کو قبول کرتا۔

اگر وہ اس وقت ہوش و حواس میں ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات اپنے پاس سے نہیں فرمائی تھی: ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ﴾ (النجم:٣) "اور نہ یہ خواہش نفس سے کچھ بولتے ہیں۔" ممکن ہے کہ جیسا کہ حلاج کا کہنا ہے اگر رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے سارے انسانوں کے لیے شفاعت کی درخواست کرتے تو وہ آپ ﷺ کی درخواست کو قبول فرما لیتے، لیکن رسول اللہ ﷺ اپنے پرورد گار کا انتہائی پاس و ادب کرتے، وہی بات کرتے جو ان کا پرورد گار فرماتا اور اپنی صلاحیتوں کی حدود سے کبھی بھی تجاوز نہ فرماتے۔ آپ ﷺ کے پرورد گار کی طرف سے شفاعت کے لیے وضع کردہ ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ شخص شفاعت کا مستحق بھی ہو۔ اسی حقیقت کی طرف درج ذیل آیت مبارکہ بھی مشیر ہے: ﴿فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ﴾ (المدثر: ۴۸) "تو سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے حق میں کچھ فائدہ نہ دے گی۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شفاعت کا اختیار غیر محدود ہے اور نہ ہی ہر کسی کے لیے ہے، نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر شفاعت کو قبول کیا جائے۔ بنیادی حیثیت ہر چیز میں جاری و ساری مشیت الٰہیہ کی ہے۔ کافر شروع سے ہی شفاعت کے دائرے سے خارج ہے، لہٰذا کوئی بھی اس کے حق میں شفاعت نہیں کر سکتا اور اگر بالفرض کوئی کرے گا تو اس کی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی۔

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ایک دعا کی تعلیم دیتے ہیں، جس میں اشارتاً بلند حوصلگی کی اہمیت اور ضرورت بھی اجاگر ہوتی ہے: ﴿وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا﴾ (الفرقان: ۷۴) "اور وہ جو دعا مانگتے ہیں کہ اے پرورد گار ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیز گاروں کا امام بنا۔" یعنی "اے پرورد گار! ہمیں ایسی بیویاں اور نیک اولاد عطا فرما

جن کی وجہ سے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہو۔ ہمیں ایسے پشت پناہ رفقائے حیات نصیب فرما جو ہمیں آپ کی طرف چلنے کی رغبت دلائیں، ہماری اولاد ہماری وفات کے بعد اپنے نیک اعمال اور دعاؤں کے ذریعے ہم پر آپ کی رحمت کے نزول کا ذریعہ بنیں اور اے پروردگار! ہمیں نہ صرف متقین بلکہ امام المتقین کے مرتبے تک پہنچائیے۔"

اس طرح کی سوچ بلند حوصلگی کی آئینہ دار ہے اور اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے شفاعت کی درخواست کا انداز ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس شفاعت کا حق نہ دینا چاہتے تو ہمیں اس کے مانگنے کا طریقہ بھی نہ سکھاتے، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے کہ ہم اس سے کیسے مانگیں اور سوال کریں تو یقیناً ہم جو چیز ان سے مانگیں گے وہ ہمیں وہ چیز عطا بھی کریں گے۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت سے اسی کی امید اور توقع ہے۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔ جنت کے ایک گوشے کی درخواست پر اکتفا کر لینا کم ہمتی کی دلیل ہے۔ جب اللہ تعالیٰ ہم سے بلند حوصلگی کے خواہاں ہیں تو ہمیں بھی ان سے متقین کی پیشوائی اور شفاعت کے حق کی درخواست کرنی چاہیے۔

ایک حدیث مبارک میں رسول اللہ ﷺ آخرت کے ایک منظر کی تصویری کشی کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "حضرت نوح علیہ السلام کو بلا کر ان سے پوچھا جائے گا: کیا آپ نے پیغام رسالت پہنچایا تھا؟" وہ کہیں گے: "جی ہاں" پھر ان کی قوم کو بلا کر ان سے پوچھا جائے گا: "کیا انہوں نے تمہیں پیغام رسالت پہنچایا ہے؟" وہ کہیں گے: "ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا آیا اور نہ ہی کوئی اور شخص آیا۔" پھر حضرت نوح علیہ السلام سے پوچھا جائے گا کہ آپ کے گواہ کون ہیں؟ وہ کہیں گے: "محمد ﷺ اور ان کی امت۔" چنانچہ تمہیں لایا جائے گا اور تم ان کے پیغام رسالت پہنچانے کی گواہی دو گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ (البقرۃ: ۱۴۳) "اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر آخر الزماں ﷺ تم پر گواہ بنیں۔" کا یہی مطلب ہے۔(113)

شفاعت برحق اور حقیقت ہے اور تمام عظیم ہستیاں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے شفاعت کریں گی۔ اگر ہم گواہی کو بھی ایک طرح کی شفاعت تصور کریں تو ساری امت محمدیہ بھی شفاعت کرنے والی سمجھی جاسکتی ہے۔ جو لوگ شفاعت کا انکار کرتے ہیں وہ دنیا و آخرت دونوں میں فائدے سے محروم رہیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ ان کے علم، فہم اور توقع کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں۔

توبۃ النصوح سے کیا مراد ہے؟

توبۃ النصوح سے متعلق آیت مبارکہ میں اہل ایمان سے خطاب کر کے کہا گیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا﴾(التحریم:۸) "مؤمنو! اللہ کے آگے صاف دل سے توبہ کرو۔" اس آیت مبارکہ میں ایمان، توبہ اور نصوح تین ایسے الفاظ ہیں جن کی وضاحت ضروری ہے۔

پہلا لفظ ایمان ہے۔ ایمان اسلام کو مجموعی حیثیت سے تسلیم کرنے، زبان سے اس کا اقرار کرنے اور دل سے اس کی تصدیق کرنے سے عبارت ہے۔ جب تک انسان تمام واجب الایمان امور پر ایمان نہ لائے اس وقت تک وہ مؤمن نہیں کہلا سکتا۔ اگرچہ ہمارے پیش نظر ایمان کے شرعی مفہوم کی وضاحت کرنا ہے، لیکن اس کے باوجود ایمان کے لغوی مفہوم پر روشنی ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے انسان خدائی امان میں آجاتا ہے۔ انسان دنیا کے حادثات، اس کی پہاڑ جیسی مشکلات، آخرت کے عذاب اور اس کی ان ہلاکت خیزیوں سے جن کے مقابلے میں دنیا کے مصائب کی کچھ حیثیت نہیں صرف ایمان کی بدولت ہی نجات پا سکتا ہے۔

دوسرا لفظ توبہ ہے۔ توبہ انسان کی تجدیدِ نو اور اصلاحِ باطن سے عبارت ہے۔ اس کے ذریعے نافرمانی اور غلط تصرفات کے نتیجے میں دل کے بگڑے ہوئے توازن کو بحال کیا جاتا ہے۔ یہ حق کی طرف پیش رفت ہے، بلکہ زیادہ مناسب الفاظ میں یہ اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب سے اس کے لطف و کرم اور اس کی بازپرس سے اس کی رحمت و عنایت کی طرف پیش قدمی ہے۔ توبہ کی تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ گناہ کے احساس کے نتیجے میں انسان کی خود احتسابی سے عبارت ہے۔ دوسرے لفظوں میں غیر ذمہ دارانہ طور پر زندگی بسر کرنے سے انکار کر کے نفس کے سامنے ڈٹ جانے، کبیرہ گناہوں سے بچنے اور ان کے ارتکاب کا خیال بھی دل میں نہ آنے دینے کا نام توبہ ہے۔

گناہ ہلاکت کی کھائی میں گرنے کے مترادف ہے تو توبہ نفس کا سہارا اور باہر جست لگا کر اس گراوٹ سے نجات کا راستہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں گناہ خود احتسابی سے غفلت برتنے کے نتیجے میں روح اور وجدان کو عارضی طور پر پہنچنے والا زخم ہے تو توبہ دردِ دل کا احساس، خود احتسابی اور حواس کو نئی طاقت اور توانائی بہم پہنچانے سے عبارت ہے۔ گناہ شیطان اور نفسانی خواہشات سے مغلوب ہونے کا نام ہے جبکہ توبہ شیطان سے حواس کی حفاظت کرکے اعتدال کو بحال کرنے اور روح کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے سے عبارت ہے۔

گناہ روح کو گھن لگا کر کھوکھلا کرتے ہیں، جبکہ توبہ اس کے برعکس عمدہ کلمات کے تعمیری اسلوب کے ذریعے گناہ کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس توبہ کا کیا کہنا جس کے ذریعے دلوں پر لرزہ طاری ہونے اور آنکھوں کے پتھرانے سے پہلے عمل کی تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ کاش! ہم توبہ کی آہ و بکا کے ذریعے گناہوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے ہر خلا کو پُر کرنے میں کامیاب ہوسکتے۔

انسان پیدائشی طور پر ہر قسم کی کجی اور گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ اپنی فطرت اور سیدھے راستے سے وہی لوگ انحراف کرتے ہیں، جنہوں نے اپنے آپ کو بنجر زمین کے حوالے کر دیا ہوتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ گلنے سڑنے کی صورت میں نکلتا ہے، کیونکہ گناہ انسان کی بربادی کا سبب ہیں۔ ایک آیت مبارکہ میں گناہ کے بعد انسان کے اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرنے کا ذکر ہے: ﴿وَأَنِيبُوا إِلَى رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوا لَهُ﴾ (الزمر:۵۴) ''اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرمانبردار ہو جاؤ۔'' انابت لوٹنے اور رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ توبہ گناہوں میں ملوث ہونے کے بعد پاکیزہ اصل کی طرف لوٹنے سے عبارت ہے۔ ایک حدیث نبوی میں ہے کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ بن جاتا ہے۔ اگر وہ باز آجائے اور توبہ واستغفار کرے تو اس کا دل صاف کر دیا جاتا ہے اور اگر دوبارہ گناہ کا ارتکاب کرے تو اس میں اضافہ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے دل پر اس زنگ (ران) کا غلبہ ہو جاتا ہے، جس کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِم

مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (المطففین:۱۴) "ہر گز نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ یہ جو اعمال (بد) کرتے ہیں ان کا ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔" یعنی گناہ کے ارتکاب کا خیال اس کے دل پر بالکل اسی طرح حاوی ہونے لگتا ہے جیسے کوئی شخص سیڑھی سے اترتا ہے کہ جب وہ ایک زینے سے اترتا ہے تو دوسرے کے لیے اپنے آپ کو تیار پاتا ہے اور جب دوسرے سے اترتا ہے تو تیسرے زینے کے لیے اپنے آپ کو تیار پاتا ہے، اسی طرح جس شخص کو گناہوں کی لت پڑ جاتی ہے اس کے دل سے شرم و حیا رخصت ہو جاتی ہے اور اس کے لیے بڑے بڑے گناہوں کا ارتکاب بھی آسان ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ تنزل اور پستی کا شکار ہو کر اسفل السافلین کے مقام تک جا گرتا ہے۔ اسی لیے کسی عقلمند کا قول ہے:"ہر گناہ کفر تک پہنچانے کا راستہ ہے۔" جبکہ توبہ اس پستی کا راستہ روکنے کا ذریعہ اور اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے راستے کی طرف رخ موڑنے اور اس کی خاطر جدوجہد کرنے سے عبارت ہے۔

توبہ گمراہی اور انحراف کے بعد انسان کے اپنے مالک کی طرف لوٹنے کا نام ہے، یہی وجہ ہے کہ بخاری و مسلم میں مروی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:"جب اللہ کا کوئی بندہ اس کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ سے اس شخص کی بہ نسبت زیادہ خوش ہوتے ہیں جو کسی بیابان میں اپنی اونٹنی پر ہو وہ اونٹنی اس سے بھاگ جائے، اس کا کھانا اور پانی بھی اسی اونٹنی پر ہو اور وہ مایوس ہو کر ایک درخت کے نیچے آکر لیٹ جائے۔ اسی دوران اچانک وہ اونٹنی اس کے پاس آکر کھڑی ہو جائے، وہ اس کی مہار پکڑ لے اور خوشی کی شدت سے کہہ بیٹھے:"اے اللہ! آپ میرے بندے ہیں اور میں آپ کا پروردگار ہوں۔" یعنی خوشی کی شدت سے اس سے الفاظ آگے پیچھے ہو جائیں۔" (114)

بلاشبہ ہم حدیث مبارک میں وارد لفظ "فرح" (خوشی) کو متداول مفہوم کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفت الغنی المطلق کے شایانِ شان اس کا دوسرا معنی مراد ہے۔ اگرچہ ہم اس معنی کے ادراک سے عاجز ہیں، لیکن اتنی بات ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر اپنی خوشی کا اظہار فرماتے ہیں اور یہی بات اہم ہے۔

توبہ کے دو رُخ ہیں۔ ایک رُخ ہماری طرف اور دوسرا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ رسول اللہ ﷺ "ویتوب اللہ علی من تاب"[115] (جو اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرماتے ہیں۔) میں اسی مفہوم کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دروازے از سر نو ہم پر کھول کر ہماری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جب ہم سیدھے راستے سے منحرف ہو جاتے ہیں تو ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان سارے تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن جب ہم اپنی فطرت کے خلاف راستہ اختیار کرنے پر نادم و پشیمان ہوتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تعلقات پھر سے استوار ہونے لگے ہیں۔ پہلا مرحلہ ہماری توبہ ہے، جس کی ابتدا عزم اور ندامت سے ہوتی ہے۔ دوسرا مرحلہ اللہ تعالیٰ کا ہماری طرف متوجہ ہونا اور یہ کہتے ہوئے ہم پر اپنی رحمت کے در کھولنا ہے: "اے میرے بندو! میں تمہیں بھولا اور نہ ہی میں نے تمہیں چھوڑا ہے۔ جب تک تم مجھے یاد کرتے رہو گے میں تمہاری طرف سے بار بار کی عہد شکنی کے باوجود تمہاری توبہ قبول کرتا رہوں گا۔" بے شک اللہ تعالیٰ ارحم الراحمین ہیں، لہٰذا ہم سے کتنی ہی برائیوں کا ارتکاب کیوں نہ ہو جائے، ہمیں یہ کہتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے: "اے ارحم الراحمین! اے غفور! اے غفار! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری سیئات سے درگزر فرما۔"

تیسرا لفظ نصوح ہے، جو فعول کے وزن پر اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اس میں مبالغہ کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اس کا معنی نفس کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے۔ یہ "النصیحۃ" سے ماخوذ ہے۔ نصیحت دوسروں کے ساتھ خیر خواہی، اچھی سوچ اور اچھے طرزِ فکر سے عبارت ہے۔ جب ہم کہتے ہیں: "الدین النصیحۃ" تو ہمارے پیش نظر دوسروں کی بھلائی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں گمراہی سے روکنا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت اس کے مقتضیات میں سے ہے اور اسی لیے ہم سیدنا مسیح علیہ السلام کی تعبیر کو اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے والی نورانی جماعت پر "جیش القدیسین" کا اطلاق

کرتے ہیں۔ اگر ان سپاہیوں پر آسمان ٹوٹ پڑے اور ان کے نیچے سے زمین پھٹ پڑے تب بھی وہ اسلام کی خدمت سے دستبردار نہ ہوں گے، بلکہ بہادری سے دعوت پر قائم رہیں گے، خواہ دین پر استقامت آگ کے انگاروں کو تھامنے کے مترادف ہی کیوں نہ ہو۔

اللہ، رسول، قرآن اور دین اسلام کی طرف دعوت دینے، بے چین دلوں میں اطمینان پیدا کرنے، آخرت کو بھلا کر اس سے مایوس ہو چکنے والے دلوں میں اس کا احساس اور فکر پیدا کرنے اور آخرت میں جمالِ خداوندی کے دیدار کہ جس کا ایک لمحہ جنت کے ہزاروں سالوں کی زندگی کے برابر ہے کا شوق پیدا کرنے کو "خیر خواہی" کے ایک لفظ میں سمویا جا سکتا ہے اور یہ سب کچھ حدیث نبوی "الدين النصيحة" میں وارد لفظ "النصيحة" کے تحت داخل ہے۔ یہ بات اوپر گزر چکی ہے کہ لفظ نصوح مبالغہ کے ساتھ خیر خواہی سے عبارت ہے۔

انسان پر لازم ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے آپ سے خیر خواہی کرے اور سب سے پہلے اپنے آپ کو ہر قسم کی برائی اور گناہ سے بچائے۔ جان کی حفاظت حقوق کے پانچ ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے، لہٰذا انسان کو شراب، زنا، کفر اور گمراہی سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔ ان میں سے ہر ایک کا اصول خمسہ میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ تعلق ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کو اپنے آپ کو جہنم کا ایندھن بننے سے بچانا چاہیے۔ اگر اس نے ایندھن بن کر زندگی گزاری تو اس کا حشر بھی ایندھن والا ہو گا۔ ایندھن کا انجام سب کو معلوم ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ وہ (کفار) جہنم کا ایندھن ہیں، لہٰذا انسان کو اپنے ساتھ خیر خواہی کا حریص ہونا چاہیے، لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ ہر قسم کے گناہوں کے بارے میں انتہائی حساس ہو۔ یہ خیر خواہی اس قدر شدید ہونی چاہیے کہ اسے کفر و گمراہی سے نجات پانے کے بعد انہیں دوبارہ اختیار کرنا ایسے ہی ناپسندیدہ ہو جیسے آگ میں پھینکے جانا۔

لیکن اس کے باوجود بعض اوقات انسان سے لغزش ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے سامنے عقل و ضمیر کی طرف رجوع کر کے یہ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا: "میں اس

حالت تک صرف اللہ تعالیٰ سے دوری کی وجہ سے پہنچا ہوں، لہٰذا اس کے طرف رجوع کیے بغیر میری نجات کی کوئی صورت نہیں ہے۔" وہ یہ کہہ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کوشش "توبۃ النصوح" کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان گزشتہ گناہوں کی طرف دوبارہ لوٹ کر نہ جائے، کیونکہ اپنے لیے بھلائی چاہنے والوں کا یہ شیوہ نہیں ہے۔ جس طرح انسان اپنی اولاد کے لیے ہمیشہ بھلائی کا متمنی اور ان کے لیے روشن مستقبل کا آرزومند ہوتا ہے، اسی طرح اسے اپنے لیے بھی ہمیشہ بھلائی کا طالب ہونا چاہیے۔ اس لیے اسے کوشش کرنی چاہیے کہ سرے سے اس سے گناہ کا ارتکاب ہو ہی نہیں اور اللہ تعالیٰ سے دوری کو بہت بڑا جرم اور ناقابل تلافی نقصان سمجھنا چاہیے۔ ایسی صورت میں اس کی توبہ توبۃ النصوح ہوگی۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوا تُوبُواإِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوحاً﴾ (التحریم:۸)"مؤمنو! اللہ کے آگے صاف دل سے توبہ کرو۔" گویا اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے کہہ رہے ہیں: "تم اپنے ایمان کے سبب محفوظ مقام پر کھڑے ہو۔ اس ایمان کے ذریعے تم میں سیاہ وسفید اور خیر وشر میں امتیاز کرنے کا ملکہ پیدا ہوا ہے۔ تم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اس پر بھروسا کیا اور اس کا سہارا لیا۔ اگر کسی لمحے تم سے لغزش یا سیدھے راستے سے انحراف ہو جائے تو ہرگز مایوس نہ ہونا، کیونکہ اللہ تعالیٰ شرک کے سوا ہر گناہ کو بخش دیتے ہیں: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ﴾ (النساء:۴۸) "اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے۔" لہٰذا جس جگہ تم گر پڑو وہاں پڑے نہ رہو، بلکہ اپنی لغزش پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ، تاکہ تم اپنے آپ کو پالو اور اس کی طرف لوٹ جاؤ۔" میرے نزدیک یہی توبۃ النصوح ہے۔

توبۃ النصوح کی چند شرائط ہیں جن میں سے کچھ حسبِ ذیل ہیں:

اول: اگر گناہ کا تعلق بندوں کے حقوق میں سے کسی حق سے ہے تو سب سے پہلے حقدار کو اس کا حق ادا کر کے اس سے معذرت کرنا اور معافی مانگنا ضروری ہے۔

دوم : اس گناہ کا دوبارہ ارتکاب نہ کرنے کا پختہ عزم کرنا۔

سوم : گناہ اور توبہ کے درمیان زیادہ وقت نہ گزرنے پائے، یعنی جس قدر ممکن ہو سکے کوئی گناہ پانچ منٹ کے لیے بھی بغیر توبہ کے نہ رہے۔

توبہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ گناہ کی وجہ سے روح کو تکلیف محسوس ہو اور دل میں نفرت و ناگواری کے جذبات پیدا ہوں، کیونکہ اگر گناہوں کے ارتکاب کی عادت پڑ جانے کی وجہ سے کسی کو گناہ پر دکھ نہ ہو اور وہ صرف زبان سے توبہ کرتا رہے تو اس کا یہ عمل توبہ نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ وہ خودکار حرکاتِ اور بے فائدہ عبارات کا مجموعہ تصور ہو گا۔ توبہ ایسے دکھ درد سے عبارت ہے، جسے ضمیر محسوس کرتا ہے اور انسان اس کی وجہ سے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ ندامت اور تکلیف کے اس احساس کے بعد زبان سے توبہ کے الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں توبہ ندامت اور درد کے اظہار کا نام ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا طریق کار صاحب شریعت رسول اللہ ﷺ سے سیکھا جائے، مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں "**الله العظیم الکریم الذی لا اله الا ہو توبة عبد ظالم لایملک لنفسه موتاً ولاحیاةً و لا نشوراً**" (میں اس عظیم و کریم ذات سے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں مغفرت مانگتا ہوں۔ یہ ایک ایسے ظالم بندے کی طرف سے توبہ کا اظہار ہے، جسے اپنی موت و حیات پر قابو حاصل ہے اور نہ ہی اٹھائے جانے کی اس میں سکت ہے۔) رسول اللہ ﷺ کی ایک دوسری حدیث مبارک میں ہے کہ توبہ کا ارادہ رکھنے والا دو رکعت نماز ادا کر کے اپنی پیشانی زمین پر ٹکا دے اور دل سے یوں کہے: "اے حی و قیوم ذات! میں آپ کی رحمت سے مدد کا طلبگار ہوں۔ میری ساری حالت کو درست فرما دیجئے اور مجھے ایک لمحے کے لیے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کیجئے۔" یا اس جیسی کوئی اور دعا مانگے۔ غرض اپنی ندامت کا اظہار اس قسم کی دعاؤں کے ذریعے کیا جانا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ سے منقول ایک دعا ہے، جسے سید الاستغفار بھی کہتے ہیں۔ اسے صبح و شام پڑھا جانا چاہیے: "**أللّٰهُمَّ أنت ربی لا اله الا أنت، خلقتنی و أنا عبدک، و أنا علی عهدک**

ووعدک مااستطعت، أعوذ بک من شرما صنعت،أبوء لک بنعمتک علی و أبوء لک بذنبی، فاغفرلی فانه لایغفر الذنوب الا أنت"بعض سلف صالح نے دعا میں وارد لفظ "أنت" کے بعد "یاغفار یاغفور" کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ اگرچہ یہ اضافہ رسول اللہ ﷺ کی عبارت میں منقول نہیں ہے، لیکن شفاعت کی غرض سے اللہ تعالیٰ کے دواسمائے حسنیٰ کا اضافہ اچھی بات ہے۔

توبہ دل میں پیدا ہونے والے احساسِ ندامت کا نام ہے۔ اوپر ذکر کردہ دعاؤں کے ذریعے ہمارے استغفار کی قبولیت اسی احساسِ ندامت کے ساتھ مشروط ہے۔ لہٰذا اگر ہم زبان سے "أستغفرالله أستغفر الله العظیم الکریم الذی لا اله الا هو الحی القیوم و أتوب الیه" کہیں، لیکن دل کی گہرائیوں میں احساسِ ندامت نہ ہو تو ایسے استغفار کا کوئی فائدہ نہیں۔ انسان کو چاہیے کہ کم ازکم اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار صدقِ دل سے کرے، کیونکہ توبہ کا عمل کوئی ہنسی مذاق یا بے معنی رسم ورواج نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ کے حضور ندامت کے حقیقی شعور کا اظہار کرتے ہیں۔

آخر میں اس طرف اشارہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مساجد میں جو بعض لوگ ایمان اور نکاح کی تجدید کی رسم ادا کرتے ہیں اس کی کوئی بنیاد ہے اور نہ ہی اس میں کہے گئے الفاظ کا کسی مسلمان کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ نکاح جیسے سنجیدہ اور اہم موضوع کے بارے میں یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ میں اپنے ایمان اور نکاح کی تجدید کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ لغوی اعتبار سے بھی اس قسم کے جملے پر اعتراض ہوتا ہے، کیونکہ وہ شخص تجدید کی خواہش کا صراحتً اظہار نہیں کرتا، بلکہ یہ کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں سوچ رہا ہے، یعنی ممکن ہے کہ وہ مستقبل میں اس پر عمل کرے۔ جبکہ اس قسم کی بات کہنا بڑی خطرناک بات ہے، کیونکہ اگر انسان سے قصداً یا بلاقصد کسی کفریہ بات کا صدور ہوا ہو تو اس پر بغیر کسی تاخیر کے فوراً اپنے ایمان کی تجدید کرنا ضروری ہوتا ہے، جس کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ دل سے کلمہ شہادت "أشهد أن لااله الا الله وأشهد أن محمداًعبده و رسوله" پڑھے۔ اس بارے میں کسی قسم کی تاخیر کی ہرگز

گنجائش نہیں۔ مسلمانوں کو غیر سنجیدہ امور میں مشغول کرنا یا ان کے ذریعے انہیں تسلی دینا بے فائدہ کام ہے۔ ہمیں سنجیدگی سے توبہ کرنی چاہیے اور کسی بھی غلطی یا لغزش پر ہمیں دل سے کانپ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، نیز ہمارے یہ سارے اقدامات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ طریق کار کے مطابق ہونے چاہئیں۔

کیا دعوت وارشاد کے وسائل سے ذاتی فائدہ اٹھانا جائز ہے، جبکہ آیت مبارکہ ﴿إِنْ أَجْرِيَ إِلاَّ عَلَى اللهِ﴾(یونس:۷۲) "میرا معاوضہ تو اللہ کے ذمہ ہے۔" استغناء کا درس دیتی ہے؟

پانچ انبیائے کرام حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب اور حضرت لوط علیہم السلام نے اپنی اپنی قوم سے فرمایا تھا: ﴿إِنْ أَجْرِيَ إِلاَّ عَلَى اللهِ﴾ "میرا معاوضہ تو اللہ کے ذمہ ہے۔" قرآنِ کریم کے بعض مواقع پر حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام سے بھی اسی طرح کا مفہوم منقول ہے، لیکن ﴿إِنْ أَجْرِيَ إِلاَّ عَلَى اللهِ﴾ کی تعبیر صرف اوپر ذکر کردہ پانچ انبیائے کرام کے حق میں استعمال ہوئی ہے، نیز اللہ تعالیٰ کے نیک بندے حبیب نجار نے بھی سورت یس میں اس کی ہم معنی گفتگو کی ہے: ﴿يَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ٥ اتَّبِعُوا مَن لاَّ يَسْأَلُكُمْ أَجْراً وَهُم مُّهْتَدُونَ﴾ (یس:۱۲) "اے میری قوم پیغمبروں کے پیچھے چلو۔ ایسوں کے جو تم سے صلہ نہیں مانگتے اور وہ سیدھے رستے پر ہیں۔" ایک دوسرے مقام پر حضرت نوح علیہ السلام اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔ حاصل یہ کہ انبیائے کرام دعوت الی اللہ کی ذمہ داری کی ادائیگی کے عوض لوگوں سے کسی قسم کا معاوضہ اور بدلہ نہیں مانگتے: ﴿وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾(الشعراء: ۱۰۸) "اور میں اس کام کا تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا میرا صلہ تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔" اور یہ عہد و پیمان دیتے ہیں کہ وہ وظیفۂ نبوت کی ادائیگی کے عوض لوگوں سے کسی قسم کے بدلے یا فائدے کا سوال نہ کریں گے۔

دعوت وارشاد کی ذمہ داری اٹھانے والے ہر دور کے مرشد کے لیے ضروری ہے کہ وہ انبیائے کرام کی پیروی کرے۔ جو لوگ وعظ وارشاد کی غرض سے دیہاتوں اور قصبوں میں جاتے ہیں انہیں حق کی نشرواشاعت کی خدمات سرانجام دینے کے عوض کسی قسم کا بدلہ قبول کرنے یا مفاد

اٹھانے سے گریز کرنا چاہیے، کیونکہ لوگوں پر ان کی گفتگو کے اثرات مرتب کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی گفتگو کی تاثیر کو ان کے صدق و اخلاص، قربانی اور وظیفہ دعوت وارشاد کے عوض کسی بھی قسم کے بدلے کی امید نہ رکھنے کے ساتھ مشروط کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام اور برگزیدہ بندوں کی گفتگو بہت پُر تاثیر ہوتی تھی، لیکن بعض ضروری شرائط کے نہ پائے جانے کی وجہ سے آج ہماری گفتگو کی تاثیر کم ہو گئی ہے۔

جو لوگ دنیا میں ہی صلے کے خواہاں ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی گفتگو میں کسی قسم کی تاثیر پیدا نہیں فرماتے۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے۔ ایک دوسری اہم بات یہ ہے کہ دعوت وارشاد کی ذمہ داری سرانجام دینے والے حضرات کو انبیائے کرام کی پیروی کرتے ہوئے اپنی خدمت کے صلے میں کوئی معاوضہ نہیں لینا چاہیے، تاکہ دنیا والوں کے اعتراضات کا نشانہ بننے سے بچے رہیں، کیونکہ معاوضہ لینے کی صورت میں وہ کہیں گے: ”اگرچہ یہ لوگ حق کی نشرواشاعت کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی خدمات کے ثمرات سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں اور اس طریقے سے اپنی روزی کا بندوبست کرتے ہیں۔“ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ میلاد نامے پڑھنے والے کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے، کیونکہ وہ حمد و نعت پڑھنے کا معاوضہ لیتا ہے، گویا وہ یوں کہہ رہا ہوتا ہے: ”چونکہ میں نے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی ہے، اس لیے مجھے اس کا معاوضہ دو۔“ اسی لیے اس کی گفتگو اور ثناخوانی کا عوام کے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جب تک مال کا حصول مطلوب ہو اس وقت تک گفتگو میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی، لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ نحیف آواز والے مگر رضائے الٰہی کے طالب سچے اور مخلص واعظ کی گفتگو کا سامعین پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کی تاثیر کا راز حق کی اشاعت کے وقت لوگوں سے استغناء برتنے میں مضمر ہے۔

نہ جانے کتنی بار دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ دعوت الی اللہ اور اسلام اور قرآن کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنے والے داعی حضرات دنیوی نعمتوں کی طرف قطعاً مائل نہ ہوں، اپنے آپ کو ہر قسم کی آمیزش اور میل کچیل سے محفوظ رکھیں، استغناء کو اپنا شعار بنائیں،

بقدر ضرورت روزی پر اکتفا کریں اور دنیا سے کوچ کے وقت اپنے پیچھے کوئی گھر یا مال و اسباب نہ چھوڑ کر جائیں۔ داعی حضرات کو چاہیے کہ وہ اپنے بعد اپنی اولاد کی تونگری کی فکر کریں اور نہ ہی گھر بنانے اور مال و دولت جمع کرنے کی حرص اپنے اندر پیدا ہونے دیں، بلکہ لوگوں سے مستغنی ہو کر رہیں۔ دورِ حاضر کے جن داعیوں نے ترکی میں دعوت کے ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے ان میں سے ایک داعی کے انتقال کے وقت ان کی ملکیت میں صرف پچیس قرش کی بقدر نقدی تھی۔ یہ کتنی عمدہ مثال ہے، جس سے دوست اور دشمن سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ ان کے ہاں اسلام کی خدمت کے پس پردہ کسی قسم کی دنیوی غرض کار فرما نہیں۔

دعوت کا کام کرنے والوں کو اپنے اہل و عیال کی روزی کا بندوبست کرنا چاہیے اور انہیں اتنی تعلیم دینی چاہیے کہ وہ کوئی پیشہ یا ملازمت اختیار کر سکیں، لیکن اسے ضرورت کی حد تک محدود رکھنا چاہیے۔ انہیں اشاعتِ حق کے مقدس فریضے کو سرانجام دیتے ہوئے کسی دنیوی غرض کو پیش نظر نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ اپنے اوپر اعتماد کو بحال رکھنے کے لیے انہیں ہر قسم کی مادی و روحانی قربانی پیش کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔ انہیں اپنی ذاتی زندگی پر توجہ دینے کی بجائے مردہ دلوں کے احیائے نو کی فکر کرنی چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو دنیا اور اس کی زیب و زینت ان کی زندگی اور دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو سکے گی اور نہ ہی ان کی امیدوں کا محور بن سکے گی، لیکن اگر انہیں اس میں ناکامی ہوئی تو وہ اپنی حقیقی متاع سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور ہمیشہ کی ناکامی ان کا مقدر بن جائے گی۔ جو لوگ دینی خدمات سرانجام دیتے ہوئے دنیا کے پیچھے دوڑتے ہیں ان کا انجام بہت برا ہو گا اور اس کے برے اثرات ان کے اہل و عیال پر بھی پڑیں گے۔

اللہ کی طرف بلانے والوں کی زندگی اخلاص اور استغناء کا ایسا مظہر ہونی چاہیے کہ سب لوگ حتیٰ کہ ملأ اعلیٰ کے باسی بھی ان کے اخلاص کی گواہی دیتے ہوئے پکار اٹھیں: "یہ مخلص لوگ ہیں۔" جو لوگ دنیا پر سبقت لے جا سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے بلند ہو کر سوچ سکتے ہیں وہ آخرت میں بلند مقام حاصل نہیں کر سکتے۔ دنیا کے بوجھ تلے زندگی گزارنے والے راستے کی

مشکل گھاٹیوں کو عبور نہیں کر سکتے۔ دنیا پر ہمیشہ صرف انہی لوگوں نے اپنے اثرات ڈالے ہیں، جنہوں نے اپنی ذات اور دنیا کو پامال کیا ہے۔ کتنے ہی ہیرو ایسے گزرے ہیں جن کے ترکے میں گھوڑے، تلوار اور نیزے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اپنے دور کی دو عظیم سلطنتوں کو تاخت و تاراج کرنے والے حضرت خالد بن ولید نے وفات کے وقت فرمایا تھا: "میں اپنے پیچھے اپنے گھوڑے اور تلوار کے سوا کوئی چیز چھوڑ کر نہیں جا رہا۔" یہ حقیقت ہے کہ ان شخصیات کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اسی لیے انسان ان سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا: "خدا کے لیے مجھے بتائیے! آپ بادشاہ ہیں، صوفی ہیں یا درویش ہیں؟ مجھے بتائیے! آخر آپ کون ہیں؟"

بازنطینی اور ایرانی سلطنتوں کو شکست دینے والے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ترکے میں گھوڑے اور تلوار کے سوا کوئی چیز نہیں چھوڑی، لیکن اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ آج تک ہمارے دلوں میں بس رہے ہیں۔

خلاصے کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دعوت الی اللہ کا استغناء کے ساتھ اٹوٹ انگ رشتہ ہے۔ اس لیے تین صدیوں سے بے یار و مددگار ہو جانے والے قرآنِ کریم کی مدد و نصرت پر کمربستہ ہونے والے مخلص اور اپنی دنیوی اغراض اور خواہشات کو پامال کرنے والے داعی حضرات کو صرف رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کو پیش نظر رکھنا چاہیے، جو پیامِ صبح لانے والی نسلِ نو کی منتظر ہے۔ یہ سوچ ان کے دلوں پر اس قدر حاوی ہونی چاہیے کہ کسی اور خیال کے لیے ان کے دلوں میں جگہ ہی نہ رہے۔ دنیا ایک نئے دور کی منتظر ہے۔ اسلام اور قرآن کے علمبردار احیائے نو کا گیت گا رہے ہیں۔ اب تک ہم نے ان حضرات کے صرف ایک وصف کا تذکرہ کیا ہے۔ اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ دعوت اور دینی خدمات سرانجام دینے والوں کو اپنی روزی کو اس خدمت کے ساتھ مربوط نہیں کرنا چاہیے۔ یہ امت بہت خوددار ہے۔ وہ اخلاص کے ساتھ کام کرنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑے گی، بلکہ ان کی مدد و نصرت کرے گی، لیکن دینی خدمات سرانجام دینے والوں کو استغناء کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور کوئی چیز مانگنی نہیں چاہیے، تاہم اپنے اہل و عیال کے

لیے بقدر ضرورت خرچہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، جس کی دلیل آیت مبارکہ: ﴿وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا﴾ (التوبۃ:۶۰)"اور (زکوۃ) کارکنانِ صدقات کا حق ہے۔" ہے۔

چونکہ مسلمانوں کی رفاہ کے لیے کام کرنے اور زکوٰۃ اور ٹیکس وصول کرنے والے شخص کو مالدار ہونے کے باوجود ان اموال سے استفادہ کرنا جائز ہے،اس لیے میں داعی حضرات کے بقدر ضرورت تنخواہ لینے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا، لیکن میں یہ بات دوبارہ تاکید کے ساتھ کہتا ہوں کہ دینی خدمت سرانجام دینے والوں کے ہاں اصل استغناء، لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے گریز کرنا اور ان سے کسی بھی قسم کی امید وابستہ کرنے سے احتراز کرنا ہے۔یہ مستقبل کو سنوارنے کا عزم رکھنے والوں کا اہم ترین وصف ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دیگر شہروں کو چھوڑ کر صرف استنبول کی ہی فتح کی خوشخبری کیوں سنائی اور یہ کیوں بتایا کہ اس کی فتح ہمارے آباء واجداد کے ہاتھوں انجام پائے گی؟ کیا اس کی دینی اور تاریخی پہلو سے توضیح ممکن ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے صرف استنبول کی فتح کی ہی خوشخبری نہیں سنائی تھی، بلکہ احادیث نبویہ میں حضرت عمرو بن عاص کے تعمیر کردہ شہر "فسطاط" اور حضرت عقبہ بن عامر کے تعمیر کردہ شہر "قیروان" کی فتح کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں، نیز بعض روایات میں "بصرہ" کی فتح کا بھی ذکر ہے، تاہم استنبول کی فتح کی بشارت کو خصوصی اہمیت اور امتیازی مقام حاصل ہے۔ یہ بشارت مسند امام احمد اور مستدرک حاکم میں درج ذیل الفاظ سے منقول: " **لتفتحنّ القسطنطنية فلنعم الأمير أميرها و لنعم الجيش ذلک الجيش** " "تم ضرور قسطنطنیہ کو فتح کرو گے۔ وہ لشکر اور اس کا سپہ سالار کیا ہی خوب لوگ ہوں گے!"(116)

مسلمانوں کے ہاتھوں فتح کے بعد استنبول کو عالم اسلام میں بہت اہمیت حاصل ہو گئی اور وہ چہار دانگ عالم میں برسرپیکار اسلامی فوجوں کا مرکز بن گیا۔ وہ ایک عالمگیر سلطنت کا پایۂ تخت قرار پایا اور یورپ کی دہلیز پر ایک مبارک اسلامی شہر کا نمونہ پیش کرنے لگا۔ ان اسباب کی بنا پر اس نبوی بشارت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔

خلفائے راشدین کے دور میں مدینہ منورہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور یہاں سے زمانے بھر کو فتح کرنے کے لیے فوجیں روانہ ہوتی تھیں۔ سالہا سال تک اس کی ثقافتی اور عسکری مرکزیت برقرار رہی۔ گو اس کی روحانی حیثیت آج بھی قائم ہے، لیکن جیسے جیسے عالم اسلام کی جغرافیائی حدود تبدیل اور وسیع ہوتی رہیں ویسے ویسے دار الخلافہ بھی ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ پہلے دمشق اور پھر بغداد ایک طویل عرصے تک یہ فرائض سرانجام دیتا رہا، لیکن فتح استنبول کے بعد مکہ، مدینہ، دمشق اور بغداد کی نہ صرف حفاظت بلکہ ان کا خیال رکھنے کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر آن پڑی۔

ہر سال محفل صرۃ منعقد ہوتی، جس میں سلطان جلوس کے ہمراہ استنبول شہر کے باہر تک پاپیادہ جاتا تھا۔ یہ جلوس سب سے پہلے آلِ رسول ﷺ پھر صحابہ کرام کی اولاد اور پھر مدینہ منورہ کے تمام فقراء کی خدمت میں قیمتی ہدایا پیش کرتا تھا۔ یہ تحائف سونے، چاندی، مرجان جیسے قیمتی پتھروں اور دیگر بیش قیمت ہدایا پر مشتمل ہوتے تھے۔ استنبول ہر سال مدینۃ الرسول اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کے شہروں کی طرف تحائف بھیجنے کی سعادت سے بہرہ مند ہوتا تھا۔

اس شہر نے مستقبل میں جو جلیل القدر خدمات پیش کرنی تھیں انہی کی بدولت رسول اللہ ﷺ نے کئی صدیاں پیشتر اس کی بشارت دے کر اس کا شاندار استقبال کیا فتح استنبول کے بعد مدینہ منورہ، دمشق اور بغداد اپنے بیٹے کی مروت و خودداری سے لطف اندوز ہونے والے والدین کی مانند ہو گئے اور استنبول نے ایک فرمانبردار بیٹے کی مانند اپنے والدین کی ذمہ داریوں کو اٹھالیا۔ اسلام کا جو نور مدینہ منورہ سے طلوع ہو کر بغداد و دمشق میں چمکا تھا وہ زمین کے باقی ماندہ تاریک حصوں کو منور کرنے کے لیے استنبول سے ضیاپاشی کرنے لگا۔ اسی لیے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے تقدس کے باوجود استنبول کو نہ صرف ان شہروں بلکہ عالم اسلام کے دیگر شہروں کے لیے خدمت پیش کرنے کی وجہ سے خصوصی مقام حاصل ہے۔

فتح استنبول سے تاریخ کے ایک دور کا خاتمہ اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔(117) یورپ کو فتح کرنے کے لیئے اسلامی فوجیں استنبول سے روانہ ہونے لگیں۔ ایک سے زائد مرتبہ بغداد کو بھی استنبول سے فتح کیا گیا۔ سلطان مراد چہارم کے عہدِ خلافت میں آخری بار ہونے والی فتح کے لیے فوجیں بھی استنبول سے ہی روانہ ہوئی تھیں، جن کی بدولت ایک بار پھر عالم اسلام کی شیرازہ بندی ہوئی۔ اس قسم کی خدمات سرانجام دینے کی وجہ سے استنبول ایک بابرکت شہر بن گیا، نیز اس شہر نے مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہونے سے پہلے بھی جلیل القدر صحابی اور رسول اللہ ﷺ کے میزبان حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی میزبانی کی خدمت سرانجام دی۔

تقدیر کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ اس نے مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی میزبانی کرنے والے صحابی کی میزبانی کرنے کا شرف استنبول کو بخشا۔ سلطان محمد فاتح نے فتح استنبول کے

فوراً بعد حتیٰ کہ جامع الفاتح کی تعمیر، آیاصوفیا کی مسجد میں تحویل اور استنبول کے لیے وضع کردہ دیگر منصوبوں پر کام کے آغاز سے بھی پہلے اس جلیل القدر صحابی کی قبر مبارک کی تلاش کا حکم دیا چنانچہ انہوں نے (فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ) کے مظہر عظیم ولی حضرت اق شمس الدین کو یہ کہتے ہوئے یہ ذمہ داری سونپی: "رسول اللہ ﷺ کی میزبانی کرنے والے اس جلیل القدر صحابی کی قبر تلاش کرو۔" انہوں نے کچھ ہی عرصے میں اسے تلاش کر لیا اور سلطان محمد فاتح نے اس صحابی کی قبر کے قریب عالم اسلام کی خوبصورت ترین مسجد تعمیر کرائی۔

استنبول رسول اللہ ﷺ کی اہم اور بیش قیمت امانت اپنے سینے میں لیے ہوئے ہے۔ جہاد کی غرض سے آنے والے اس صحابی کی برکت سے یہ شہر جہاد کی علامت بن گیا۔ مجاہدین کے کتنے ہی لشکر یہاں سے روانہ ہوئے اور کتنی ہی فتح کی مہمات کا مرکز استنبول بنا۔ اس دور میں استنبول سے ہی روانہ ہونے والے لشکروں کی بدولت تین براعظم ہمارے گھوڑوں کی جولان گاہ بنے رہے۔ بعض اہل علم نے علم الحروف کی روشنی میں اس شہر کا نام آیت مبارکہ ﴿بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ﴾ سے اخذ کیا ہے۔ اسی لیے وہ اسے "بَلْدَة طَاہِرَة" (پاکیزہ شہر) بھی کہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ بات انہوں نے سب سے پہلے "صنعاء" کے حق میں کہی تھی، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور استنبول مقصود نہ ہوں۔ مادی اور روحانی اعتبار سے بہت سے حسین پہلوؤں کا حامل یہ شہر بہت سے صحابہ کرام اور اولیائے عظام کی قبروں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اس پر ہر دم برکتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کا یہ بابرکت مقام برقرار رہے گا اور اگر حالیہ ایام میں اسے یہ مقام حاصل نہ بھی ہو تو بھی ایک نہ ایک دن اسے یہ مقام حاصل ہو کر رہے گا اور اس کی فضائیں ایک بار پھر محمدی بادِ نسیم سے معطر ہو جائیں گی۔

نبی اکرم ﷺ نے استنبول کی دوسری فتح کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے، یعنی اپنی ذات، حقیقت اور روح سے فرار اختیار کرنے والا انسان ایک نہ ایک دن اپنی اصل حقیقت، شخصیت اور روح کی طرف لوٹ آئے گا اور اپنی قلبی اور روحانی سطح بلند کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو

مضبوط بنائے گا۔یہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خوشخبری ہے۔ ہم اس نئی فتح کے شدت سے منتظر ہیں۔رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے استنبول اور دجال کے درمیان ایک مخصوص تعلق کے پائے جانے کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے۔وقت آنے پر یہ تعلق بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آجائے گا۔کون جانتا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے استنبول کے حق میں نہ جانے کتنے اسرار و حکم کا مشاہدہ کیا ہو گا۔یہی وجہ تھی کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کئی صدیاں پیشتر اس کی فتح کی خوشخبری سنادی تھی۔

صدیقین کا مقام شہداء سے افضل کیوں ہے؟

صدیق تصدیق کرنے والے سچے انسان کو کہتے ہیں جبکہ شہید موجود اور گواہی دینے والے شخص کو کہتے ہیں۔ شاید شہید کو شہید اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور تقریباً دنیوی زندگی جیسی زندگی گزارتے ہیں۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے ہاں بلند ترین مقام ہیں۔

صدیوں سے مسلمان ان دو مرتبوں کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے مسابقت کرتے رہے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو خصوصاً صحابہ کرام کو شہادت کا مقام حاصل ہوا۔ خلفائے راشدین میں سے تین کو شہادت نصیب ہوئی، جبکہ چوتھے خلیفہ صدیقیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہوئے۔ ذیل میں ہم اس موضوع سے متعلق ایک امر اضافی پر گفتگو کرنے کے بعد ان دو مرتبوں کے خصائص بیان کریں گے۔ یہ خصائص دلوں میں شوق کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔

ہر انسان میں کسی نہ کسی حد تک سچائی پائی جاتی ہے اور اسی کے مطابق اسے صدیقیت کا مقام حاصل ہوتا ہے، نیز احادیث نبویہ کی رو سے موت کی بہت سی صورتیں انسان کو شہادت کا مقام دلانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں، تاہم ان دونوں مرتبوں کے بلند ترین درجات بھی ہیں، جو ان کی آخری حدود ہیں کہ جنہیں اس لیے عبور کرنا ممکن نہیں کہ ان کے بعد صرف نبوت کا درجہ رہ جاتا ہے۔ جس طرح درخت کے بیج سے لے کر پھل تک مختلف درجات ہوتے ہیں اسی طرح ایمان کے بھی مختلف درجات ہوتے ہیں۔ شہادت اور صدیقیت بلند ترین درجات ہیں اور ان کے بعض بہت اہم ابعاد ہیں۔

جو انسان بھی زبان سے اسلام کا اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرتا ہے، وہ قلبی تصدیق کی بدولت کسی نہ کسی حد تک صدیقیت کے دروازے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس در کی محض چوکھٹ سے گزرنا بھی انسان کی بہت بڑی سعادت ہے۔ اسی لیے بخاری و مسلم میں مروی ایک حدیث نبوی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بہت سے فرشتے ذکر کی مجلسوں میں پھرتے رہتے ہیں۔ ذکر سے صرف اللہ کی تسبیح ہی مراد نہیں، بلکہ اس سے ہر وہ مجلس مراد ہے، جس میں الوہیت،

ربوبیت اور قدرتِ الٰہیہ کی کاریگریوں پر غور و فکر کے معاملات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس قسم کی محفلوں میں ذکر، غور و فکر اور شکر کا پہلو بھی پایا جاتا ہے۔ لہٰذا ذکر کے موضوع کو وسیع تر تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک حدیث میں ہے:

اللہ تعالیٰ کے گھومنے پھرنے والے اصحابِ فضیلت فرشتے ذکر کی محفلوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جب وہ ذکر کی کسی مجلس کو پاتے ہیں تو ان کے پاس بیٹھ جاتے ہیں اور انہیں اپنے پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے اور آسمان دنیا کے درمیان کی ساری فضا کو بھر دیتے ہیں۔ جب وہ لوگ جدا ہو جاتے ہیں تو یہ فرشتے آسمان پر چڑھ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے احوال سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود ان سے پوچھتے ہیں: ''تم کہاں سے آئے ہو؟'' وہ جواب میں کہتے ہیں: ''ہم دنیا میں آپ کے ان بندوں کے پاس سے آرہے ہیں، جو آپ کی تسبیح، تکبیر، تہلیل اور تحمید میں مصروف تھے اور آپ سے مانگ رہے تھے۔'' اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں: ''وہ مجھ سے کیا مانگ رہے تھے؟'' وہ جواب میں کہتے ہیں: ''وہ آپ سے آپ کی جنت مانگ رہے تھے۔'' اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں: ''کیا انہوں نے میری جنت دیکھی ہے؟'' وہ کہتے ہیں: ''نہیں، اے پروردگار!'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اگر وہ میری جنت دیکھ لیتے تو ان کا کیا حال ہوتا!'' فرشتے یہ بھی کہتے ہیں: ''اور وہ آپ کی پناہ مانگ رہے تھے۔'' اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں: ''وہ کس چیز سے میری پناہ مانگ رہے تھے؟'' وہ کہتے ہیں: ''اے پروردگار! وہ آپ کی دوزخ سے آپ کی پناہ مانگ رہے تھے۔'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''کیا انہوں نے میری دوزخ دیکھی ہے؟'' وہ کہتے ہیں: ''نہیں'' اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اگر وہ میری دوزخ دیکھ لیتے تو ان کا کیا حال ہوتا!'' فرشتے مزید کہتے ہیں: ''اور وہ آپ سے گناہوں کی بخشش بھی طلب کر رہے تھے۔'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میں نے انہیں بخش دیا، جو چیز انہوں نے مانگی وہ انہیں عطا کر دی اور جس چیز سے انہوں نے پناہ مانگی اس چیز سے انہیں پناہ دے دی۔'' اس پر فرشتے کہتے ہیں: ''اے پروردگار! ان میں ایک گناہگار بندہ ایسا بھی تھا جو ان کے پاس سے گزر رہا تھا اور پھر ان میں بیٹھ گیا۔'' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میں نے اسے بھی بخش دیا۔ وہ ایسے لوگ ہیں، جن کا ہم نشین سعادت سے محروم نہیں رہتا۔''(118)

لہٰذا جو شخص کلمہ توحید کا اقرار کر کے اسلام میں داخل ہو جائے اس کا کچھ بھی مقام ہو وہ جماعت میں شمار ہوتا ہے اور یہ بھی صدیقیت کا ایک درجہ ہے، کیونکہ یہ اگرچہ ایک عام درجہ ہے، لیکن اس میں بھی ایک خاص قسم کا اخلاص اور تعلق پایا جاتا ہے، تاہم اس مقام کا ایک بلند ترین درجہ بھی ہے، جس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ فائز ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر اس وصف کے اطلاق کے بارے میں ایک واقعہ بھی مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مشرکین مکہ کو واقعہ معراج و اسراء کے بارے میں بتایا تو بعض مشرکین دوڑے دوڑے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور انہیں بتایا کہ محمد (ﷺ) ایسے ایسے کہہ رہے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: "تم ان کی طرف جھوٹی بات منسوب کر رہے ہو۔" انہوں نے کہا: "بخدا! وہ ایسی بات کہہ رہے ہیں۔" اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: "اگر آپ ﷺ نے واقعی یہ بات فرمائی ہے تو آپ ﷺ نے سچ فرمایا ہے۔" (119)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سب سے بڑے دعوے کی تصدیق کی اور اس طرح مرتبہ صدیقیت کے اس آخری مقام تک جا پہنچے کہ جس کے بعد صرف نبوت کا مرتبہ رہ جاتا ہے۔ ہر انسان اپنے ایمان کے لحاظ سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پیچھے اپنا مقام پاتا ہے، تاہم اس کے لیے علم الیقین کا عین الیقین اور پھر حق الیقین میں تبدیل ہونا ضروری ہے، جس کے حصول کا ایک ذریعہ حضورِ قلب سے تکوینی نشانیوں پر غور و فکر کرنا بھی ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کیا شہادت کے بھی مختلف درجات ہیں۔ اگر کوئی عمارت گر پڑے اور اس کے نیچے دب کر کچھ اہل ایمان جان بحق ہو جائیں تو وہ شہید سمجھے جائیں گے۔ اگرچہ ان کے ساتھ دنیا میں شہیدوں والا برتاؤ نہیں کیا جائے گا، لیکن وہ ان لوگوں میں شمار ہوں گے، جنہیں آخرت میں شفاعت کا حق حاصل ہو گا۔ اس میں وہ لوگ بھی داخل ہوں گے، جو وبا، طاعون، پیٹ کے درد یا اس جیسی دیگر بیماریوں کی وجہ سے فوت ہوئے ہوں گے۔

چنانچہ احادیث میں وارد ہے کہ ڈوب کر جان بحق ہونے والا شخص بھی اس قسم کے شہداء میں داخل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض حادثات سے انسان کو شہادت کا مخصوص مرتبہ

حاصل ہو جاتا ہے، تاہم شہادت کا ایک اعلیٰ ترین درجہ بھی ہے جو ان لوگوں کو ملتا ہے، جو دین کی سربلندی کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیتے ہیں۔ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دن رات دین کی سربلندی کی خاطر جدوجہد کرتا ہے اور اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے شہادت کی دعا کرتا ہے اسے شہادت کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے، گو اسے بستر پر ہی موت کیوں نہ آئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مقام فاروقیت کے ساتھ ساتھ شہادت کے اعلیٰ ترین مقام پر بھی فائز تھے۔ وہ عمر بھر شہادت کی تمنا کرتے اور اس سے محرومی کے اندیشے پر آنسو بہاتے رہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خطبات جمعہ دینے لگے اور انہوں نے اپنے کسی خطبے میں اس اندیشے کا اظہار بھی کیا۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہر خطبہ بڑا اہم ہوتا تھا، یہاں تک کہ اس امت کے علامہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یہ کہہ کر دعا فرمائی تھی: "اے اللہ! اسے دین کی سمجھ اور تاویل کا علم عطا فرما!" جب مکہ مکرمہ میں ہوتے اور انہیں خبر ملتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ جمعہ ارشاد فرمانے والے ہیں تو وہ آپؓ کا خطبہ سننے کے لیے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کا سفر فرماتے۔ آپ رضی اللہ عنہ کے اکثر خطبات کو بعض سامعین قلم بند کر لیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے پاس آپ رضی اللہ عنہ کے متعدد خطبات محفوظ ہیں، جن سے اہل علم اور فقہاء بہت سے امور کا استنباط کرتے رہتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبے میں نبوت کے موضوع پر گفتگو فرمائی اور رسول اللہ ﷺ کے عالی اوصاف کا تذکرہ کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی طرف رخ پھیر کر آپ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: "اے اس قبر والے! آپ کو مبارک ہو۔"

ہم بھی اپنے لیے شہادت کے طلبگار ہیں، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ اپنے وسیع کرم کی بنیاد پر عطا کرتے ہیں تو وہ قابلیت کی بجائے ضرورت کی بنیاد پر نوازتے ہیں۔ چونکہ ہم حاجت مند ہیں اور اپنی ضرورت کی وجہ سے اس کے درِ سخاوت کو کھٹکھٹاتے ہیں، اس لیے وہ ہمیں ہرگز خالی ہاتھ نہ لوٹائیں گے۔ وہ اپنے در پر صدا لگانے والے کسی بھی سائل کو بے مراد نہیں لوٹاتے۔ چونکہ حضرت عمر رضی

اللہ عنہ نے دل سے شہادت مانگی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت کا اعلیٰ ترین مقام عطا فرمایا۔ انہیں ایک ایرانی مجوسی کے ہاتھوں شہادت نصیب ہوئی۔ یہ صبح کا وقت تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ محراب میں کھڑے تھے۔ جب آپ رضی اللہ عنہ سجدے کے لیے جھکے تو اس خائن نے خنجر آپ رضی اللہ عنہ کے سینے میں گھونپ دیا۔ ذیل میں ہم پورا واقعہ بیان کرتے ہیں۔

سب سے پہلے تو شہادت کا شوق اور خواہش کامل درجے کی تھی، دوسرے نماز بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے شخص کی نماز تھی کہ اکثر اوقات آپ رضی اللہ عنہ پر نماز کے دوران اس قدر گریہ طاری ہو جاتا تھا کہ مقتدیوں کو آپ کی قراءت کی بھی سمجھ نہ آتی یا آپ کی پنڈلیاں آپ کا بوجھ اٹھانے سے عاجز آ جاتیں اور آپ نماز میں ہی زمین پر آ گرتے۔ ذرا ایسی نماز کے کسی سجدے کا تصور کیجیے جس میں انسان اپنے پروردگار سے قریب ترین ہوتا ہے۔ ایسے لحات میں کہ جب انسان کو اعلیٰ ترین مقام تک پہنچانے کے لیے تمام شرائط پائی جاتی تھیں، آپ رضی اللہ عنہ کو شہادت کے بلند ترین مقام تک پہنچانے کے لیے ایک وار بھی کافی تھا۔ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَاسۡجُدۡ وَاقۡتَرِبۡ﴾ (العلق:١٩) ''اور سجدہ کرنا اور اللہ کا قرب حاصل کرتے رہنا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حالت سجدہ میں اس قدر قرب خداوندی حاصل تھا کہ جس قدر ایک غیر نبی انسان کے لیے ممکن ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشاد: ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن خطاب ہوتا۔'' (120) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

شہادت کے اس بلند ترین مرتبے کے نیچے اور بھی بہت سے درجات ہیں۔ جو لوگ بدر، احد، موتہ، جناق قلعہ، طرابلس یا افغانستان میں روس کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوئے یا آج فلسطین میں یہودیوں کے ظلم و ستم کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو رہے ہیں ان میں سے ہر ایک کو شہادت کے ان مراتب میں سے کوئی نہ کوئی مرتبہ ضرور حاصل ہوتا ہے۔

خلفائے راشدین میں سے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما بھی شہید ہوئے۔ ان میں سے ایک قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہوئے شہید ہوا اور دوسرے کو مسجد جاتے ہوئے شہید کیا گیا۔ شہداء کی آخری حالت کی بنا پر ان میں فرقِ مراتب قائم کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے حضرت علی رضی اللہ

عنہ اپنی مخصوص حالت کی بنا پر اس قدر عظیم ہستی تھے کہ ان پر کسی اور کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ آلِ بیت کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے تو ان کی فضیلت سب سے بڑھی ہوئی ہے، لیکن اگر عمومی فضائل کے اعتبار سے دیکھا جائے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا پہلا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دوسرا نمبر ہے۔

اگرچہ میرے پاس اس بات پر کوئی قابل وثوق دلیل نہیں ہے کہ شہید دوسرے شہداء کے لیے اور صدیق دوسرے صدیقین کے لیے شفاعت کرے گا، لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ایسا ہو گا اور پھر یہ لوگ اپنے اقرباء اور جاننے والوں کی شفاعت کریں گے۔ باقی جہاں تک ان دونوں مرتبوں پر فائز لوگوں کا تعلق ہے تو امید ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے بارے میں براہِ راست شفاعت کریں گے۔

ان مراتب کے اسراروں سے پردہ اٹھانا میرے جیسے شخص کی طاقت سے باہر ہے۔ اس مقام کے اعلیٰ ترین مرتبے تک پہنچنے والی ان ہستیوں کے حالات کی وضاحت کرنا میرے جیسے شخص کے لیے ممکن ہے اور نہ ہی دوسروں کے لیے ان کی کیفیت کو سمجھنا ممکن ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صدیقیت کا ہر مرتبہ شہادت کے ہر مرتبے سے افضل ہے، بلکہ ان کی فضیلت کی کمی بیشی کا تعلق صرف ان کے بلند ترین رتبے کے ساتھ ہے۔ پہلے مقام کے بلند ترین رتبے پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور دوسرے کے بلند ترین رتبے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فائز ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے: ﴿وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (التوبۃ:۴۱) "اور اللہ کے رستے میں مال اور جان سے جہاد کرو۔" لیکن ہم حسبِ استطاعت خرچ نہیں کرپاتے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

قرآنِ کریم کی متعدد آیات راہِ خدا میں جان و مال خرچ کرنے کی ترغیب دیتی ہیں، نیز قرآنِ کریم میں ایسے متعدد واضح یا غیر واضح امور ہیں، جن کا مقصد نہ صرف ہماری انفرادی اور عائلی زندگی کو اسلام کے دائرے میں لانا ہے، بلکہ وہ مسلم معاشرے میں اسلامی طرزِ حیات اور پورے ملک میں اسلامی شعور اور روح کی سیادت کی ضمانت بھی فراہم کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک اس شعور اور جذبے کی سیادت قائم نہ ہوگی اس وقت تک انسان کے لیے صحیح طور پر کامل مسلمان کی حیثیت سے زندگی گزارنا ممکن نہیں ہو سکتا۔

مسلم معاشرے کو ماضی میں بالعموم اور دورِ حاضر میں بالخصوص ایسے صدمے پہنچے ہیں، جن کے نتیجے میں اس کے اداروں کی بنیادیں متزلزل ہو گئی ہیں۔ مسلمان ماہرین عمرانیات کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلم معاشرے کے قیام کے بغیر صحیح اسلامی زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ اگر بازار کے معاملات اسلامی اصولوں کے مطابق طے نہ ہوتے ہوں اور اگر انسان کو انسانی اقدار کی تعلیم دینے والے تربیتی ادارے اسلامی جذبے اور شعور کے تحت آپ کا ہاتھ نہ تھامیں گے، آپ کی مدد کو دوڑ کر نہ آئیں گے اور آپ کے سامنے روشنی کرکے آپ کی راہنمائی نہ کریں گے تو یقیناً چند قدم چل کر آپ کے قدم ڈگمگا جائیں گے، آپ راستے سے بھٹک جائیں گے یا گر پڑیں گے اور آپ کو اسلام کے نام پر بہت سی باتوں سے دستبردار ہونا پڑے گا۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ کبھی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے مکمل اسلامی زندگی نہیں گزار سکیں گے، کیونکہ بعض معاملات میں معاشرہ آپ کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دے گا اور اس سے بھی بدتر صورت حال اس وقت پیش آئے گی جب غلط

تربیت درندوں کی طرح آپ کا راستہ روک دے گی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بحیثیت مسلمان زندگی گزارنے کا واحد راستہ دینی وازع (مانع) کو سنجیدگی کے ساتھ نافذ العمل کرنا ہے، لیکن وازع دینی کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک دلوں میں بیداری پیدا نہ کی جائے، لوگوں تک دین نہ پہنچایا جائے اور انہیں یہ بات نہ سمجھائی جائے کہ انسان اس دنیا میں ایک مسافر اور مہمان کی طرح ہے، یہ دنیا انسان کے راستے کی منزلوں میں سے صرف ایک منزل ہے اور جیسے وہ اس دنیا میں آیا ہے، اسی طرح ایک دن وہ اسے چھوڑ کر دارالقرار کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کے قیام کے لیے انسان کو تیار کرنے کے لیے اس حقیقت کو اسے یاد دلاتے رہنا اور اس کے دل میں دینی اور روحانی وزاع کو ترقی دیتے رہنا ضروری ہے۔

پیاسے دلوں کو اس موضوع پر زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں۔ آج اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے مسلمانوں میں ایسے ایسے قربانی پیش کرنے والے حضرات موجود ہیں، جو صحابہ کرام کے پیچھے جگہ دیئے جانے کے حقدار ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے اس فضل واحسان کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی کبریائی کے سامنے خشوع وخضوع سے جھک جاتے ہیں، کیونکہ خشک سالی کے اس دور میں کہ جب زمین پر کوئی چیز اگتی ہے اور نہ ہی آسمان سے بارش برستی ہے اللہ تعالیٰ نے ایمان اور دعوت کے عشق سے لبریز ان دلوں کا نئے سرے سے اسلام اور قرآن کے ساتھ رشتہ جوڑ دیا ہے، ایک پوری قوم کو اسلام کی طرف لوٹا دیا ہے اور اس لق ودق صحراء کو پھلدار باغوں اور لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی عظمت وجلال کے شایانِ شان تعریف سزاوار ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ پرجوش دلوں میں پیدا ہونے والے اس سوال کے پس پردہ ایک اور سوال کارفرما ہے۔ وہ یہ کہ لوگوں کو جان ومال کے ساتھ راہِ خدا میں جہاد کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے ہم رائے عامہ کو کیسے ہموار اور لوگوں کے جذبات کو کیسے ابھار سکتے ہیں؟ تاکہ ہم اس دور کی سرنگ کو جلدی سے عبور کر لیں اور قبل اس کے کہ اندرونی اور بیرونی خائن آنکھیں جو مسلمانوں کی ہر بات پر کڑی نظر رکھے ہوتی ہیں اور ان کے لیے ہر مفید اور مثبت چیز کو روکنے کی کوشش

کرتی ہیں، ہمیں دیکھ پائیں ہم دشت و صحراء، بلند بالا پہاڑوں اور خون اور آنسوؤں سے لبریز وادیوں کو عبور کر لیں۔ ان خائن آنکھوں کے بارے میں قرآنِ کریم کہتا ہے: ﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ﴾ (المؤمن:۱۹) "وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے۔" بصورت دیگر ساری دنیا متعدد موانع اور رکاوٹوں کے درمیان چلنے والے مسلمانوں کے راستے میں آکھڑی ہو گی اور مسلمان ایک سال کی مسافت دس سالوں میں طے کر پائیں گے۔

نیز اگر مسلمانوں نے کفر کو چوکنا اور ہوشیار کر دیا تو وہ کبھی بھی اپنے ہدف تک نہ پہنچ سکیں گے، اس لیے مسلمانوں کو بڑی تیزی سے اس معاملے کو سدھارنا چاہیے، مثلاً اگر بالفرض مسلمان موجودہ وسائل کے ذریعے اپنی نسل کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک سال میں ایک اسکول کھول سکتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اوپر تنگی کر کے ایک سال میں دو اسکول کھولیں۔ آئندہ نسلوں کو پروان چڑھانے اور اپنے مستقبل کو تابناک بنانے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر ہے۔ اگر ہم نے موجودہ نسل کے بارے میں درست طرزِ عمل اختیار نہ کیا تو ہم مستقبل میں کوئی نمایاں کام سرانجام نہ دے سکیں گے، گو ہمارے پاس موجودہ طاقت کیوں نہ موجود رہے، کیونکہ مستقبل میں ہمیں پیش آنے والے موانع زیادہ بڑے اور شدید ہوں گے، جن پر ہم ہرگز قابو نہ پا سکیں گے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام نے صرف تیس سال کے عرصے میں وسیع علاقے کو فتح کر کے اسے رسول اللہ ﷺ کی قیادت اور طرز کے زیرِ نگیں کر دیا۔ یہ علاقے کیفیت و کمیت کے لحاظ سے امویوں، عباسیوں، سلجوقیوں اور عثمانیوں کے ادوارِ حکومت میں فتح ہونے والے مجموعی رقبے کے تقریباً برابر تھے۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو دنیا کے نقشے پر نظر ڈال لیجیے۔ اتنے وسیع اور دور افتادہ علاقے صرف خلفائے راشدہ کے دور میں فتح ہو گئے۔ یہ ایسی بات ہے، جس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی، بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تمام علاقے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فتح ہو چکے تھے۔

یہ تو اس مسئلے کا ایک پہلو ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ فتوحات ظلم و استبداد کے ذریعے نہیں ہوئیں اور دلوں کو مجبور نہیں کیا گیا، بلکہ اسلام کے حسن و جمال اور اس کے عقل و

فطرت سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے دل خود بخود اس کی طرف کھچے چلے آئے، یہی وجہ ہے کہ جن جن علاقوں میں صحابہ کرام گئے وہاں وہاں اسلام بڑی تیزی سے پھیلا اور اس کے بعد وہاں علم و عرفان کا دور دورہ ہوا اور ایک ایسا کارنامہ وجود میں آیا جس پر آج بھی دنیا حیران ہے۔

کوئی پوچھ سکتا ہے کہ اس دور کی عظمت کو یاد کرنے کا کیا فائدہ؟ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ وہ دور برتری اور فضیلت کی نشانی ہے، جس کا اعتراف دشمن بھی کرتے ہیں۔ اسلام کی عمدہ نمائندگی اور اقوام عالم کو تہذیب و ثقافت سے روشناس کرانا انسانیت کو اسلام کے قریب لانے کا اہم ترین سبب تھا۔ اگر ان ممالک میں اسلام کے ساتھ کوئی وابستگی پائی جاتی ہے تو اس کا سبب وہ تخم ہے، جسے ان مبارک اور نورانی ہاتھوں نے بویا تھا۔

میرے نزدیک یہ بہت اہم بات ہے۔ انسان صحابہ کرام کے اخلاص وللّٰہیت کے مقام پر خوشگوار حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس دور میں ان سے مال و جان کی قربانی درکار تھی انہوں نے اس دور میں عمدہ نظم و ضبط کا مظاہرہ کیا، چنانچہ جب ان سے مکہ معظمہ چھوڑنے کے لیے کہا گیا تو انہوں نے اسے فوراً چھوڑ دیا اور اپنے روتے ہوئے بچوں اور مال و مویشیوں کی طرف پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ ابراہیمی جذبے اور فہم سے بہرہ مند تھے، اسی لیے انہوں نے اپنی بیویوں تک کو چھوڑ دیا۔ اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا جاتا کہ آپ نے پیچھے پلٹے بغیر کیسے ہجرت کی؟ تو وہ جواب میں فرماتے: "میں ایک انسان ہوں۔ اس لیے ہو سکتا تھا کہ عائشہ کی ابا جان! ابا جان! کی پکار سے میرا دل پسیج جاتا، "جس کے نتیجے میں مجھ سے کہا جاتا: "اے ابو بکر! ایک دل میں دو محبتیں نہیں سما سکتیں۔ "اس کے جواب میں میں کہتا: "تو پھر ان میں سے ایک لے لیجیے۔"

اس جذبے اور ولولے سے انہوں نے اپنے اوقات کو ترتیب دیا اور جب قربانی پیش کرنے کا وقت آیا تو انہوں نے اپنی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا اور کسی بھی چیز کی قربانی پیش کرنے میں انہیں تردد نہ ہوا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی قربانی کی بہ نسبت کئی گنا زیادہ مادی اور روحانی نعمتوں سے نوازا۔ مکہ سے ہجرت کرنے والوں نے اپنی مال و دولت مکہ میں چھوڑ دی تھی، لیکن

مدینہ منورہ میں اللہ تعالیٰ نے چند ہی سالوں میں انہیں ان کی متروکہ املاک سے کئی گنا زیادہ مال و دولت عطا فرمادی، مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنا سب کچھ حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کی بیٹی اور اپنی اہلیہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو بھی مکہ میں چھوڑ آئے تھے، لیکن مدینہ منورہ میں انہیں اس قدر مالی فراوانی حاصل ہوئی کہ انہوں نے تبوک کی طرف روانہ ہونے والے "جیش العسرۃ" کے لیے تین سو اونٹ مع سازوسامان کے فراہم کیے۔ بعض اوقات یہ بات سمجھنا مشکل ہو جاتی ہے کہ اتنی مختصر سی مدت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس قدر مالدار کیسے ہو گئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ارشادِ ربانی: ﴿مَن جَاء بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ (الأنعام: ١٦٠)"جو کوئی اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی۔"کا مظہر تھے، بلکہ یہ مقدار بھی کم از کم حد ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سو گنا بلکہ ہزار گنا بھی عطا فرماتے ہیں۔ صحابہ کرام نے وقت آنے پر سب کچھ لٹا دیا، لیکن پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس سے کئی گنا زیادہ صلہ وصول کر لیا۔ آج بھی بعض ایسے اہل ایمان موجود ہیں، جو کہتے ہیں: "راہِ خدا میں خرچ کرو۔ اگر تمہیں تمہارے خرچ کردہ مال سے دس گنا زیادہ مال نہ ملا تو میں تمہیں دوں گا۔"

اگر حضرت ابو بکر یا حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے دل میں دنیا کی طرف ذرا بھی رغبت ہوتی تو وہ بعد کے ادوار میں دنیا کے مالدار ترین افراد بن سکتے تھے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی رسول اللہ ﷺ کے راستے سے انحراف کو گوارا نہ کیا۔ انہیں ایک ہاتھ سے جو کچھ ملتا اسے دوسرے ہاتھ سے صدقہ فرما دیتے اور اس طرح اپنی ملکیت میں آنے والے مال کو خرچ فرما دیتے۔ ورنہ صحابہ کرام میں حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ایسے حضرات بھی تھے، جو فرمایا کرتے تھے: "ہم اپنی مال و دولت کو شمار نہیں کر سکتے۔" مثلاً حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خانۂ رسول ﷺ میں پروان چڑھے اور انہیں رسول اللہ ﷺ نے دعا بھی دی تھی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: "یارسول اللہ! اپنے خادم انس کے لیے دعا فرمایئے۔" آپ ﷺ نے دعا

فرمائی: "اے اللہ! اس کی مال و اولاد کو زیادہ کر اور اسے جو کچھ عطا فرما اس میں برکت عطا فرما۔"(121)
حضرت انس رضی اللہ عنہ دس سال کی عمر میں نبی اکرم ﷺ کے خادم بنے اور جب رسول اللہ ﷺ نے اس فانی دنیا سے پردہ فرمایا اس وقت ان کی عمر بیس برس تھی۔ دورِ خلافت میں وہ اس قدر مالدار ہو گئے تھے کہ ایک مرتبہ فرمانے لگے: "مجھے اپنی بکریوں اور مال و دولت کی کثرت کی وجہ سے ان کی تعداد معلوم نہیں ہے۔" ان پر اللہ تعالیٰ کا اس قدر فضل و احسان تھا۔

صحابہ کرام نے قربانی کے وقت اپنا سب کچھ لٹا دیا، لیکن جب بدلے کا وقت آیا تو دنیوی و اخروی ثمرات سے بہرہ مند ہوئے۔ جس طرح ذخیرہ کئے ہوئے اناج کو موسم بہار میں زمین میں بو دیا جاتا ہے اور جب فصل پکنے کا وقت آتا ہے تو زمین اس سے کئی گنا زیادہ پیداوار دیتی ہے، اسی طرح انسان کو چاہیے کہ اپنے وجود کو زمین میں بوئے جانے والے تخم میں تبدیل کر دے اور پھر دیکھے کہ ہر بیج سے سات یا دس خوشے نکلیں گے اور ہر خوشے میں سو بیج ہوں گے، جیسا کہ قرآن کریم میں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قدر فضل و عطا کو دیکھ کر سب ششدر رہ جائیں گے اور کھیتی بونے والے پر بھی حیرت طاری ہو جائے گی، لیکن بعض دوسرے لوگ غیظ و غضب میں پیچ و تاب کھانے لگیں گے اور اس طرح آیت مبارکہ ﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ (الفتح:۲۹) "تاکہ کافروں کا جی جلائے۔" کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔

لہٰذا تمہیں یہ کہنا چاہیے: "یہ موسم بہار ہے۔" اور خرچ کرنے میں کمی نہیں کرنی چاہیے۔ یہ ہرگز نہ کہو: "جتنا مال میں نے خرچ کیا ہے کیا کافی نہیں ہے؟" مگر یہ کہ کوئی تم سے یہ کہے: "تمہیں خرچ کرنے میں اس قدر مبالغہ نہیں کرنا چاہیے۔" یعنی آج ہی سب کچھ خرچ نہ کر دو، کیونکہ مستقبل میں بھی خرچ کرنے کی ضرورت پیش آنے والی ہے۔ اگر ہم مستقبل میں خرچ کرنے کو ملحوظ نہ رکھتے تو ہم آپ سے کہتے: "آج جو کچھ خرچ کر سکتے ہو خرچ کر دو۔" اور جب ہم سے پوچھا جاتا: "اچھا! تو مستقبل میں ہم کیا کریں گے؟" تو ہم اس کے جواب میں کہتے: "مستقبل کا اللہ مالک ہے۔" ہمیں خلیلی و ابراہیمی جذبے سے سرشار رہنا چاہیے، یعنی جس طرح

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ دیا اور پیچھے پلٹ کر بھی نہ دیکھا ہمیں بھی ایسا رویہ اپنانا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابو بکر کو بناتا، لیکن وہ میرے بھائی اور صحابی ہیں۔"(121)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ بلند مقام حاصل تھا۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل الرحمن تھے، اسی طرح حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے خلیل تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: "اے ابو بکر! تم نے اپنے اہل و عیال کے واسطے کیا چھوڑا ہے؟" تو انہوں نے جواب میں عرض کی: "میں نے ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑا ہے۔" یہ جواب صدیقیت کے مقام پر فائز شخص کو ہی سزاوار ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ جواب وقت کی بہتر قدر پیمائی سے عبارت ہے۔ آیت مبارکہ ﴿وَجَاہِدُواْ بِأَمْوَالِکُمْ وَأَنفُسِکُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ (التوبۃ:۴۱) "اور اللہ کے رستے میں مال اور جان سے جہاد کرو۔" سے وقت کی ایسی ہی بہتر قدر پیمائی کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص دورِ حاضر کے اہل ایمان کی بہادری اور سخاوت کو ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل فردوسی کے شاہنامے کی طرز پر رقم کرنا چاہے گا تو اسے ان اہل ایمان کی خودداری اور سخاوت کا حق ادا کرنے کے لیے ساٹھ ملین اشعار لکھنے کی ضرورت پڑے گی۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ان اہل ایمان کی جود و سخا میں چند در چند اضافہ فرمائے۔ آج ہم اس جدوجہد کے موسم بہار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور ہمارے ارد گرد پھول کھلے ہوئے ہیں۔ ہمیں اسی موسم کا انتظار تھا، لہٰذا ہر جگہ کے نوجوانوں کو اپنے کندھوں پر عائد ذمہ داریوں کو ادا کرنا چاہیے، کیونکہ وہ جب بھی ان افکار کے گرد گھومیں گے جن کے بیج اس عظیم مؤمن ہستی(122) نے بوئے تھے تو اس کی خوشی میں اضافہ ہو گا اور شاید وہ ان سے کہے: "یہ نوجوان میرے لیے موسم بہار کی سوغات لے کر آئے ہیں اور میں ان کا اس گفتگو سے استقبال کروں گا جس کا میں نے ان سے وعدہ کیا تھا، چنانچہ میں انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔"

یہ تو موجودہ صورت حال ہے۔اس قسم کی قربانی، سخاوت اور خودداری کو اللہ رب العالمین، رسول اللہ ﷺ اور ہمارے لیے راستے کو روشن کرنے والے علمائے کرام کے ہاں جو قبولیت اور پذیرائی ملے گی اور اس سے جو خوشی قدسیوں کو ہو گی میں اس کی منظر کشی کرنے سے عاجز ہوں اور اسے آپ حضرات کی قوت تخیل پر چھوڑے دیتا ہوں۔

اس موضوع کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم اپنی جان ومال کے ذریعے کیسے جدوجہد کر سکتے ہیں۔اس بات کا تعلق سب سے پہلے ایمان اور اعتماد کے ساتھ ہے۔کیونکہ اگر کسان کو یقین ہو کہ اس کا ڈالا ہوا بیج زمین میں خراب نہ ہو گا تو وہ اپنی ملکیت میں موجود سارے تخم کو زمین پر کاشت کر کے اس کے پکنے کا انتظار کرنے لگے گا۔اگر باغبانوں کو یقین ہو کہ ان کی لگائی ہو پنیریاں عنقریب بڑی ہو کر تنا آور درخت بن جائیں گی تو وہ اپنے ہاں دستیاب تمام پنیریوں کو کاشت کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کریں گے۔جن لوگوں کے پاس (Inqubators) ہیں وہ انڈوں کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے انہیں (Inqubators) میں یا مرغیوں کے نیچے رکھ دیں گے، لیکن اگر ان کو اس قدر وثوق حاصل نہ ہو، بلکہ انہیں بعض بیجوں کے مر جانے اور بعض انڈوں کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو یقینی بات ہے کہ وہ اپنے پاس موجود سارے بیجوں کو نہیں بوئیں گے، بلکہ ان کی ایک خاص مقدر اپنے پاس رکھیں گے، اپنی اولاد کے لیے سرمایہ ذخیرہ کر کے رکھیں گے اور کبھی بھی جود وسخا کا مظاہرہ نہ کر سکیں گے۔

اس تفصیل سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ راہ خدا میں قربانی ہمارے اللہ تعالیٰ پر بھروسے اور ایمان پر موقوف ہے۔اگر ہمیں اللہ تعالیٰ کے وجود کا ایسا ہی یقین ہوتا جیسا ہمیں اپنے وجود کا یقین ہے اور اگر ہمیں یقین ہوتا کہ ہم اللہ کے راستے میں کوئی بھی خدمت پیش کریں گے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس سے کئی گنا زیادہ لوٹائیں گے اور ارشادِ نبوی: "دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔" کے مصداق کے مطابق آخرت میں اس کے ثمرات ظاہر ہوں گے، نیز اگر ہمیں دنیا کے آخرت کی کھیتی اور باغ ہونے کا یقین ہوتا تو ہم قربانی دینے اور راہ خدا میں خرچ کرنے میں ذرا کوتاہی نہ کرتے۔

لہٰذا ہم راہ خدا میں جو بھی خدمات یا قربانی پیش کرتے ہیں یا جود و سخا کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس کا ہمارے ایمان کی سطح اور مضبوطی کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اب تک مسلمانوں نے جود و سخا کا جو مظاہرہ کیا ہے اس سے ہمارے اس یقین میں اضافہ ہوا ہے کہ وہ اس سے بھی بڑھ کر کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ صادق و امین ﷺ نے مختلف بشارتیں سنائی ہیں۔ ہم سب کو ان بشارتوں کا مصداق بننے کے لیے سعی و کاوش کرنی چاہیے، تاکہ آسمان کے فرشتے بھی پکار اٹھیں: "یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ کی بشارتوں کے مصداق یہی لوگ ہیں؟" بلاشبہ جس قدر خادمینِ اسلام راہ خدا میں خرچ کریں گے اور جس قدر ان کی خودداری اور قربانیوں میں اضافہ ہو گا اسی قدر ہم اپنے مطلوبہ ہدف کی طرف زیادہ تیز رفتاری سے اور زیادہ بہتر انداز میں بڑھیں گے۔

ہم اللہ تعالیٰ کے سپاہی کیسے بن سکتے ہیں؟ کیا آپ سپاہ گری کے تناظر میں اس کی وضاحت کر سکتے ہیں؟

سپاہ گری مؤمن کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ ہم اللہ کے سپاہی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری یہ خدمت قبول فرمائیں گے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کے حقیقی سپاہی بن جائیں تو یہ ہمارے لیے بڑی سعادت کی بات ہو گی۔ ہم اپنی جبین اس کی چوکھٹ پر رکھ کر ہمیشہ انتظار کرتے رہیں گے۔ ہم اپنی غمزدہ مگر پرامید نگاہیں جھکائے اس کے دروازے کو مسلسل کھٹکھٹاتے رہیں گے اور جواب کے منتظر رہیں گے، لیکن اگر ادھر سے کوئی جواب نہ آیا تو ہم "یاصبور" کا ورد کرتے ہوئے بغیر کسی اکتاہٹ کے انتظار کرتے رہیں گے اور اگر اس انتظار کے دوران دروازہ تھوڑا سا کھلتا ہوا محسوس ہوا اور پھر بند ہو گیا تو ہم سمجھیں گے کہ اپنی اہلیت ثابت نہ کر سکنے کی وجہ سے ہماری دعا کو ابھی تک شرف قبولیت حاصل نہ ہو سکا اور یہ کہہ کر اخلاص کے جذبے سے سرشار ہو کر تکلیف دہ انتظار جاری رکھیں گے اور یوں سمجھیں گے گویا کچھ ہوا ہی نہیں، لیکن اس اخلاص کے نتیجے میں ہمیں امید ہے کہ ایک نہ ایک دن غیر متوقع طور پر دروازہ کھل جائے گا اور ہم سے کہا جائے گا: "تم نے اپنی اہلیت ثابت کر دی ہے، لہٰذا اب آجاؤ۔" اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: ﴿أَوۡفُواْ بِعَهۡدِيٓ أُوفِ بِعَهۡدِكُمۡ﴾ (البقرۃ:۴۰) "اس اقرار کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا میں اس اقرار کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا۔" یعنی میں کبھی بھی اپنے عہد کو نہیں توڑوں گا۔ اگر کبھی عہد شکنی ہوئی تو وہ تمہاری ہی طرف سے ہو گی۔ اس لیے اس بارے میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو اور عہد شکنی مت کرو تاکہ کسی نہ کسی دن تمہارے لیے درِ خداوندی کھل جائے۔

لیکن آیئے اپنے آپ سے سوال کریں: "کیا ہم نے اخلاص اور وفاشعاری کے ساتھ اس عہد کی پاسداری کی ہے؟ کیا ہم اکتاہٹ اور تھکاوٹ کا اظہار کیے بغیر اس کے در کو مضبوطی سے تھامے ہوئے مسلسل انتظار کرتے رہے ہیں؟ کیا ایسا تو نہیں کہ ایک مرتبہ دروازہ بند ہوتے دیکھ

کر مایوسی نے ہمیں گھیر لیا ہو؟ یا کائنات میں پیش آنے والے واقعات کے ہماری خواہشات اور توقعات کے خلاف ہونے کی وجہ سے ہم اخلاص سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوں؟

کسی شاعر نے کہا ہے:

ماکل مایتمنی المرء یدرکه تجری الریاح بمالا تشتهی السفن

(انسان کی ہر تمنّا پوری ہوتی ہے اور نہ ہی ہوائیں ملاحوں کی خواہش کے مطابق چلتی ہیں۔)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کشتیوں کا ناخدا اور اس سمندر کا حکمران کوئی ہے۔ یہاں کوئی بھی کام ہماری مشیت کے مطابق نہیں ہوتا، بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے کے تابع ہے: "ماشاء الله کان ومالم یشأ لم یکن" "جو اللہ نے چاہا ہو گیا اور جو اس نے نہیں چاہا نہیں ہوا۔" یہ حق تبارک وتعالیٰ کے سامنے تسلیم مطلق کے بارے میں ہمارے لیے رسول اللہ ﷺ کا ایک نورانی ارشاد مبارک ہے۔ یہ ان اذکار میں سے ہے جن کا ہم صبح وشام ورد کرتے ہیں۔

اگر ہم اللہ تعالیٰ کے سپاہی بننا چاہتے ہیں تو ہمیں صوفیاء کی تعبیر کے مطابق "فنا فی اللہ" ہونا پڑے گا اور ہمیں اس بات کا یقین کرنا پڑے گا کہ ہر خیر اور بھلائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور دینی خدمت میں پیش آنے والی ہر کوتاہی اور لغزش کا باعث ہم خود ہوتے ہیں، کیونکہ ارشاد باری ہے: ﴿مَّا أَصَابكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللهِ وَمَا أَصَابكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ﴾(النسا:۷۹) "(اے آدم زاد!) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی شامت اعمال کی وجہ سے ہے۔" ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ﴾ (الشوری:۳۰) "اور جو مصیبت تم پر واقع ہوتی ہے سو تمہارے اپنے کرتوتوں سے اور وہ بہت سے گناہ تو معاف کر دیتا ہے۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ ہمارے کیے کا نتیجہ اور ہمارے گناہوں اور شہوات سے مغلوبیت کا وبال ہوتا ہے، تاہم چونکہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہیں

اس لیے وہ ہمارے ہر گناہ پر ہمارا مواخذہ نہیں فرماتے، بلکہ اکثر گناہوں سے در گزر فرماتے ہیں، لہٰذا ہمیں ہر لمحہ حمد و شکر کے جذبات سے سرشار رہنا چاہیے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ وہ ہمیں بخش دے اور ہماری سیئات سے در گزر فرمائے۔

ہمیں اللہ تعالیٰ کے حقیقی سپاہی بننا چاہیے اور جب ہم اللہ تعالیٰ کے حقیقی سپاہی بنیں گے تو ہمیں اطمینان اور راحت کا احساس بھی ہو گا۔ بعض لوگ ایسے ہیں جن کے دل کی واقعی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ ہمیں صوفی شاعر یونس امرہ جیسا بننا چاہیے، جنہوں نے مال، اولاد اور عیال سب کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا: "میں صرف آپ کا طالب ہوں۔۔۔ صرف آپ کا۔۔۔ آپ کے سوا کسی کا نہیں۔" ان کے دل میں جنت کی طلب تھی اور نہ حوروں کی چاہت، بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے طلبگار تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اہل ایمان موجود ہیں، جنہوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے اللہ تعالیٰ کے سپاہیوں کے دل ان سے بھی بلند تر جذبات سے سرشار ہوں گے اور وہ اپنی سپاہ گری کو پورے شوق اور جذبے کے ساتھ برقرار رکھیں گے۔

کیا نماز سے استفادہ عبادت کی مکمل طور پر صحیح ادائیگی پر موقوف ہے؟ دوسرے لفظوں میں اگر نماز کو اس کے ارکان کے مطابق ادا نہ کیا جائے تو کیا پھر بھی روحانی مراتب حاصل ہو سکتے ہیں؟

میں سوال میں وارد لفظ "فیض" کی جگہ "سعادت" یا "لذت" کے الفاظ استعمال کرنے کو ترجیح دوں گا، کیونکہ اس سیاق میں فیض کا مفہوم سمجھنا ممکن نہیں۔ دنیوی زندگی میں فیض سے مراد وہ واردات اور الطاف ربانیہ ہوتے ہیں، جن کا انسان کی قلبی اور روحانی کیفیات کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور آخرت میں فیض سے دخول جنت، رضائے الٰہی کے حصول اور دیدار خداوندی کے استحقاق جیسے مراتب اور شرف مراد ہوتا ہے، اس لیے "فیض" کے لفظ کی محتویات کا ادراک اور اس کے مفہوم کا احاطہ ہمارے لیے ممکن نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ فیوضِ الٰہیہ نے ہمیں گھیرا ہوا ہو، لیکن ہمیں اس کا احساس تک نہ ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمیں اس بات کا شعور نہ ہونا ہم پر اللہ تعالیٰ کا لطف و احسان ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا بہترین احسان وہی ہوتا ہے، جو غیر محسوس طور پر ہو۔

اگر ہم اس پہلو سے دیکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ رضائے الٰہی کے لیے سرانجام دی جانے والی تمام عبادات میں کسی نہ کسی درجے میں فیض اور برکت ضرور ہوتی ہے، کیونکہ یہ بات ناقابل تصور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے در کی طرف متوجہ ہونے والا کوئی شخص بے مراد لوٹا دیا جائے، تاہم انسان کو چاہیے کہ اپنی عبادات کو ان سے حاصل ہونے والے فیض اور لذت کے ساتھ مشروط نہ کرے، کیونکہ بعض اوقات آپ روحانی اعتبار سے حالت انقباض میں نماز ادا کرتے ہیں اور ظاہری طور پر اس نماز کے بارے میں اچھا گمان نہیں رکھتے، لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کی سب سے بہتر اور سب سے زیادہ مقبول نماز ہو، کیونکہ آپ ایسی حالت میں نماز کے لیے کھڑے ہوئے، جب آپ ہر قسم کے مادی اور روحانی ذوق سے محروم تھے، لیکن اس کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت کو

بھولے اور نہ ہی آپ نے اس میں کوتاہی کی۔ دوسرے لفظوں میں روحانی فیض سے محرومی کے باوجود آپ کے اخلاص میں کسی قسم کا خلل پیدا نہیں ہوا۔ ایسی ہی عبادت خلوص سے بھرپور اور خالص ہوتی ہے۔

آپ کو اپنے دل سے یوں کہنا چاہیے: "چونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المؤمن: ۲۰) "تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔" یعنی وہ ہمارے ہونٹوں سے نکلنے والی ہر دعا قبول کریں گے، اس لئے میں ان کی چوکھٹ سے ہمیشہ لپٹا رہوں گا اور اسے کبھی نہ چھوڑوں گا۔" اگر کوئی بندہ عمر بھر اس طرح کی بندگی کا مظاہرہ کرے اور اسے کسی بھی قسم کی روحانی لذت کا احساس نہ ہو تب بھی اس کی ساری زندگی خالص بندگی میں گزرے گی۔

نیز روحانی مراتب کا حصول کبھی بھی عبادت کا ہدف نہیں ہونا چاہیے، اسی لیے حضرت جنید بغدادی ان لوگوں کے بارے میں جو جنت کے حصول کے لیے فرائض بندگی سرانجام دیتے ہیں، فرماتے ہیں کہ ان کی عبادت "جنت کی عبادت" ہے، یعنی وہ جنت کے بندے ہیں، حالانکہ جنت عبادت کا ہدف نہیں ہو سکتی۔ عبادت تو صرف اس لیے ادا کی جاتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اس سے مقصود صرف رضائے الٰہی کا حصول ہوتا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عبادت کا حقیقی سبب یہ ہے کہ وہ حکم خداوندی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم فرائض بندگی صرف اس لیے ادا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے لیے نماز پڑھتے ہوئے جہنم کے خوف سے کانپ رہا ہے تو ایسا شخص جہنم کا بندہ ہے۔ ایسی صورت میں وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ کیسے ہو سکتا ہے؟ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی عبادت جنت کے شوق میں ادا کرے اور نہ ہی جہنم کے خوف سے، بلکہ اس لیے ادا کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے اس کا حکم دیا ہے۔

انسان کو روحانی لحاظ سے حالت انقباض میں کہ جب وہ ہر قسم کے مادی و روحانی فیوض سے محروم ہو نماز ادا کرتے رہنی چاہیے، نیز جس طرح انسان کا گریہ اور آہ وزاری فیض اور برکت کا

وسیلہ ہوتا ہے، اسی طرح بعض اوقات آزمائش اور امتحان کا باعث بھی بن جاتا ہے، لہٰذا اس بارے میں کوئی حتمی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

جو انسان اپنے نفس کی اچھی طرح نگرانی اور محاسبہ نہیں کرتا بعض اوقات اس کی آہ و زاری اور گریہ اس کے لیے سخت خطرے کی بات بن سکتی ہے، کیونکہ وہ دل کی گہرائیوں سے ناآشنا ہوتا ہے۔ اگرچہ نماز میں گریہ کی کیفیت خصوصی عطیہ ہوتا ہے، لیکن اگر انسان نماز میں ہمیشہ انہی احوال کے خیال میں رہے تو وہ اخلاص کے بعض اہم پہلو کھو بیٹھے گا، کیونکہ یہ بات بہت اہم ہے کہ جب انسان نماز میں اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑا ہو تو اس کے پیش نظر صرف رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں صدق و اخلاص کا اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے۔ (آمین) اگر ہمیں یہ بات حاصل ہو جائے تو لوگوں کے سامنے ہماری ظاہری صورت کوتاہی کرنے والوں جیسی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایسی ظاہری صورت حال زیادہ اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں لوگوں کی نظر میں بڑا اور اپنی نظر میں چھوٹا نہ بنائیں، کیونکہ کتنے ہی لوگ ہیں جن کا لوگوں کی نظروں میں تو بڑا مقام ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ اہم چیز اللہ تعالیٰ کے ہاں مرتبے کا حصول ہے نہ کہ بندوں کے ہاں، لہٰذا سب کو حسب ذیل دعا بار بار مانگنی چاہیے: "اللهم اجعلنی فی عینی صغیراً و فی أعین الناس کبیراً." (اے اللہ! مجھے میری نظروں میں چھوٹا اور لوگوں کی نظروں میں بڑا بنا دے۔) نیز بعض اولیائے کرام نے اپنے دلوں سے خود پسندی کو نکال دیا اور انہیں توحید کامل کا مقام حاصل ہو گیا۔ ایسے اولیائے کرام اپنے اوپر ہونے والے انعامات الٰہیہ اور تجلیاتِ جمالِ خداوندی کا صراحۃً اظہار کر سکتے ہیں، مثلاً ہم رسول اللہ ﷺ کو غزوہ حنین میں دیکھتے ہیں کہ جب آپ ﷺ تنہا رہ گئے تو آپ اکیلے ہی دشمن کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے اور ابوسفیان بن حارث کی روایت کے مطابق حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر آپ ﷺ کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس موقع پر آپ ﷺ للکار رہے تھے:

أنا النبی لا کذب   أنا ابن عبد المطلب[123]

(یہ سچ ہے کہ میں نبی ہوں میں عبد المطلب کا فرزند ہوں۔)

رسول اللہ ﷺ نے یہ بات احسان شناسی اور تحدیث بالنعمت کے طور پر ارشاد فرمائی تھی۔ اسی سیاق وسباق میں آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: "قیامت کے روز میں سارے بنی آدم کا سردار ہوں گا، لیکن میں یہ بات بطور فخر کے نہیں کہتا۔ لواء الحمد میرے ہاتھ میں ہو گا، لیکن میں یہ بات بطور فخر کے نہیں کہتا۔ آدم ہو یا کوئی اور ہر نبی اس دن میرے جھنڈے کے سائے تلے ہو گا اور سب سے پہلے میری قبر کھلے گی، لیکن میں یہ بات بطور فخر کے نہیں کہتا۔[124]

آپ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے:

"مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔ ایک ماہ کی مسافت تک میرا رعب دلوں میں ڈال کر میری نصرت کی گئی ہے۔ میرے لیے ساری زمین کو جائے نماز اور طہارت کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ لہذا جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے میرا امتی نماز پڑھ لے۔ میرے لیے مالِ غنیمت کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ مجھ سے پہلے یہ کسی کے لیے بھی حلال نہ تھا۔ مجھے شفاعت کا اختیار دیا گیا ہے اور مجھ سے پہلے انبیائے کرام کو خاص ان کی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا، لیکن مجھے سارے لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔"[125]

یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اظہار ہے، مثلاً اگر کوئی شخص مجھے خوبصورت لباس تحفے میں دے تو میں جہاں بھی جاؤں گا اس تحفہ دینے والے شخص کے بارے میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ تم میرے جسم پر جو لباس دیکھ رہے ہو جو اللہ تعالیٰ کے حسنِ تخلیق میں مزید اضافہ کر رہا ہے یہ فلاں شخص کا دیا ہوا تحفہ ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ہم پر جو بے شمار نعمتیں ہیں ان کے اظہار میں کوئی حرج نہیں، بلکہ بسا اوقات تو انہیں چھپانے میں ناشکری کا پہلو ہوتا ہے، اسی پس منظر میں شیخ بدیع الزمان نورسی اپنی کتابوں کے بارے میں کہتے ہیں: "میں پوری قوت سے یہ بات کہتا ہوں کہ میری کتاب "کلمات" ایک عمدہ کتاب ہے، لیکن یہ میرا کمال نہیں ہے، بلکہ اس کا سرچشمہ قرآنِ کریم ہے۔" انہوں

نے یہ بات حضرت حسان بن ثابت کے حق میں رسول اللہ ﷺ کی دعا: "اللهم أيّده بروح القدس" (اے اللہ !روح القدس کے ذریعے اس کی مدد فرمایئے۔) سے اخذ کی ہے۔ چونکہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ زبردست شاعر تھے، وہ اپنی شاعری سے رسول اللہ ﷺ، اسلام اور قرآن کریم کا دفاع کرتے اور اپنے فصیح و بلیغ الفاظ سے مشرکین کے حوصلوں کو پست کرتے تھے، اس لیے ان کے لیے مسجد نبوی میں منبر رکھا جاتا اور ان کے الفاظ بجلی بن کر مشرکین کے سروں پر گرتے۔

ایک دن حضرت حسان بن ثابت نے فرمایا:

وما مدحت محمداً بمقالتی ولکن مدحت مقالتی بمحمد

(میں نے اپنی بات سے محمد ﷺ کی تعریف نہیں کی، بلکہ محمد ﷺ کے ذریعے اپنی بات کو قابل تعریف بنایا ہے۔)

یہ اس صحابی کی طرف سے تحدیث بالنعمت ہے، جو قرآن کریم کی اُس آیت مبارکہ کے بالکل مطابق ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب کیا گیا ہے: ﴿وَأَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ﴾ (الضحیٰ:۱۱) "اور اپنے پروردگار کی نعمت (یعنی وحی) کا بیان کرتے رہنا۔" جب ایک مشرکہ عورت ام جمیل نے کہا تھا: "محمد کے شیطان نے اسے چھوڑ دیا ہے۔" تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا:﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىٰ ○ وَلَلۡأٓخِرَةُ خَيۡرٞ لَّكَ مِنَ ٱلۡأُولَىٰ﴾ (الضحیٰ:۳۔۴) "(اے نبی ﷺ) تمہارے پروردگار نے نہ تو تم کو چھوڑ دیا اور نہ تم سے ناراض ہی ہوا اور آخرت تمہارے لئے دنیا سے کہیں بہتر ہے۔" چنانچہ وہ دن بھی آیا جب دنیا کا ہر پانچواں باشندہ دائرہ اسلام میں داخل ہو کر رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگا، دنیا کے کونے کونے میں مسجدوں کے مینار اور گنبد تعمیر ہو گئے اور مشرق و مغرب میں دن میں پانچ مرتبہ اذانِ محمدی گونجنے لگی۔ ایک شہر میں مؤذن اذان سے فارغ نہیں ہوا ہوتا کہ دوسرے شہر میں مؤذن اذان میں "اَشھدُ اَنّ محمّداً رسول اللہ" پکارنے لگتا ہے۔ اس طرح حضرت محمد ﷺ کا نام دنیا کے کونے کونے میں پھیل کر گونجنے لگا۔

سورۃ الضحیٰ بیک وقت رسول اللہ ﷺ کے لیے بشارت بھی ہے اور مشرکین کا جواب بھی ہے۔ یہ سورت اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کا ساتھ نہیں چھوڑا یہ سورت مزید کہتی ہے: ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ (الضحیٰ:۵) "اور تمہارا پروردگار عنقریب تمہیں اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔" سورۃ اللیل اور سورۃ الضحیٰ میں واضح مناسبت پائی جاتی ہے۔ جس طرح سورۃ اللیل (وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ) "اور وہ عنقریب خوش ہو جائے گا۔" کے الفاظ پر اختتام پذیر ہوتی ہے، اسی طرح سورۃ الضحیٰ میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو دنیا و آخرت میں اس قدر نوازیں گے کہ آپ ﷺ راضی ہو جائیں گے، چنانچہ قیامت کی عدالت عظمیٰ میں آپ ﷺ سے کہا جائے گا: "اپنا سر اٹھایئے اور شفاعت کیجئے! آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ مانگیے! آپ کو عطا کیا جائے گا۔" اتمام نعمت کے وقت آپ ﷺ سے پوچھا جائے گا: "کیا آپ راضی ہو گئے ہیں؟" چنانچہ آپ ﷺ فرمائیں گے: "جی ہاں، میں راضی ہو گیا ہوں۔" ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (الضحیٰ: ۹-۱۰) "تو تم بھی یتیم پر ستم نہ کرنا اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔" لہٰذا اس عظیم اور مبارک امت کو دیکھئے جو چودہ سو برس سے آپ کے نقش پا پر چلی آ رہی ہے۔

روضہ شریف میں داخل ہوتے وقت انسان پر یہ احساس غالب آ جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ باحیات ہیں اور عنقریب آپ ﷺ سے روبرو ملاقات ہونے والی ہے۔ یہ تروتازگی اور زمانے کی تحدی کس قدر پر کیف ہے! یہ جدت اور شباب کس قدر حیرت انگیز ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود آپ ﷺ ہمارے دلوں اور افکار میں زندہ ہیں۔ ہمارے دلوں میں موجود آپ ﷺ کی محبت اور احترام اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ ہمیشہ ہمارے دلوں میں زندہ رہیں گے۔ یہ بھی آپ ﷺ کو خوش کرنے کے لیے آپ پر کئے جانے والی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ آپ ﷺ کے پروردگار نے آپ ﷺ کو خدائی نعمتوں کو بیان کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ان نعمتوں کو بیان کیا ہے، جیسا کہ تھوڑی دیر پہلے ہم نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ تحدیث بالنعمت کے ضمن میں آپ ﷺ کا حسبِ ذیل ارشاد بھی ہے: "میری

لذت نماز میں ہے۔" تاہم رسول اللہ ﷺ نے محض روحانی لذت کے حصول کے لیے کبھی بھی نماز ادا نہیں فرمائی۔ شاید اس میں اعلیٰ استعداد کے حامل حضرات کے لیے راہنمائی بھی ہے، لہٰذا حوصلوں کو بلند رکھ کر ایسی کیفیت کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے رہنی چاہیے۔

مزید بر آں اکثر فقہاء کی رائے میں نماز کے دوران تعدیل ارکان فرض ہے، جبکہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے سوا دیگر فقہائے احناف کے نزدیک یہ واجب ہے۔ تعدیل ارکان کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے تمام ارکان کو جلد بازی کے بغیر اطمینان و سکون سے ادا کیا جائے۔ اس کا تعلق نماز کے دوران جسم کی کیفیت کے ساتھ ہے اور اس کیفیت کی رعایت رکھے بغیر نماز کو مکمل تصور نہیں کیا جا سکتا۔ میرے نزدیک نماز کے دوران تعدیل ارکان کو فرض قرار دینے والے حضرات کی رائے کو اختیار کرنے میں احتیاط ہے۔ چونکہ اس رائے کے حامل علمائے کرام نے بھی اپنے آپ کو قرآن و سنت کو سمجھنے کے لیے وقف کر رکھا ہے اس لیے اختلافی امور میں بہت احتیاط کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

تاہم عبادات و طاعات کی ادائیگی کے دوران دوسرے لوگوں کی ظاہری کیفیت دیکھ کر ان کے بارے میں کوئی منفی رائے قائم کرنی چاہیے اور نہ ہی ان کے بارے میں بدگمانی کرتے ہوئے یہ کہنا چاہیے: "تمہارا حج فضول ہے۔ اس سے تمہیں مشقت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا یا تمہارے روزے کی حقیقت بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں۔" اس قسم کی بدگمانی ایک مؤمن کے اخلاق کے منافی ہے، کیونکہ انسان کو اپنے بارے میں وکیل جرح اور اپنے مسلمان بھائیوں کے بارے میں وکیل صفائی کا کردار ادا کرنا چاہیے، مثلاً ہمیں اپنے بارے میں تو یوں کہنا چاہیے: "میں بکثرت نماز پڑھنے کے باوجود اپنی نماز سے کسی قسم کا فیض یا برکت حاصل نہیں کر پاتا۔ کیا ایسی حالت میں میری نماز قبول کیے جانے کے لائق ہے؟" اور یہ سوچ کر ہمیں اپنے گناہوں کو یاد کرنا چاہیے، لیکن دوسرے مسلمانوں کے بارے میں حسن ظن رکھنا ہمارا شعار ہونا چاہیے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام اور تابعین عظام کا یہی طرز عمل تھا۔ انہوں نے اہل ایمان کے حالات کی بری تاویل کی اور نہ ہی مسلمانوں کے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے والوں کو ان

کے بعض برے اعمال کی بنیاد پر مجرم ٹھہرایا، لہٰذا اہل ایمان کے بارے میں حسنِ ظن رکھتے ہوئے ان کے اچھے طرز عمل اور نیکیوں پر زور دینا چاہیے، کیونکہ جو شخص کسی گلستان یا باغ میں جاتا ہے تو وہ وہاں لگے کانٹوں کی طرف التفاف نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنی نظریں اس میں لگے پھولوں اور پھلوں پر ہی مرکوز رکھتا ہے اور اس کا شعار "خذ ما صفا و دع ما کدر" (اچھی چیز کو اختیار کر لو اور گدلی چیز کو چھوڑ دو) ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے دور میں نعیمان نامی ایک شخص تھے۔ روایت ہے کہ وہ غزوہ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے۔ وہ انگوروں کی شراب بنا کر پیتے تھے۔ کئی دفعہ نشے کی حالت میں پکڑے گئے اور نبی کریم ﷺ کی مجلس میں سزایاب ہوئے۔ ایک مرتبہ جب وہ لوٹ کر جا رہے تھے تو حاضرین مجلس میں سے کسی نے کہا: "اللہ اسے رسوا کرے! نہ جانے اسے کیا ہے؟" اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اپنے بھائی کے خلاف شیطان کے مددگار نہ بنو۔"(126) یعنی شیطان اس کے دل میں وسوسے ڈال کر اسے اس گناہ میں گرفتار کرتا ہے، لہٰذا عمدہ گفتگو سے اس کی مدد کرو۔ ایک دوسری روایت کے مطابق انہیں لایا گیا اور کوڑے لگائے جانے کا حکم ہوا۔ لوگوں میں سے کسی نے کہا: "اللہ اس پر لعنت کرے! اسے کتنی بار (سزا کے لئے) لایا جا چکا ہے! (لیکن پھر بھی باز نہیں آتا)" اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اس پر لعنت مت کرو، کیونکہ بخدا میرے علم کے مطابق وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔"(127)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرنے والا اگرچہ بار بار گناہوں میں مبتلا کیوں نہ ہوتا آپ ﷺ اس کی طرف دست تعاون ضرور دراز فرماتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرنے والے شخص کو ایسی آزمائش میں بے یار و مددگار نہ چھوڑتے تھے، لہٰذا ہمیں بھی ایسے مواقع پر بہت بیدار مغزی اور سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال کے خیر یا شر کے غالب پہلو کے لحاظ سے احکام صادر فرماتے ہیں۔ ایک دن ہم سب اس کے حضور پیش ہوں گے اور جب دائیں بائیں دیکھیں گے تو اپنے

ارد گرد ماؤنٹ ایورسٹ جتنے بلند گناہوں کے ڈھیر پائیں گے، جنہیں دیکھ کر ہم پر ناامیدی چھا جائے گی اور ہم میں سے ہر ایک دنیا میں کئے گئے نیکی اور بھلائی کے بعض چھوٹے چھوٹے کاموں کو یاد کرنے لگے گا: "ایک مرتبہ میں نے اپنی والدہ کو پانی کا گلاس پکڑایا تھا۔ میں نے ایک بار اپنے والد کے جوتے پالش کیے تھے۔ میں نے ایک نیک شخص کی نماز جنازہ میں شرکت کی تھی یا میں نے ایک بار دو سجدوں کے درمیان بڑے خلوص سے "رب اغفر و ارحم" کہا تھا۔" پھر ہم اللہ سے گڑگڑا کر التجا کریں گے: "اے اللہ! کیا یہ اعمال آپ کی رحمت و بخشش کو متوجہ کرنے کا باعث بن سکتے ہیں؟" اگر ایسے ہو گیا تو ہم اطمینان کا سانس لے کر کہیں گے: "اے پروردگار! آپ کی رحمت کس قدر بے پایاں ہے"!

ہم اپنے بارے میں جس بھلائی کی امید رکھتے ہیں اس کی امید ہم اپنے سارے مسلمان بھائیوں کے بارے میں رکھ سکتے ہیں۔ اگر ہمیں ان کی شخصیت میں کوئی منفی پہلو نظر آئے گا تو ہم اس کا عذر تلاش کریں گے اور کہیں گے: "ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کے ثمرات اس دنیا میں نہیں دینا چاہتے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں آخرت کے لیے ذخیرہ بنا دیا ہے، جس کی وجہ سے ان کے طرز عمل میں کمی اور منفی پہلو دکھائی دیتا ہے۔" ہم یہ بات کہہ کر سب کے ساتھ حسنِ ظن رکھیں گے۔

میرا کوئی روزہ ہے اور نہ نماز! میری آنکھیں آنسوؤں سے اور دل جذبے سے خالی ہے! دعوتی سرگرمیوں میں بھی مجھے صرف نمایاں نظر آنے کا شوق ہے... لیکن اس کے باوجود میں اس در کو نہیں چھوڑ سکتا۔

یہ ہر اس دردمند دل کی پکار ہے، جو اپنے آپ کو ہر طرف سے خلا میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ یہ سوال نہیں ہے، بلکہ ایک قسم کا خطاب ہے، جس کا مخاطب ہم سے ایک ہے۔ ایک عظیم ہستی اکثر درج ذیل اشعار پڑھا کرتی تھی:

لیس لی لا علم ولا عمل.
ولا صبر لی علی الطاعة والبر.
غریق فی العصیان۔۔آثامی کثیرة۔۔
فماذا تکون یا تری! حالی یوم الحشر؟

میرے پاس علم ہے اور نہ عمل۔
مجھ میں طاعت و نیکی پر استقامت بھی نہیں ہے۔
میں نافرمانی کے سمندر میں غرق ہوں اور میرے گناہ بہت زیادہ ہیں۔
ہائے! حشر کے دن میرا کیا حال ہو گا؟

گریہ اور آہ وزاری ان سچے اور مخلص لوگوں کے لیے بوجھ ہلکا کرنے کا ذریعہ ہے، جن کے دل (آتشِ عشق میں) ہمیشہ جلتے رہتے ہیں، گویا ان کے سینوں میں آگ کا کوئی شعلہ ہے، جس سے ان کے دلوں کو سلگایا جا رہا ہے، جس کے نتیجے میں ان کے جذبات کو آنسوؤں کے سوا نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا، اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جہنم اور آنسوؤں کے درمیان توازن قائم کرتے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے: ''کوئی مؤمن بندہ ایسا نہیں جس کی آنکھوں سے خوفِ خدا سے مکھی کے سر کے برابر بھی آنسو بہہ کر اس کے چہرے کے کسی حصے کو لگے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کی آگ حرام فرما دیں گے۔''[128]

جہنم کی آگ کو صرف آنسو ہی بجھا سکتے ہیں۔ایک دوسری حدیث نبوی میں اس توازن کو یوں بیان کیا گیا ہے: "دو آنکھیں ایسی ہیں، جنہیں آگ نہیں چھوئے گی۔۔۔ ایک وہ آنکھ جو خوف خدا سے روئی اور دوسری وہ آنکھ جو راہ خدا میں پہرہ دیتے ہوئے رات کو جاگتی رہی۔" (129) دوسری احادیث کی طرح اس حدیث نبوی میں بھی کفار کے خلاف جہاد کرنے والے شخص اور نفس کے خلاف جہاد کرتے ہوئے آنسو بہانے والے شخص کو ایک ہی نظر سے دیکھا گیا ہے۔

قرآن کریم بھی ان لوگوں کی کیفیت بیان کرتا ہے جو روتے ہوئے سجدے میں جا گرتے ہیں، نیز قرآنِ کریم کم ہنسنے اور ندامت سے بکثرت رونے کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ آنسو طبیعت کی نرمی اور روح کے حسن کی دلیل ہیں۔ آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ جنت کے آب کوثر کے مساوی ہے، جبکہ دوسری طرف آنسوؤں کا خشک ہونا اتنی بڑی مصیبت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے تھے۔کاش! ہر مؤمن اپنے نفس کا مراقبہ اور اس تلخ حقیقت کا اعتراف کر سکتا اور یہ کہتا: "میرا دامن علم و عمل سے خالی ہے۔ مجھ میں نیکی اور طاعت پر استقامت نہیں، میری آنکھوں میں آنسو اور میرے دل میں طاقت نہیں اور میں عزم و ارادے کی نورانیت سے بھی محروم ہوں۔"

کاش! مؤمن اپنے آپ کو یہ بات سمجھا سکتا کہ وہ بالکل بے مایہ چیز ہے۔ اگر وہ بعض الطاف الٰہیہ کا مظہر ہے تو اس کا سبب اس کی ذاتی لیاقت نہیں، بلکہ اس کے برعکس اس کی ضرورت اس کا باعث ہے اور اس کے فقر و افلاس نے رحمت الٰہیہ کو اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔اپنے عیوب اور کوتاہیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے ان عیوب کو جاننا ضروری ہے، نیز اس معرفت کے ساتھ ساتھ احساسِ ندامت اور دکھ بھی ہونا چاہیے تاکہ انسان ان سے نجات حاصل کرنے کی کوشش بھی کرے۔

مؤمن پر اللہ تعالیٰ کی اہم ترین نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ اسے ایمان سے متعلق امور سے محبت اور کفر، فسق اور نافرمانی سے متعلق امور سے نفرت ہو جائے۔اس محبت اور

نفرت کے ذریعے انسان جہاں انسانیت اور ایمان کی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے وہیں ہر اس چیز سے نجات بھی حاصل کر سکتا ہے، جو اسے پستی کی طرف کھینچتی اور دھکیلتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حسب ذیل آیت مبارکہ اشارہ کر رہی ہے: ﴿وَلَكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ أُولَئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ○ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (الحجرات:۷۔۸) "لیکن اللہ نے تمہارے لئے ایمان کو عزیز بنا دیا اور اس کو تمہارے دلوں میں سجا دیا اور کفر اور گناہ اور نافرمانی سے تم کو بیزار کر دیا۔ یہی لوگ راہ ہدایت پر ہیں، یعنی اللہ کے فضل اور احسان سے اور اللہ جاننے والا ہے اور حکمت والا ہے۔" اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو اہل ایمان کے دلوں میں محبوب اور مزین بنایا ہے اور جب وہ اس ایمانی عدسے سے دیکھتے ہیں تو انہیں یوں لگتا ہے جیسے وہ جنت اور اس کی حوروں کا مشاہدہ کر رہے ہیں، لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قرب کو محسوس کرتے ہیں۔

اس آیت مبارکہ کا مصداق صحابہ کرام ہیں۔ یہ طرز عمل ان کی فطرت ثانیہ تھی، جس میں کبھی تبدیلی نہ آئی، کیونکہ وہ عشق کی حد تک ایمان اور عبادات سے متعلق ہر مسئلے اور حکم سے محبت کرتے اور کفر اور اس کے دواعی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اسی ایمان کی بدولت وہ دنیا میں رہتے ہوئے یوں محسوس کرتے، جیسے وہ جنت کے پر فضا ماحول میں رہ رہے ہوں اور وہ کفر کی طرف لوٹنے پر آگ میں پھینکے جانے کو ترجیح دیتے تھے۔ اگر انہیں حالت کفر میں آسودگی کے ساتھ جینے اور حالت ایمان میں آگ میں جلنے میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا اختیار دیا جاتا تو وہ دوسری صورت کو اختیار کرتے، اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ مقام رشد تک پہنچ گئے اور یہ ان پر اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان تھا۔

یہ بات ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ انسان کو اپنی کوتاہیوں کا احساس ہونا ان سے نجات حاصل کرنے کی طرف پہلا قدم ہے، لیکن اگر کوئی انسان اپنے آپ کو کامل سمجھے اور اسلام کی خاطر اپنی خدمات کو ہر عیب اور نقص سے پاک گردانے تو جان لو کہ وہ بتدریج تباہی کی طرف

جارہا ہے۔ امام قسطلانی لکھتے ہیں کہ چودہ صحابہ کرام نفاق اور منافقین کی فہرست میں لکھے جانے کے خوف سے کانپتے رہتے تھے۔ در حقیقت یہ خوف و خشیت ان کے ایمان کے بلند مقام کی ایک اور علامت تھی۔ ان صحابہ کرام میں حضرت عمر بن خطاب اور ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شامل تھیں۔ اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جنت کی بشارت سنائی جا چکی تھی اور ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا: "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتا۔" لیکن اس کے باوجود اس عظیم انسان کو اپنے بارے میں پورا اطمینان نہ تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ (130) کے پاس جاتے اور انہیں خدا کا واسطہ دے کر ان سے پوچھتے کہ کیا عمر منافقین میں سے تو نہیں ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عنفوانِ شباب میں ہی گھرانۂ نبوت میں آگئی تھیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی مرد سے شناسا ہوئیں اور نہ ہی آپ ﷺ کے سوا کسی کا خیال ان کے دل میں گزرا۔ وہ حقائق اور عقیدہ الوہیت کو رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے آئینے میں دیکھتی تھیں۔ ان کا گھر وحی کا مہبط تھا اور ان کے شوہر حضرت یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر حسین تھے۔ کسی شاعر نے ان کے الفاظ میں کہا ہے: "مصر کی عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے۔۔۔ اگر وہ میرے سر تاج کو دیکھتیں تو اپنے کلیجے کاٹ بیٹھتیں۔"

باقی ان کی عبادت اور اس بارے میں ان کی حساس مزاجی کا تو سب کو علم ہے۔ جن ایام میں عورت صوم و صلاۃ کی ادائیگی سے معذور ہوتی ہے ان کے علاوہ ان کی ایک بھی نماز یا روزہ قضا نہیں ہوا۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کی محبوب ترین زوجہ ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ اس کے علاوہ بھی ان کے بہت سے فضائل ہیں۔ ان کی عظمت کا مقام سمجھنے کے لئے ان تمام امور کو پیش نظر رکھیے اور پھر درج ذیل حدیث سنیے:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ جہنم کا خیال آنے پر رونے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا: "تم کیوں رو رہی

ہو؟" انہوں نے عرض کی: "مجھے جہنم کا خیال آیا، جس سے مجھ پر گریہ طاری ہو گیا۔ کیا آپ قیامت کے دن اپنے گھر والوں کو یاد رکھیں گے؟" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تین مقامات پر کوئی کسی کو یاد نہ رکھے گا۔ میزان کے پاس یہاں تک کہ اسے علم ہو جائے کہ اس (کی نیکیوں) کا پلڑا ہلکا ہوتا ہے یا بھاری۔ اعمال نامہ پکڑائے جانے کے وقت جب اس سے کہا جائے گا: "لو اپنا اعمال نامہ پڑھو۔" یہاں تک کہ اسے علم ہو جائے کہ اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں پکڑایا جائے گا، بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا یا پیٹھ کے پیچھے سے پکڑایا جائے گا اور پل صراط کے پاس جب اسے جہنم کے اوپر بچھایا جائے گا۔" (131)

دیکھیے ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جن کی شفاعت کے ہم امیدوار ہیں وہ بھی اس قدر خوف و خشیت کا مظاہرہ کرتی ہیں اور اپنے بارے میں مطمئن اور پر اعتماد نظر نہیں آتیں۔ اپنی ذات سے آگاہی سے بڑھ کر کوئی علم و عرفان نہیں۔ جو شخص بھی اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کرتا ہے وہ مبارک باد دیئے جانے کا مستحق ہے، کیونکہ اس نے اپنی ذات کو نجات دلانے اور اپنے آپ کو عیوب سے پاک کرنے کی طرف پہلا اور اہم قدم اٹھالیا ہے۔ صوم وصلاۃ کی پابندی، پرجوش ولولہ اور آنسو وہ خطوط ہیں، جن پر روحانی اور معنوی زندگی استوار ہوتی ہے۔ بلاشبہ ان کے علاوہ اور بھی کچھ امور ہیں جن کا اضافہ کرنا ضروری ہے، مثلاً مالی قربانی کہ دور حاضر میں اس کے اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے، کیونکہ اس دور میں مالی قربانی اور جہاد ایک ناگزیر فرض کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ یہ وہ ارکان ہیں، جن سے استغناء ممکن نہیں۔

اگر ان ارکان میں سے کوئی رکن نہ پایا گیا تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی نماز کے دوران اس کا کوئی رکن بھول جائے، لہٰذا اس کا رحمت الٰہیہ کے ساتھ رابطہ برقرار نہ رہے گا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم رحمت خداوندی کے ساتھ رابطے میں رہیں اور اس کے ساتھ ہماری فریکوئنسی ملی رہے تو ہمیں چاہیے کہ انفرادی، خاندانی اور معاشرتی زندگی سے متعلق اللہ تعالیٰ کے تمام احکام پر بغیر کسی کوتاہی کے عمل پیرا رہیں۔ اس کی مثال چابی کے دندانوں کی طرح ہے۔ اگر ایک بھی دندانے

میں عدم مطابقت ہو تو تالا نہیں کھل سکتا اس لیے ہر مکلف شخص کو اسباب اختیار کرنے چاہئیں اور ہر تالے کے لیے اس کے مناسب حال چابی تیار کرنی چاہیے۔

عبادت کا حقیقی مفہوم یہی ہے۔ عبادت اصرار کرنے اور دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر انتظار کرنے سے عبارت ہے۔ بندے کو چاہیے کہ دروازے پر کھڑے ہو کر اس کے وا ہونے کا انتظار کرتا رہے، خواہ اس کے لیے اسے ساری زندگی ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔ اپنے پہلے دن کے شوق کو برقرار رکھے۔ عادت و اِلفت کو اپنے شوق و ولولے پر اوس نہ ڈالنے دے اور نہ ہی اپنی عبادات کو بے روح ورزشی نقل و حرکت میں تبدیل ہونے دے۔ یہی حقیقی عبادت ہے کہ آپ شوق اور بیم و رجا کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پہلے دن کے شوق کی طرح زمانے سے مسابقت کریں۔ قرآنِ کریم ہمیں اسی بات کی تعلیم دیتا ہے: ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِيْنَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾ (الحدید:١٦) "کیا ابھی تک مؤمنوں کے لئے اس کا وقت نہیں آیا کہ اللہ کی یاد کرنے کے وقت اور قرآن جو حق کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کے سننے کے وقت ان کے دل نرم ہو جائیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے پہلے کتابیں دی گئی تھیں پھر ان پر طویل عرصہ گزر گیا تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔"

چونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم جو اس آیت مبارکہ کے اولین مخاطب تھے، کا ایمان ہر روز آسمان سے اترنے والے روحانی دستر خوان کی طرح تھا، اس لیے ان کے ساتھ اس قسم کا خطاب ہمارے لیے بڑا معنی رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ہے کہ اس وقت اِلفت کے پائے جانے کی کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ آیات مسلسل نازل ہو رہی تھیں اور وہ ایک نئے اور تر و تازہ اسلام کے مطابق زندگی گزار رہے تھے، مثلاً وہ ایک دن پہلی مرتبہ اذان کی آواز سنتے تو ایک نئے جذبے کے ساتھ مسجد کی طرف دوڑ پڑتے اور کسی دوسرے دن رسول اللہ ﷺ انہیں تسبیح اور دعا سکھاتے، اس طرح ان کے جذبات تازہ رہتے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں تازگی پیدا ہوتی رہتی۔

لیکن اس کے باوجود یہ آیت مبارکہ انہیں قساوت قلب سے خبردار کر رہی ہے اور ان سے آنسوؤں اور ان سے زندہ اور پرجوش جذبات کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر ہمارے باطنی جذبات زندہ نہیں ہیں اور اگر ہماری آنکھیں اس قدر آنسو نہیں بہاتیں، جس قدر قرآنِ کریم کا مطالبہ ہے تو ہمیں صرف اپنے آپ کو ملامت کرنی چاہیے۔ اس دور میں کہ جب دین کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور کوئی بھی اس کا خیال رکھنے والا باقی نہ رہا اگر ہم دین اسلام کی سربلندی کے لیے جہاد کے لیے نہیں بڑھتے یا اس کی طاقت نہیں رکھتے اور جب کفر کی یلغار کے مقابلے میں اپنی پسپائی اور حق پر باطل کے غلبے پر ہماری نیند اڑتی ہے اور نہ ہی ہم شدید غم محسوس کرتے ہیں تو ہمیں صرف اپنے آپ کو ملامت کرنی چاہیے اور اپنے آپ کو ہی معیوب گردانا اور موردِ الزام ٹھہرانا چاہیے۔

ہم دین خداوندی کے اس در کے غلام ہیں۔ ہم اس غلامی کے طوق سے چھٹکارہ پانا چاہتے ہیں اور نہ ہی ہم اس در کو کبھی چھوڑیں گے۔ کیا اس در کے علاوہ کوئی اور در ہے؟ ہم پوری استقامت اور اصرار کے ساتھ اس در کے سامنے کھڑے رہیں گے اور اس سے کبھی بھی رخ نہ پھیریں گے۔

ایک تمثیلی قصہ مشہور ہے، جس کے مطابق ایک اللہ کے ولی نے اللہ تعالیٰ کی سالہاسال تک عبادت کی اور اس کے ہاتھ پر بہت سے مریدوں نے سلوک کی منزلیں طے کیں یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک کو لوح محفوظ نظر آنے لگی اور وہ اس میں لکھی ہوئی تحریر پڑھنے لگا، لیکن عجیب بات یہ تھی کہ ہر مرید لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا پاتا تھا کہ اس کا شیخ شقی ہے؟ چنانچہ مریدین اس کا ساتھ چھوڑتے چلے گئے اور اس کے پاس صرف ایک مرید رہ گیا۔ ایک دن شیخ نے اس سے پوچھا: ''تمہارے ساتھی ہماری مجلس کو کیوں چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور وہ اب ہمارے پاس کیوں نہیں آتے؟'' مرید نے ہچکچاتے ہوئے بتایا: ''سیدی! انہوں نے لوح محفوظ میں پڑھا ہے کہ آپ شقی ہیں، اس لیے انہوں نے آپ کا حلقہ درس چھوڑ دیا ہے۔'' اس پر شیخ نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا: ''بیٹے! میں نے یہ بات آج سے چالیس برس پہلے پڑھی تھی، لیکن مجھے بتاؤ! کیا اس کے سوا کوئی اور در ہے، جسے میں کھٹکھٹاؤں؟'' شیخ کا یہ بات کہنا تھا کہ آسمان لرز اٹھا، لوح محفوظ میں تبدیلی ہوئی اور شیخ کو سعید لوگوں میں لکھ دیا گیا۔

صحابہ کرام کے بعد کے ادوار میں مٹی اس قدر زرخیز ہو چکی تھی کہ ہزاروں کی تعداد میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے سپاہی تیار ہوئے اور کسی نے بھی اس کے در کو نہیں چھوڑا۔ بڑے بڑے اہل ایمان کو جس چیز کا سب سے زیادہ اندیشہ رہتا تھا وہ ریا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے نزدیک ریا کا مفہوم ہمارے نزدیک اس کے مفہوم سے مختلف تھا، لیکن اس کے باوجود یہ خشیت ان میں موجود تھی۔ ریا سے چھٹکارے کے مختلف طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک اس بات کا استحضار ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ہر کام اور ہمارے دلوں میں گزرنے والے ہر خیال سے باخبر ہیں۔ ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے اور اپنے طرز زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنا چاہیے، نیز ہمیں اذکار و اوراد اور دلوں میں خشیت الٰہیہ پیدا کرنے والی کتابوں کے مطالعہ کا سلسلہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہم اسے ہدف تک پہنچانے والے ایک اہم ذریعے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور قاری کو اس مفصل جواب کی طرف مراجعت کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، جسے ہم ایک دوسرے موقع پر بیان کر چکے ہیں۔

حواشی وحوالاجات

(1) یہ قطب جنوبی میں واقع غیر آباد براعظم کا نام ہے۔(عربی مترجم)

(2) ابراہیم(۱۷۰۳-۱۷۸۰): آپ حسن قلعہ کے علاقے ارضروم میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار صوفی شعراء میں ہوتا ہے۔ آپ کی اہم ترین کتاب "معرفت نامہ" ہے، جو اُس دور کا دائرۃ المعارف سمجھا جاتا ہے۔(عربی مترجم)

(3) تفسیر الطبری، ۳/۷۷۔ اسے یونس ابن وہب سے، وہ ابن زید سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔

(4) مسلم، کتاب الایمان،۲۹۱.

(5) ابن ماجة، المقدمة،۱۳.

(6) مسلم، الاعتصام، ۳.

(7) یہ بات تیس چالیس سال پہلے کے ترکی کے لحاظ سے درست ہے، کیونکہ اس دور میں نوجوان نسل دینی تعلیم کے بغیر پروان چڑھی تھی۔

(8) شامانیہ شمالی ایشیا کا قدیم دین ہے۔اس دین کے مطابق ایک غیر مرئی عالم ہے، جسے خداؤں، شیاطین اور اسلاف کی روحوں کا عالم کہا جاتا ہے۔ اس عالم تک صرف شامان کی رسائی ہوتی ہے۔ شامان ایسے کاہن کو کہتے ہیں جو بیماروں کے علاج، مخفی باتوں سے پردہ اٹھانے اور حالات پر قابو پانے کے لیے جادو سے کام لیتا ہے۔(قاموس المورد)

(9) ان سے مراد وجود، قدم، وحدانیت، قیام بذاتہ اور حوادثات سے پاک ہونے کی خدائی صفات مراد ہیں، مثلاً صفت وجود عدم کی، صفت وحدانیت تعدد کی اور صفت قدم فنا کی نفی کرتی ہے۔

(10) دونبیوں یا رسولوں کا درمیانی زمانہ۔

(11) بدیع الزمان سعید نورسی مراد ہیں۔ (عربی مترجم)

(12) استدراج سے مراد بعض لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے محظوظ ہونے کے باوجود کفر و نافرمانی پر قائم رہنا اور نتیجتاً اللہ تعالیٰ کے غضب اور ناراضگی سے قریب ہونا ہے۔

(13) البخاری، الصلح؛ مسلم، القیامة و المحاربین و القصاص والدیات.

(14) البخاری، تفسیر، ۲/۶٦؛ المسند، ۱/۶۳.

(15) ملکوتی: جس کا تعلق اشیاء کی اصل حقیقت وماہیت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ وہ عالم ہے، جہاں الوہی اسرار اور حکومت کو مکمل حاکمیت اور قوتِ تاثیر حاصل ہوتی ہے۔

(16) مثیل الانسان: بعض نادر واقعات میں ایک انسان کو ایک ہی وقت میں دو مختلف مقامات پر دیکھا گیا ہے۔ حقیقی انسان کے مقام سے دور اور مختلف مقام پر اس کی ظاہر ہونے والی صورت کو "مثیل الانسان" کہا جاتا ہے۔ (عربی مترجم)

(17) سیر أعلام النبلاء، الذهبی، ۲/۵۵۳.

(18) کشف الخفاء، العجلونی، ۲/۱۴۳؛ مجمع الزوائد، الهیثمی، ۱/٦۱.

(19) مصنف کا اشارہ اشتراکیت کی طرف ہے۔ یہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں اشتراکیت کی ناکامی سے پہلے کی بات ہے۔ (عربی مترجم)

(20) جمہوریہ ترکی کے قیام کے بعد ترکی میں ترقی کی علمبردار جماعتوں نے ترکی زبان سے عربی اور فارسی کے الفاظ نکالنے کی وسیع پیمانے پر تحریک چلائی اور ان کی جگہ ترکی زبان کے متروک الفاظ ڈال دیئے یا ان الفاظ کا نئے سرے سے اشتقاق کیا یا ان کی جگہ فرانسیسی اور انگریزی زبان کے الفاظ ڈال دیئے اور اس طرح انہوں نے زبان کو فطری طریقے سے ارتقانہ کرنے دیا۔ اس کا نتیجہ دو نسلوں کے درمیان افہام و تفہیم کی دشواری کی صورت میں نکلا۔ باپ کو اپنے بیٹے کی گفتگو سمجھنے میں دشواری پیش آتی، نوجوان ترکی کا کلاسیکل ادب سمجھنے سے قاصر ہوگئے اور ترکی کے رسم الخط کو عربی رسم الخط سے لاطینی رسم الخط میں تبدیل کرنے اور قدیم ترکی کے بہت سے الفاظ کو

ترکی لغت سے نکالنے کے بعد نوجوانوں کے لیے ترکی کا کلاسیکل ادب پڑھنا ممکن نہ رہا۔(عربی مترجم)

(21) بائیں بازو اور مغرب زدہ لوگوں کے رسائل کتابوں اور اخبارات میں ترکی کے خود ساختہ، نئے اور غیر ملکی زبانوں کے الفاظ بکثرت استعمال کیے جاتے ہیں۔دوسری طرف اسلامی اخبارات اور کتابوں میں عثمانی دور کے الفاظ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔(عربی مترجم)

(22) مسیلمہ کذاب نے درج ذیل "آیات"میں قرآن کی نقل کرنے کی کوشش کی تھی:"یاضفدع بنت ضفدعین، نقیّ ما تنقین، نصفک فی الماء ونصفک فی الطین، لاالماء تکدرین ولا الشارب تمنعین"(اے مینڈکوں کی بیٹی مینڈک! تو کتنی صاف ستھری ہے! تیرا آدھا جسم تری میں اور آدھا جسم خشکی پر ہے۔تو پانی کو گدلا کرتی ہے اور نہ پانی پینے والے کو روکتی ہے۔)(عربی مترجم)

(23) اس سے آیت مبارکہ ﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ﴾ (فصلت:۵۳) "ہم عنقریب ان کو اطرافِ عالم میں بھی اور خود ان کی ذات میں بھی اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن حق ہے۔"کی طرف اشارہ ہے۔

(24) جزیرہ قبرص کی طرف اشارہ ہے۔(عربی مترجم)

(25) الكامل فی التأریخ، ابن الأثیر،۱۰۶/۴.

(26) اس سے روسی استعمار سے آزاد ہونے والی مسلم ترک ریاستیں مراد ہیں۔(عربی مترجم)

(27) نماز ظہر کی فرض اور سنت رکعات کی مجموعی تعداد مراد ہے۔(عربی مترجم)

(28) گرین کریسنٹ سوسائٹیز منشیات کے خلاف اقدامات کرتی ہیں۔(عربی مترجم)

(29) جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معجزانہ ولادت۔(عربی مترجم)

(30) بدیع الزمان سعید نورسی مراد ہیں۔(عربی مترجم)

(31) البخاری، النکاح، ۸۰.

(32) فیض القدیر، جلد دوم، حدیث نمبر: ۱۹۴۸.

(33) تفسیر ابن کثیر، ۱/۱۶۴.

(34) فیض القدیر، المناوی.

(35) البخاری، الرقاق.

(36) اس علم میں علم فلکیات، جغرافیہ اور علم طبقات الارض شامل ہیں۔(عربی مترجم)

(37) انکشاری: یہ ایک عسکری ادارہ تھا، جسے اور خان نے دولت عثمانیہ کی پیادہ فوج کے لیے قائم کیا تھا۔ اپنے ابتدائی ادوار میں اس ادارے نے دولت عثمانیہ کے لئے جلیل القدر خدمات سرانجام دیں۔ یہ اٹھان، وسعت اور ترقی کے دور تھا، لیکن پھر اس ادارے میں خرابیاں در آئیں اور وہ دولت عثمانیہ کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بن گیا، کیونکہ اس کے کمانڈر اور سربراہان دولت عثمانیہ کی سیاست اور سلاطین کے عزل و تقرر میں کھلم کھلا مداخلت کرنے لگے اور ان کی وجہ سے بہت سی قتل و غارت ہوئی، لیکن آخرکار سلطان محمود ثانی اس ادارے کو تحلیل کرکے اس کی جگہ ایک نئے عسکری ادارے "النظام الجدید" کو متعارف کرانے میں کامیاب ہوگئے۔(عربی مترجم)

(38) مصنف کا اشارہ ۱۹۲۰ سے ۱۹۸۲ تک ترکی میں آنے والے تین فوجی انقلابات کی طرف ہے، جن میں سے ہر ایک نے ملکی ترقی کو روک دیا، بے چینی اور بے یقینی کی صورتحال پیدا کی اور ملکی معیشت کو نقصان پہنچایا۔(عربی مترجم)

(39) جیو پولیٹیکس: یہ ایک ایسا علم ہے، جس میں ریاست کی خارجہ پالیسی پر طبیعی مثلاً جغرافیائی، آبادیاتی اور اقتصادی عوامل کے اثرات سے بحث کی جاتی ہے۔(عربی مترجم)

(40) یعنی "عظیم مشرق" جسے ترکی کے مرحوم شاعر، ادیب اور مفکر نجیب فاضل شائع کرتے تھے۔ اس رسالے نے ترکی کی فکری زندگی کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

(41) یعنی ''مردِ حر'' (عربی مترجم)۔

(42) یعنی ''قومی یا ملی راستہ'' (عربی مترجم)۔

(43) آلتائی: یہ وہ نسل ہے، جس سے ترکوں کا تعلق ہے۔ یہ لفظ قوم پرست ترکوں کی طرف مشیر ہے۔ (عربی مترجم)

(44) جبال سجان: یہ بھی ترک قوم پرستی کا شعار ہے، کیونکہ یہ موجودہ ترکوں کے اسلاف کا مسکن رہا ہے۔ (عربی مترجم)

(45) التعاریف، المناوی، ۳۴۴.

(46) البخاری، البیوع؛ مسلم، الذکر والدعاء والتوبة.

(47) البخاری، الوضوء؛ مسلم، الطهارة؛ المسند، الامام أحمد، ۲/۳۰۰.

(48) تخلیق کی حقیقت اور نظریہ ارتقاء

(49) یہ اصحاب کہف کے کتے کا نام ہے۔ (عربی مترجم)

(50) البخاری، تفسیر القرآن؛ مسلم، التوبة، مسند الامام أحمد، ۱/ ۴۴۹.

(51) السیرة، ابن هشام، ۱/ ۱۶۹.

(52) سنن أبی داؤد، النکاح.

(53) سنن أبی داؤد، النکاح.

(54) مجمع الزوائد، الهیثمی، ۳۲۶٦.

(55) دونمہ: یہ یہودیوں کا ایک گروہ ہے، جو بظاہر اسلام کا دعویدار ہے، لیکن حقیقت میں اسلام میں داخل نہیں ہوا۔ (عربی مترجم)

(56) سلطان عبدالحمید ثانی نے پہلی مرتبہ درج ذیل ادارے اور کالجز قائم کئے: میڈیکل کالج، انجینئرنگ یونیورسٹی، کامرس کالج، سائنس کالج، کالج آف لٹریچر، لا کالج، کالج

آف پولیٹکل سائنسز، کالج آف ایگریکلچر اینڈ ویٹرنٹی، اکیڈمی آف فائن آرٹس، انسٹی ٹیوٹ آف منرلز اینڈ فاریسٹس، ہائر انسٹی ٹیوٹ فار ٹیچرز اور انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز۔ (عربی مترجم)

(57) یہ پل براعظم ایشیاء اور براعظم یورپ کا سنگھم ہے۔ (عربی مترجم)

(58) جیش الحرکت: یہ وہ لشکر تھا، جسے اتحادیوں نے سلانیک (Salonica) سے استنبول اس "دستورِ دوم" کی حفاظت کے لیے بھیجا تھا، جسے اتحادیوں نے بزعم خویش سلطنت عثمانیہ میں سلطان کی سازشوں کے خلاف بنایا تھا، کیونکہ انہوں نے سلطان پر الزام لگایا تھا کہ "۱۳ اپریل ۱۹۰۹" کے دن بعض فوجیوں کی طرف سے برپا کیے گئے فسادات کے پیچھے سلطان کا ہاتھ تھا، حالانکہ سلطان اس الزام سے بری تھے۔ سلطان کے محل کے حفاظتی دستے کے کمانڈر نے سلطان سے جیش الحرکت کی سرکوبی کرنے کی اجازت مانگی، کیونکہ محل کا حفاظتی دستہ اس لشکر سے کہیں زیادہ مضبوط تھا، لیکن چونکہ سلطان کو اپنی ذات کی خاطر خون کا ایک قطرہ بھی بہانا منظور نہ تھا، اس لیے انہوں نے اس کی اجازت نہ دی۔ (عربی مترجم)

(59) محمود شوکت پاشا: جیش الحرکت کا راہنما جس نے سلطان عبدالحمید ثانی کو معزول کیا۔ اس کا آبائی شہر بغداد تھا، بعد میں جب وہ وزیر دفاع تھا اسے جمعیت اتحاد و ترقی نے قتل کروادیا۔ (عربی مترجم)

(60) اس لشکر یعنی جیش الحرکت کا چھوٹا سا حصہ نظامی فوج پر مشتمل تھا، جبکہ اکثریت کا تعلق بلغاروی، یونانی اور سرب اقلیتوں کے رضاکاروں سے تھا۔

(61) المصنف، عبدالرزاق، ۹۵۴۳؛ المصنف، ابن أبی شیبة، ۶۲۶.

(62) مسندالامام أحمد، ۹۱۶.

(63) البخاری و مسلم، کتاب الایمان.

(64) البدایة والنهایة، ابن کثیر، ۳/ ۴۶.

(65) البخاری، الوضوء ۳؛ مسلم، الطہارۃ،۳۵.

(66) البخاری، المناقب؛ مسلم، فضائل الصحابة.

(67) البخاری، الشہادات؛ مسلم، فضائل الصحابة.

(68) مصنف نے یہ تحریر ان ممالک کے روسی استعمار سے آزاد ہونے سے پہلے لکھی تھی۔(عربی مترجم)

(69) السیرة النبویة، ابن هشام، ۲/ ۱۱۴-۱۱۵.

(70) البخاری، الشروط؛ السیرة النبویة، ابن هشام،۳/۳۲۸؛البدایة و النهایة، ابن کثیر، ۴/۱۷۵.

(71) أبو داؤد، الأدب؛ المسند، الامام أحمد،۵/ ۵۳۸.

(72) مسلم، الجهاد، ۶۸؛ المسند، الامام أحمد،۲/ ۵۳۸.

(73) البخاری، الجنائز؛ مسلم، الوصیة؛ أبو داؤد، الوصایا.

(74) البخاری، المغازی؛ مسلم، فضائل الصحابة؛ المسند، الامام أحمد، ۱/۱۷۳، ۱۸۴،۱۸۵.

(75) أسد الغابة، ابن الاثیر،۴/ ۲۶۴.

(76) أسد الغابة، ابن الاثیر،۶/ ۱۸۱-۱۶۲.

(77) المستدرک، الحاکم، ۴/۴۲۲؛ المسند، الامام أحمد،۴/۳۳۵.

(78) الاصابة، ابن حجر، ۲/۲۷۴؛ الطبقات، ابن سعد،۳/ ۴۸۴.

(79) عثمانیوں کے اس معرکے میں جو "معرکہ کوسوو" کے نام سے معروف ہے، میں سلطان مراد اول نے بلغاریوں، سربوں اور پولینڈیوں پر مشتمل یورپی فوج کو شکست دی۔ جنگ کے بعد سلطان مراد میدانِ جنگ کا جائزہ لے رہے تھے کہ ان سے کہا گیا کہ ایک سرب کمانڈر آپ کے سامنے اپنے اسلام کا اظہار کرنا چاہتا ہے، چنانچہ سلطان اس کے پاس گئے،

لیکن یہ اس کمانڈر کی ایک چال تھی اور اس نے اپنے کپڑوں میں پوشیدہ خنجر سے سلطان پر وار کیا، جس کے نتیجے میں سلطان شہید ہو گئے۔ (عربی مترجم)

(80) البخاری، الادب؛ مسلم، التوبة.

(81) البخاری، التوحید؛ مسلم، التوبة.

(82) کنزالعمال، الهندی، ۸۹۲.

(83) صحیح ابن حبان، ۲۵۸۸؛ المستدرک، الحاکم، ۱۲۰/۳؛ دلائل النبوة، البیهقی، ۴۱۰/۶.

(84) البخاری، کتاب الجهاد والسیر؛ مسلم، فضائل الصحابة.

(85) البدایة و النهایة، ابن الکثیر، ۲۴۱/۷-۲۳۲.

(86) المسند الامام أحمد، ۱۰۲/۱، ۸۹؛ المعجم الأوسط، الطبرانی، ۱۳۰/۷.

(87) البخاری، تفسیرالقرآن.

(88) کنزالعمال، الهندی، ۱۶/ ۵۳۶-۳۸۵.

(89) یہ درج ذیل حدیث کی طرف اشارہ ہے: "مجھے دنیا سے کیا سروکار؟ میں تو دنیا میں اس سوار کی مانند ہوں، جو تھوڑی دیر کسی درخت کے سائے میں ستایا اور پھر اسے چھوڑ کر چل پڑا۔" الترمذی، الزهد، ۴۴؛ ابن ماجة، الزهد، ۳؛ المسند، الامام أحمد، ۳۰۱/۱.

(90) البخاری، التوحید؛ مسلم، الجنة وصفة نعیمها و أهلها.

(91) الترمذی، صفة القیامة؛ ابن ماجة، الفتن.

(92) البخاری، تفسیرالقرآن؛ مسلم، الطلاق؛ المسند، الامام أحمد، ۱۳۹/۳.

(93) البخاری، المغازی، تفسیرالقرآن؛ مسلم، فضائل الصحابة.

(94) البخاری، کتاب الایمان والنذور، الشهادت.

(95) البخاری، بدء الوحی؛ مسلم، الامارة؛ أبوداؤد، الطلاق؛ ابن ماجة، الزهد.

(96) مسلمان زکوۃ ادا کرتا ہے، جبکہ اہل ذمہ عسکری خدمات اور ملکی دفاع سے مستثنیٰ ہونے کی بنا پر جزیہ ادا کرتے ہیں۔ جب ایک دور میں مصر کے کاشتکاروں نے زراعت پر بھرپور توجہ دینے کے لئے عسکری خدمات سے مستثنیٰ کئے جانے کا مطالبہ کیا تو انہیں بھی جزیہ ادا کرنا پڑا۔ (عربی مترجم)

(97) مسلم، فضائل الصحابة؛ الترمذی، فضائل القرآن، المناقب.

(98) أبوداؤد، الجهاد.

(99) البخاری، الأذان، الأحکام؛ ابن ماجة، الجهاد.

(100) البخاری، أخبار الأحاد؛ مسلم، الامارة.

(101) تاہم بعد میں اسلام نے لے پالک بنانے کی ممانعت کر دی۔ (عربی مترجم)

(102) البداية والنهاية، ابن کثیر، ۲۴۵/۴.

(103) مؤلف نے یہ بات ۱۹۸۲ء میں کہی تھی۔

(104) پیلٹ ڈاؤن نامی اس کھوپڑی نے سائنس دانوں کو تقریباً چالیس سال تک دھوکے میں مبتلا رکھا اور اس کے بارے میں امریکہ اور مغربی ممالک کے مختلف علمی رسائل میں تقریباً پانچ لاکھ مضامین شائع ہوئے، لیکن بالآخر ۱۹۵۲ء میں برطانیہ میں اس کا جعلی ہونا ثابت ہو گیا۔ (عربی مترجم)

(105) البخاری، تفسیر القرآن؛ مسلم، الصلاة.

(106) البخاری، الجمعة، تفسیر القرآن؛ مسلم، المساجد و مواضع الصلاة.

(107) البخاری، الجنائز؛ مسلم، الوصية؛ سنن أبی داؤد، الوصایا.

(108) مجمع الزوائد، الهيثمي، ۲۸۳/۳؛ مسند أبي يعلى، ۶۹/۵.

(109) السيرة الحلبية، ۱/۲۰۰.

(110) البخاري، الحج، المناقب؛ مسلم، الحيض.

(111) البداية والنهاية، ابن كثير، ۱۵۶/۳-۱۶۳.

(112) مسلم، الامارة؛ الترمذي، فضائل الجهاد؛ النسائي، الجهاد.

(113) الترمذي، تفسير القرآن.

(114) البخاري، الدعوات؛ مسلم، التوبة.

(115) البخاري، الدعوات؛ مسلم، التوبة.

(116) المسند، الامام أحمد، أول مسند الكوفيين.

(117) فتح استنبول 1453ء میں ہوئی، جسے قرونِ وسطیٰ کا اختتام اور عصر حاضر اور نشاۃ ثانیہ کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ (عربی مترجم)

(118) البخاري، الدعوات؛ مسلم، الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار.

(119) البداية والنهاية، ابن كثير، ۱۱۱/۳.

(120) الترمذي، المناقب عن رسول الله.

(121) مسلم، فضائل الصحابة.

(121) البخاري، المناقب.

(122) بدیع الزمان سعید نورسی (۱۸۷۶ء-۱۹۶۰ء) مراد ہیں جو ترکی کے دورِ حاضر کی اسلامی تحریک کے روحِ رواں اور "طلاب النور" نامی تحریک کے بانی ہیں۔ (عربی مترجم)

(123) البخاري، الجهاد، ۵۲؛ مسلم، الجهاد، ۷۶-۷۷؛ البداية و النهاية، ابن كثير، ۳۷۳/۴.

(124) الترمذی، تفسیرالقرآن، المناقب؛ ابن ماجه، الزهد.

(125) البخاری، التیمّم؛ مسلم، المساجد و مواضع الصلاة؛ النسائی، الغسل والتیمّم.

(126) البخاری،الحدود؛ أبوداؤد، الحدود.

(127) البخاری،الحدود.

(128) ابن ماجه، الزهد.

(129) الترمذی،فضائل الجهاد.

(130) اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو منافقین کے نام بتا دیئے تھے۔جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کسی شخص کے جنازے میں شریک نہ ہوتے تو صحابہ کرام اس سے اندازہ لگا لیتے کہ وہ منافقین میں سے ہے۔(عربی مترجم)

(131) أبوداؤد، السنة

اسلام اور دورِ حاضر

جدید ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات

ہم اپنے نوجوانوں کے سامنے صحیح انداز سے حقائق پیش نہیں کر سکے۔ ہم نے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ ساری دنیا کے نوجوانوں کو نظر انداز کر رکھا ہے، حالانکہ وہ ہمارے پاس موجود پیغام کے ہوا اور پانی سے زیادہ محتاج ہیں۔ جب ہم مختصر سی مدت میں دنیا بھر میں ہدایت کی مشعل لے کر پھرنے والے صحابہ کرام کی حالت اور ان کے بعد آنے والے تابعین کی جدوجہد کے ساتھ اپنی صورتحال کا موازنہ کرتے ہیں تو ہماری سستی، جمود اور کاہلی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ ہدایت اور روشنی کے محتاج دلوں کی تلاش صحابہ کرام اور تابعین کی نہ صرف عادت تھی، بلکہ انہوں نے اس روشنی کو ساری انسانیت تک پہنچانے کو اپنا مقصدِ زیست بنا رکھا تھا۔

ISBN-978-969-9110-24-5
9789699110245